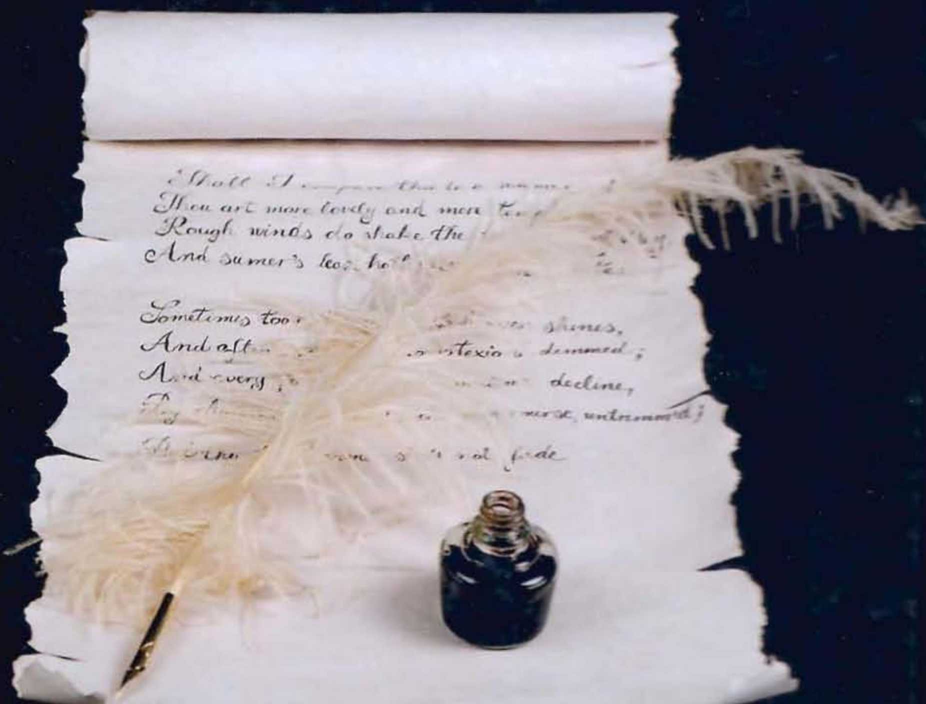
عصرِ حاضر کے نامور دانشوروں کے تاریخی انٹرویوز

گفتگو



عامر بن علی

ابرار ندیم

گفتگو

گفتگو

(انٹرویوز)

عامر بن علی

ابرار ندیم

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 042-7351963

E-mail: *nastalique@yahoo.com*

نٓ وَالقَلمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ○

القرآن

مصنف : عامر بن علی، ابرار ندیم

سرورق : عبید

بار اوّل : ۲۰۱۲ء

کمپوزنگ : زرناب کمپوزنگ سنٹر

مطبع : حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

قیمت : 400 روپے

بیرون ملک : 20 امریکی ڈالر

نستعلیق مطبوعات

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

0300-4489310 / 042-7351963

E-mail: *nastalique@yahoo.com*

انتساب

بابا جی اشفاق احمد

کے

نام

ترتیب

پیش لفظ

انٹر ویو بنیادی طور پر صحافت کی چیز ہے اور صحافی ہی اہم شخصیات سے مکالمے کو اخبارات میں شائع کرتے رہتے ہیں۔ کسی زمانے میں بالعموم سیاستدانوں اور فلم سے متعلق شخصیات کے انٹرویو شائع ہوتے تھے اور بڑی رغبت سے ان کا مطالعہ کیا جاتا تھا پھر اخبارات میں ادب کی ترویج اور ادیبوں کی نشوونما کے لیے جب ادبی صفحات کا آغاز ہوا تو معروف اہل قلم کے انٹرویوز چھپنے کا بھی سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اس میں بھی شخصیات کے کام اور نام کی مناسبت سے انٹرویو لیے جاتے تھے پھر ایک سہانی صبح ہم نے دیکھا کہ مشرومز کی طرح ادبی اخبارات کا اجراء شروع ہوگیا۔ ان اخبارات نے جہاں اور بہت کچھ کیا وہاں ہر کس و ناکس کے انٹرویوز بھی شائع ہونے لگے حتیٰ کہ مجھ جیسے ناہنجار نقاد کے بھی۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا کہنے کا مطلب ہے کہ آج اہل قلم کی جس طرح سے اخبارات میں پروجیکشن ہوتی ہے۔ ماضی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب اچھی اور بری صورتوں والے اہل قلم مرد و خواتین کی رنگین تصویریں شائع ہوتی ہیں۔ ایسی من موہنی تصویریں کہ شاہ رخ خان اور مادھوری ڈکشت ان پر رشک کریں جب کہ اس کے برعکس ماضی میں بہت ہی سینئر اہم اور محترم ادیب کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کہیں کسی ادبی رسالے کے سالنامہ میں شائع ہو جاتی تو اس زمانے کے لحاظ سے یہ ایک اہم ادبی خبر ہوتی۔ خیر یہ باتیں تو جداگانہ ہیں، اصل بات یہ کہ انٹرویو کی اس بنا پر بہت اہمیت ہے کہ اسی بہانے ہم ادیب کی شخصیت اور تخلیقی شخصیت کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ اگر اس نے اپنی ابتدائی زندگی تعلیم کیریئر اور ادبی جدوجہد کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو ایسا انٹرویو اور بھی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

بحیثیت معلم میرا یہ تجربہ ہے کہ ہم جب ایم اے یا ایم فل کی ڈگری کے حصول کے لیے طلباء سے تھیسز لکھواتے ہیں اور اگر وہ تھیسز کسی شخصیت پر ہو تو میں طالب علم کو سب سے پہلے یہ کہتا ہوں کہ اس نے جتنے بھی انٹرویو دیئے ہیں تم انہیں حاصل کرو کیونکہ ان کی بنیاد پہ جو شخصی کوائف حاصل ہوں گے وہ مصدقہ ہوں گے۔ اسی لیے اس نوع کے تحقیقی کام میں شخصیت کے باب میں انٹرویو سے بطور خاص مدد لی جاتی ہے۔

مزید براں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انٹرویو کی اہمیت بڑھتی ہی جاتی ہے۔ جتنا قدیم انٹرویو ہوگا ادبی اور تنقیدی لحاظ سے اسی نسبت سے اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس لیے کہ کسی قدیم انٹرویو کی مدد سے ہم لمحہء موجود کی شخصیت کے بارے میں یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج سے دس بیس تیس برس پہلے اس کی سوچ کیا تھی، اس کے ادبی تصورات کیا تھے اس نے کن معاصرین کے بارے میں کیسی آراء کا اظہار کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس قدیم انٹرویو کی روشنی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آج وہ کیا کچھ ہے۔ یوں سمجھیں کہ پرانا انٹرویو بھی شراب کہن کی مانند ہوتا ہے۔

میں نے جب کبھی مغرب کے اہم اہل قلم کے انٹرویو پڑھے تو ان سے علم و دانش کے موتی حاصل ہوئے۔ ان شخصیات کے انٹرویو پڑھ کر ان کی بلند قامتی کا احساس ہوتا ہے اور بعض اوقات تقابل میں یہ احساس بھی کہ ہم ان کے مقابل نہیں کھڑے ہو سکتے۔

اس کے برعکس ہمارے ہاں کے بیشتر قلم کاروں کے انٹرویوز اگرچہ اخبار کے لیے پانچ کالم کی سنسنی خیز سرخیاں تو مہیا کر دیتے ہیں۔ لیکن ان میں علم و دانش کی بلند سطح کے برعکس بغض و عناد کی پست سطح نظر آتی ہے۔ نام گنوانے کی ضرورت نہیں سبھی ان کے چمکدار ناموں سے آگاہ ہیں۔ ادبی انٹرویو میں اگر ادب و نظریات کے حوالے سے اختلافی امور چھیڑے جائیں اور کسی مروج ادبی تصور پر تنقید کی جائے تو یہ اچھی بات ہے لیکن جب معاملہ سراسر ذاتیات کا ہو کوئی تنقیدی بحث اور ادبی کمٹ منٹ نہ ہو اور صرف دشنام کے خارنما پھول کھلائے ہوں تو ایسا انٹرویو دینے والا کسی کا تو کچھ نہیں بگاڑتا البتہ خود کو ایکسپوز کر دیتا ہے اور شاید کل کا کوئی محقق ان انٹرویوز کی بنیاد پر اس امر کا یقین کرے کہ ہمارے عہد میں

اسلوب دشنام کیسا تھا۔

عامر بن علی اور ابرار ندیم نے ''گفتگو'' کے نام سے ادبی شخصیات سے جو انٹرویوز لیے وہ بھی اگر چہ صحافتی ضروریات کے لیے تھے لیکن انہوں نے ادبی شخصیات سے ایسے سوالات کیے جن کے جوابات کے مطالعے سے واقعی اس شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ انٹرویوز میں اختلافی امور بھی چھیڑے گئے ہیں لیکن علمی انداز لگا رکھا گیا ہے۔ لاٹھی چارج نہیں کیا گیا۔ اب دیکھئے عامر بن علی اور ابرار ندیم نے کیسی کیسی اہم شخصیات سے گفتگو کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، منیر نیازی، شہرت بخاری، ظفر اقبال، شہزاد احمد عطاء الحق قاسمی، اور دیگر حضرات اہل رائے ہیں ان کی اپنی مخصوص سوچ اور تصور حیات ہے اس لیے قاری ان کی گفتگو سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً

احمد ندیم قاسمی

اگر تمام موضوعاتی شاعری اس قدر مذمت کی مستحق ہے تو علامہ اقبال کی موضوعاتی شاعری کو کہاں لے جایئے گا۔ خود منیر نیازی بھی صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں۔ انہیں تو گہرائی میں جانے سے باقاعدہ خوف آتا ہے۔

اشفاق احمد

جس طرح جسمانی عارضے کے لیے کسی حکیم، طبیب یا ڈاکٹر کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اسی طرح روحانی عارضے کے لیے بھی ایک بادل کی تلاش دامن گیر ہوتی ہے۔

منیر نیازی

ہمارا نقاد ہائیکو، ماہیا، غزل اور نظم کو ایک معیار پر پرکھتا ہے اور یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا کہ شاعر نے خیال پر کس قدر زور دیا ہے۔ لیکن ہمارے نقاد کو یہ زحمت کرنا ہوگی اور گہرائی میں جانا ہوگا۔ تعصب کے بغیر بے لاگ فنی تنقید کرنا ہوگی کیونکہ تنقید مداری کا کھیل نہیں ہے۔

شہرت بخاری

شاعری تو بس شاعری ہوتی ہے۔ اس میں جدید اور قدیم کی کوئی قید نہیں۔ ہم اسے

مختلف شعراء کے عہدوں میں تو تقسیم کر سکتے ہیں لیکن جدید اور قدیم کا تصور غلط ہے۔

عطاء الحق قاسمی

جو ادیب قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی تربیت کا اہتمام نہیں کرتا وہ ادیب نہیں مالشیا ہے۔

شہزاد احمد

ہر آدمی کے نزدیک سچ کی اپنی تشریح ہے۔ بعض لوگ صرف اسی کو سچ سمجھتے ہیں جو ان کے اپنے لیے قابل قبول ہو۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جو جمہوریت کے عمل سے حاصل کیا گیا ہو وہاں سچ کے معنی اس قدر محدود نہیں ہو سکتے۔ سچ ایسا ہونا چاہیے جو معاشرے کے لیے زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہو۔

احمد عقیل روبی

آپ باغ لگانے والے کو یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہی قسم کے پودے لگائیں۔ اگر زمین زرخیز ہے تو آپ اس میں ہر قسم کا پودا لگا سکتے ہیں۔

ظفر اقبال

پاکستان کی ایک قومی زبان ایسی ہونی چاہیے، جو اس کی چاروں علاقائی زبانوں کے مجموعے سے بنتی ہو کیونکہ اسی ایک طریقے سے چاروں صوبوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکتا ہے۔

علیم ناصری

عورت کی غلامی کا پراپیگنڈہ مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ ہم اسلامی حوالے سے اس آزادی کے قائل نہیں جو یورپ نے عورتوں کو بخشی ہے۔

ان اقتباسات کا یہ مطلب نہیں کہ گفتگو میں صرف انہی شخصیات کے قابل مطالعہ انٹرویوز ملتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کیونکہ ان سینئرز کے پہلو بہ پہلو ہمیں بعض نو واردان ادب کے خیالات بھی جاننے کا موقع ملتا ہے۔ میں ان کے انٹرویوز کا بطور خاص نام لوں گا۔ اسلم کولسری، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر یونس احقر، خالد علیم اور سلیم طاہر وغیرہ۔

یہ تو میں نے گفتگو کی دیگ میں سے چاول کے چند دانے نکالے لیکن کتاب کے مطالعے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ساری دیگ ہی ایسی ہے یعنی قاری اس دیگ کے چاولوں سے بقدر ظرف لذت یاب ہو سکتا ہے۔

گذشتہ دو دہائیوں میں ادبی شخصیات کے انٹرویوز پر مبنی متعدد کتابیں طبع ہوئیں اور فروخت ہوئیں اور حوالے کی چیز بھی ثابت ہوئیں مجھے یقین ہے کہ عامر اور ابرار کی گفتگو بھی ایسی ہی کتاب ثابت ہوگی۔ یہ تو ان دونوں کی پہلی کاوش ہے۔ ابھی تو متعدد سینئر اور جونیئر ادبی شخصیات ایسی ہیں جن کے انٹرویوز بھی ہونے ہوں گے لہٰذا مجھے یہ بھی توقع ہے کہ شاید اگلے دو برس میں قارئین گفتگو۔۲ کا بھی مطالعہ کریں۔

ڈاکٹر سلیم اختر

۱۹ ستمبر ۲۰۰۱ء

احمد ندیم قاسمی

○میری مخالفت کا آغاز اُس وقت ہوا جب رسالہ ''فنون'' جاری ہوا

○فیض چاہتے تو اپنی فکری شاعری کو دوسری شاعری کی طرح مترنم بنا سکتے تھے۔

○ منیر نیازی بھی صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں اُنہیں تو گہرائی میں جانے سے با قاعدہ خوف آتا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے نامور شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار احمد ندیم قاسمی نے اپنی سالگرہ پر ''ارژنگ'' کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں ترقی پسند تھا اور ہوں مگر ساتھ ہی ایک سیدھا سادا مسلمان بھی ہوں۔ فیض کے حوالے سے اس خصوصی انٹرویو میں انہوں نے مزید کہا کہ ''معاصر'' میں فیض کے حوالے سے میرے مضمون پر معترض حضرات آئندہ ''معاصر'' میں میرا ایک مضمون پڑھ لیں جو میں نے فیض صاحب کی صدارت میں پڑھا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میرے مضمون میں کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں میں نے فیض کو مدہوش، شرابی، غائب دماغ اور لااُبالی ثابت کیا ہے۔ فیض سے بعض شکایات اپنی جگہ وہ میرے لیے بے حد محترم تھے۔

ارژنگ: آپ برصغیر کے صف اوّل کے شاعر، افسانہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ آپ نے ادبی زندگی کا آغاز کس صنف سے کیا؟

احمد ندیم قاسمی: شاعری سے۔

ارژنگ: ابتداء میں کس سے متاثر تھے؟

احمد ندیم قاسمی: شاعری میں اقبال، ظفر علی خان اور اختر شیرانی سے اور افسانے میں منشی پریم چند سے۔

ارژنگ: ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں کن سے متاثر ہیں؟ چند ایک نام ضرور لیں۔

احمد ندیم قاسمی: ہم عصر شعراء اور افسانہ نگاروں میں سے کسی سے متاثر نہیں ہوں۔ البتہ متعدد کو پسند کرتا ہوں مثلاً ن۔م راشد، فیض احمد فیض، احمد فراز، اختر حسین، جعفری، شکیب جلالی، رضی اختر شوق اور ساقی فاروقی وغیرہ کی شاعری پسند ہے۔ افسانہ نگاروں میں کرشن، منٹو، بیدی، عصمت، خدیجہ، ہاجرہ، اشفاق احمد، منشاء یاد، رفعت مرتضٰی اور نیلوفر اقبال وغیرہ اچھے لگتے ہیں۔

ارژنگ: آپ کی مادری زبان پنجابی ہے۔ پنجابی میں آپ نے کچھ لکھا۔ اگر نہیں تو کیوں؟

احمد ندیم قاسمی: میں نے پنجابی میں شاعری کی ہے اور ساتھ ہی پنجابی شعر و نثر کی متعدد کتابوں کے پنجابی ہی میں دیباچے لکھے ہیں۔ مثلاً احمد راہی کے ''ترنجن'' اور سلیم کاشر کے متعدد مجموعے۔

ارژنگ: علاقائی زبانوں خاص طور پر پنجابی کا مستقبل کیا ہے؟

احمد ندیم قاسمی: نہایت روشن مستقبل ہے۔ جس زبان کو وارث شاہ، بلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ فرید اور میاں محمد بخش کے سے اساتذہ فن میسر ہوں اسے کیسے زوال آ سکتا۔ ہے اور پھر دور جدید میں نہایت معیاری پنجابی شاعری بھی ہو رہی ہے۔ پنجابی افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں اور پنجابی ادب کی تنقید بھی چھپ رہی ہے۔

ارژنگ: بقول منیر نیازی ''ترقی پسندوں کی ساری شاعری موضوعاتی ہے'' اور موضوعاتی شاعری گہری شاعری کی ذیل میں نہیں آتی۔ آپ ان کی بات سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟

احمد ندیم قاسمی: صدفی صد اختلاف کرتا ہوں۔ منیر نیازی اس طرح کے ٹوٹکے چھوڑنے کے عادی ہیں۔ اگرچہ تمام تر ترقی پسند شاعری محض موضوعاتی نہیں ہے لیکن اگر تمام موضوعاتی شاعری اس قدر مذمت کی مستحق ہے تو علامہ اقبال کی موضوعاتی شاعری کو کہاں

لے جائیے گا۔ خود منیر نیازی بھی صرف سطح کی شاعری کرتے ہیں۔ انہیں تو گہرائی میں جانے سے باقاعدہ خوف آتا ہے۔

ارژنگ: ترقی پسند یا فحاشی! منٹو کے افسانے کس ذیل میں آتے ہیں؟

احمد ندیم قاسمی: بیشتر ترقی پسندی کی ذیل میں آتے ہیں۔ اکا دُکا افسانوں پر فحاشی کا شبہ ہوتا ہے ورنہ وہ ردشدہ انسانوں کے حالات کی عبرتناکی واضح کر کے دراصل بہتر معاشرے کی آرزو کرتے ہیں۔

ارژنگ: ''معاصر'' میں فیض کے حوالے سے اپنے مضمون میں آپ نے لکھا ہے کہ فیض بورژوا قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور انہی میں خوش رہتے تھے۔ تو آپ کی اس بات کے حوالے سے کیا کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی ساری شاعری ترقی پسند منشور کے حوالے سے ان کا اصل چہرہ نہیں ہے؟

احمد ندیم قاسمی: حسن اور عشق کے موضوعات ابدی موضوعات ہیں اور اگر فیض نے حسن و عشق کی شاعری کی ہے تو یہ بھی ترقی پسندی ہے۔ کیونکہ حسن کی بقاء اور باہمی عشق کی فضا پیدا کرنے سے بڑی ترقی پسندی اور کیا ہوگی؟ دراصل عام ذہن میں ترقی پسندی کو نہایت محدود سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ غالب بھی اپنے دور کا ترقی پسند تھا اور اقبال بھی ترقی پسند تھا۔ چنانچہ فیض کی شاعری بھی ترقی پسندی ہی کی عکاس ہے۔ ترقی پسندی کے منشور میں انسانی وقار کی بحالی اور عوام الناس کے احتجاج کو ختم کرنے کا ذکر ہے اور یہ وہ مقاصد ہیں جو ہر ایماندار اور باضمیر شاعر اور تخلیق کار کے پیش نظر ہونے چاہئیں۔ اگر فیض بورژ والوگوں میں خوش رہتے تھے یہ ان کی مجلسی مجبوری تھی۔ ورنہ انہوں نے بورژوایت کے حق میں ایک مصرع تک نہیں لکھا۔

ارژنگ: ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ ''دست صبا'' جیل سے مرتب ہو کر ناشر تک پہنچا اور فیض صاحب نے آپ کو لکھا کہ آپ اس مسودے پر ایک نظر ڈال لیں جس کے جواب میں آپ نے ''دست صبا'' کے بعض مقامات کے سلسلے میں شبے کا اظہار کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ فیض کے کلام میں کچھ خامیاں تھیں۔ آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ خامیاں کس نوعیت کی تھیں؟

احمد ندیم قاسمی: ایک عمر اور ایک مرتبے کے شعراء اپنے کلام کے سلسلے میں باہمی گفتگو کرتے ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی خامیاں تلاش کی جارہی ہیں۔ میں نے بعض اشعار میں بعض الفاظ کے متبادل الفاظ تجویز کیے جس سے میری رائے میں مفہوم زیادہ چمک اُٹھتا۔فیض صاحب نے میرے بعض دوستانہ مشورے قبول کیے مگر بعض کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ان کے کلام میں خامیوں کی نشاندہی کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

ارژنگ: آپ کا شمار ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔اس کا تسلسل آج کے ادب میں کیا اہمیت رکھتا ہے؟

احمد ندیم قاسمی: میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ بانی تو سیّد سجاد ظہیر، احمد علی اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ تھے۔ میں تو ترقی پسند ادب کی تحریک میں 1948ء میں شامل ہوا اور تحریک کا آغاز 1936ء میں ہو چکا تھا۔ رہی یہ بات کہ آج کے ادب میں اس تحریک کی کیا اہمیت ہے تو معدودے چند علامت نگاروں اور تجزیہ نگاروں کو چھوڑ کر ان اِکا دُکا اہل قلم سے قطع نظر جو بڑے سے بڑے تخلیق کار کو تسلیم نہیں کرتے، باقی نوے پچانوے فیصد اہل قلم، غیر شعوری طور پر ہی سہی اس تحریک سے متاثر ہیں اور ان کی تحریریں اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ارژنگ: فیض احمد فیض اور دیگر سینئرز کی موجودگی میں انجمن ترقی پسند کے جنرل سیکرٹری کے طور پر آپ نے اپنی تقرری کو کیسے لیا؟

احمد ندیم قاسمی: مجھے دور دراز کا بھی اندازہ نہ تھا کہ مجھ پر یہ بم گرے گا۔ میں ترقی پسند تو یقیناً تھا اور ہوں مگر ساتھ ہی ایک سیدھا سادا مسلمان بھی ہوں۔ میرے بارے میں مشہور تھا کہ ملک میں اس شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے اور یہ بہت حد تک درست بھی تھا۔ میری مخالفت کا آغاز تو اس وقت ہوا جب میں نے اپنا رسالہ ''فنون'' جاری کیا۔ اس کی مقبولیت نے میرے بعض مخالف پیدا کر دیے ورنہ میں خاصا ہر دلعزیز قلمکار تھا۔ شاید اسی وجہ سے ''بڑے'' ترقی پسندوں نے طے کر لیا تھا کہ مجھے جنرل سیکرٹری بنایا جائے تا کہ ترقی پسندوں کے بارے میں اپنا جو کمیونزم کا پرچار کرنے والوں کی عام افواہ تھی اسے ختم کیا جا سکے۔ جب

میرا نام اتنے بڑے عہدے کے لیے تجویز کیا گیا تو میں نے احتجاج کیا کہ فیض احمد فیض صاحب اور سیّد مطلبی فرید آبادی صاحب کی موجودگی میں مجھے اس عہدے کے لیے نامزد کرنا زیادتی ہے۔مگر ''یارلوگ'' شاید فیصلہ کر کے آئے تھے۔اس لیے میری ایک نہ سنی گئی۔یہ سب سے بڑی ذمہ داری تھی جو میں نے پانچ برس تک حتی الامکان پوری تندہی سے نبھائی۔

ارژنگ: آپ کے مضمون کے ردعمل میں کچھ ادیبوں کا یہ کہنا ہے کہ فیض میں اگر کچھ خامیاں تھیں یا ان سے آپ کے اختلافات تھے تو ان کا اظہار ان کی زندگی میں ہونا چاہیے تھا۔اس حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

احمد ندیم قاسمی: معترض حضرات آئندہ ''معاصر'' میں میرا ایک مضمون پڑھ لیں جو میں نے فیض صاحب کی موجودگی میں بلکہ ان کی صدارت میں پڑھا تھا۔انہیں تسلی بخش جواب ملے گا۔

ارژنگ: آپ کے مضمون میں فیض صاحب کے بارے میں جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ ہر وقت نشے میں مدہوش، شرابی، غائب حاضر دماغ اور ایک لااُبالی شخص کا ہے۔جبکہ اپنی شاعری میں فیض ایک مختلف شخص نظر آتے ہیں۔اس تضاد کی وجہ؟

احمد ندیم قاسمی: میرے مضمون میں کوئی ایک مقام بھی ایسا نہیں جہاں میں نے فیض صاحب کو مدہوش، شرابی، غائب حاضر دماغ اور ایک لااُبالی شخص ثابت کیا ہے۔اس کے برعکس میں نے تو واضح کیا کہ انہیں شراب کا نشہ ہوتا ہی نہیں تھا۔زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ وہ شاعری، مصوری اور موسیقی وغیرہ کے موضوعات پر نہایت دل آویز گفتگو کرتے تھے۔معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرا مضمون غور سے نہیں پڑھا۔صرف بعض اخباروں کی فساد انگیز سرخیاں پڑھی ہیں۔

ارژنگ: اپنے حوالے سے آپ نے فیض احمد فیض کے جس تعصب کا ذکر کیا ہے کیا آپ اس کی کچھ مثالیں بیان کریں گے۔اب جبکہ اس بات کو ایک طویل عرصہ گزر گیا ہے۔آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کو اس تعصب نے کس حد تک متاثر کیا؟

احمد ندیم قاسمی: مجھے اس ضمن میں جو کچھ کہنا تھا میں اپنے مضمون میں کہہ چکا ہوں۔اس سے

زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

ارژنگ: دورانِ قید حکومت نے آپ کو قومی ترانہ لکھنے کی دعوت دی جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حکومت کو آپ کے مرتبے اور اہمیت کا خیال تھا۔ دوسری طرف آپ کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی کہ تمام تر اختلافات کے باوجود حکومت کی طرف سے آپ کو ملک کا ترانہ لکھنے کی دعوت دی جارہی تھی۔ آپ نے اس دعوت کو کیوں ٹھکرایا، کیا بعد میں اس حوالے سے کوئی پچھتاوا ہوا؟

احمد ندیم قاسمی: میں کیمبل پور ڈسٹرکٹ جیل میں ایک سی کلاس میں نظر بند تھا۔ تب مجھے جیل کے حکام نے چھاگلہ کی اس ٹیون کا ریکارڈ بھیجا جو میرے نام قومی ترانہ لکھنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر وہاں خنجر گاڑ دیا گیا ہے۔ مجھے اس دعوت نامے کا شدید دُکھ ہوا اور میرے اندازے کے مطابق مجھے دُکھ پہنچانے کے لیے چھاگلہ کی ٹیون مجھے جیل کے اندر بھیجی گئی تھی۔ اس صورت میں ترانہ کیوں لکھتا اور اگر لکھتا تو اس میں حکمرانوں کے مظالم کے سوا کیا ہوتا؟

ارژنگ: فیض صاحب کی وفات کے حوالے سے بطور خاص آپ نے لکھا ہے کہ ''20 نومبر کو ان کا انتقال ہو گیا۔ 20 نومبر کو جو میری پیدائش کی تاریخ ہے، ان کی تاریخ وفات قرار پائی'' ان جملوں سے آپ کی کیا مراد ہے؟

احمد ندیم قاسمی: صرف دُکھ مراد ہے۔ فیض صاحب سے بعض شکایات اپنی جگہ مگر وہ میرے لیے محترم تھے۔ 20 نومبر کو ان کی وفات سے مجھے گہرا دُکھ ہوا۔ دس پندرہ روز قبل میں نے اپنے احباب کو اپنی سالگرہ کی دعوت میں بلا رکھا تھا مگر 20 نومبر کو یہ سانحہ ہو گیا۔ میں فیض صاحب کے جنازے کے بعد ان کی تدفین تک اور ان کے مزار پر دعا کرنے کے بعد ہی ہوٹل میں اپنے مہمانوں کے پاس پہنچا۔ ان سے معذرت کی اور چائے کی ایک ایک پیالی پیش کر کے اُنہیں رُخصت کر دیا۔

ارژنگ: فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے آپ نے لکھا کہ ''ان کے ہاں فکری گہرائی نہیں ہے'' یہ فکری گہرائی کیا ہے اور فیض کے ہاں اس کی عدم موجودگی کا کیا سبب ہے

جبکہ فیض صاحب ایک پڑھے لکھے شخص تھے اور ان کی شاعری اور دانشوری کا بھی ایک عالم معترف ہے۔

احمد ندیم قاسمی: ''یہ فکری گہرائی کیا ہے؟'' کے الفاظ سن کر میں حیران ہو گیا کہ کیا آپ جو مجھ سے سوال پوچھ رہے ہیں اتنا بھی نہیں جانتے کہ فکری گہرائی کیا ہوتی ہے۔ غالب اور اقبال کا مطالعہ کیجیے، آپ کو فکری گہرائی کا مفہوم مل جائے گا۔ میں نے بھی اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ فیض بہت پڑھے لکھے تھے اور اگر وہ چاہتے تو فکری شاعری کو اپنی دوسری شاعری کی طرح شیریں اور مترنم بنا سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور مجھے حیرت ہے کیوں نہیں کیا۔

ارژنگ: دُنیا کے عظیم انقلابات کے حوالے سے فیض صاحب کا انقلاب ایران کو عظیم قرار دینا اور پھر اس پر جیلانی کامران کا فیض کو اسلامی تاریخ کے عظیم دانشوروں میں شامل کرنا آپ کے نزدیک حیران کن کیوں ہے؟ کیا آپ کے خیال میں بطور مسلمان فیض کی حیثیت مشکوک ہے؟

احمد ندیم قاسمی: مجھے اگر فیض کے جواب پر حیرت ہوتی ہے تو اس طرح ان کے مسلمان ہونے پر میرے شک کرنے کی گنجائش کیسے پیدا ہو گئی؟ اگر میں کہوں کہ ایران کا انقلاب، روس اور چین کے انقلابوں سے فروتر تھا تو کیا میں کافر ہو جاؤں گا اور ایران کے انقلاب کو عظیم ترین انقلاب قرار دینے سے کوئی دانشور کیسے ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کے سامنے انقلاب ایران سے پہلے مصر اور لیبیا کے انقلاب بھی موجود ہیں اور یہ دونوں بھی مسلمان ملک ہیں اور وہاں بھی بادشاہت ختم کی گئی تھی۔

احمد عقیل روبی

○ جو لوگ گیت کو سمجھتے ہیں اُن کے لیے لکھنا مشکل اور جو نہیں سمجھتے ان کے لیے آسان ہے۔
○ آپ باغ لگانے والے کو یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہی قسم کے پودے لگائے جائیں۔
○ میں اُن تمام راستوں پر چلنا چاہتا ہوں جو میرے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔

شاعر فلمی کہانی کار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، نقاد اور سوانح نگار احمد عقیل روبی کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ اگر ہم یہ سوال پوچھیں کہ احمد عقیل روبی کو پہچان کس خاص حوالے سے ملی تو اس کا جواب ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ احمد عقیل روبی نے ادب کی جس صنف میں بھی لکھا پوری دیانتداری اور محنت سے اور اس معیار کا لکھا کہ فلمی گیت نگاری سے لے کر ناول نگاری اور تنقید تک ان کا ہر کام ان کی پہچان بن گیا۔

احمد عقیل روبی کے اب تک شاعری کے پانچ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ناولوں میں چوتھی دنیا، جنگل کتھا، بنجر دریا اور کچھ اور نام ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار فلموں کی کہانیاں، گیت اور ٹی وی کے لئے ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو جو خاص اعزاز بخشا ہے وہ ان کا قرآن پاک کے تیسویں پارے کا ترجمہ کرنے کا شرف ہے۔ احمد عقیل روبی اپنے کام کے معیار اور مقدار دونوں کے حوالے سے آج ادب میں ایک معتبر نام

سمجھے جاتے ہیں۔

چٹان: شاعری کی ابتداء کب اور کیسے کی؟

احمد عقیل روبی: شاعری کا آغاز ۱۹۵۲ء میں ایک نظم لکھنے اور گرفتار ہونے سے ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں اعظم خان کا مارشل لاء لگا تو میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ سکول میں دعا ترنم سے پڑھتا تھا۔ خانیوال جامع مسجد کے امام نے میری آواز سن کر ختم نبوت کے جلوس میں کچھ پڑھنے کے لئے مجھے بلوایا میں نے ساری رات جاگ کر ایک نظم لکھی:

آ ہوش میں ذرا تو گولی چلانے والے
پیچھے نہیں ہٹیں گے جانیں لڑانے والے

جلسے میں نظم پڑھی تو ایک ہلچل سی مچ گئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ مجھے بھی پکڑ لیا گیا ایک رات جیل میں رکھا۔ دوسرے دن سب کو ٹرک میں ڈال کر شہر سے ۲۰ میل دور جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ پیدل چل کر روتے روتے شہر میں آیا۔ میری والدہ سخت پریشان تھیں۔ پریشانی میں میری پٹائی کی اور وعدہ لیا کہ آئندہ کسی جلوس میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے جلوس میں نہ جانے کا تو وعدہ کر لیا لیکن شاعری ترک نہ کرنے کی قسم نہ کھائی اور پھر شاعری کی طرف قدم مسلسل بڑھتے گئے۔

چٹان: شاعری میں آپ کن سے متاثر ہوئے؟

احمد عقیل روبی: میں شاید ابھی تک کوئی اچھا مصرعہ یا سطر نہیں کہہ سکا لیکن مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے اچھی سطریں اور اچھے شعر ضرور پڑھے ہیں۔ میں نے ہر زبان کے بڑے شاعر اور ادیب سے فیض حاصل کیا ہے۔ ہومر، ورجل، دانتے، ملٹن، شیکسپئر، فردوسی، میر، غالب، حسرت موہانی، فراق، ناصر کاظمی اور مجید امجد سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔

چٹان: آپ کو ڈائریکٹر کی ڈیمانڈ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جبکہ شاعری آمد کی کیفیت میں ہوتی ہے۔ کیا ایسی شاعری جو توارد کے زمرے میں آئے اسے شاعری کہنا درست ہے؟

احمد عقیل روبی: جی ہاں میں نے فلم کے گانے لکھے ہیں۔ سید نور کی فلم چوڑیاں کے گیت بھی میں نے ہی لکھے لیکن چونکہ میری سید نور کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی تھی اس لئے میں نے اس فلم

کے گیت لکھے اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ لیکن مجموعی طور پر فلموں میں ناکام ہوا ہوں۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے مجھے تخلیقی ذہن دیا ہے اور وہ گروہ جو آج کل فلمیں بناتا ہے تخلیقی باتیں سمجھنے سے قاصر ہے۔ مجھے فلمی گیت لکھنے کا شوق اس زمانے میں ہوا تھا۔
جب آرزو لکھنوی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی اور گلزار جیسے نامور تخلیق کار فلموں کے گیت لکھتے تھے۔ یہ لوگ تخلیقی شاعری کرنے میں ایک اچھا مقام رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے فلمی مصرعے بھی ادبی طاقت واہمیت رکھتے ہیں۔
چٹان: کیا فلمی گیت لکھنا مشکل ہے؟
احمد عقیل روبی: جو لوگ گیت کو سمجھتے ہیں ان کے لئے لکھنا مشکل ہے اور جو نہیں سمجھتے ان کے لئے آسان ہے۔
چٹان: آپ کے ہاں اردو میں دیگر زبانوں خاص طور پر ہندی کے کافی الفاظ ملتے ہیں اس کی کوئی خاص وجہ؟
احمد عقیل روبی: آپ باغ لگانے والے کو یہ کیوں کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہی قسم کے پودے لگائیں۔ اگر زمین ذرخیز ہے تو آپ اس میں ہر قسم کا پودا لگا سکتے ہیں۔ زبان کا دامن اسی طرح ہی وسیع ہوتا ہے۔ جارج اسٹائل اپنی تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب میں جب بحث کرتا ہے تو کہتا ہے لفظ کچھ اجنبی، کچھ غیر ملکی، کچھ غیر زبان کے ہوتے ہیں۔ آپ وہ لفظ استعمال کرنے میں پرہیز نہ کریں۔ لیکن ان کو اس طرح استعمال کریں کہ وہ آپ کی زبان میں آکر اجنبی محسوس نہ ہوں۔ چنانچہ میں نے جو لفظ استعمال کئے ہیں لوگوں نے یہ تو کہا کہ آپ نے ہندی کے لفظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ بہت برے طریقے سے استعمال کئے ہیں۔
چٹان: آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ آپ شاعر، ڈرامہ نگار، فلمی کہانی کار، نقاد اور سوانح نگار ہیں۔ آپ کو اپنا کون سا پہلو اچھا لگتا ہے۔
احمد عقیل روبی: بدل بدل کر لباس پہننا انسانی فطرت ہے۔ گلیشئر کی طرح آدمی کی مختلف سطحیں ہیں۔ شاید میں ان تمام راستوں پر چلنا چاہتا ہوں جو میرے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔

اس امید پر کہ شاید کسی دن منزل تک پہنچ جاؤں۔

چٹان: کامیاب اور مشہور ادیب یا شاعر بننے کا گر کیا ہے؟

احمد عقیل روبی: اچھا کھلاڑی وہ ہے جو کھیل کے تمام اصول و قواعد جان کر میدان میں اترے۔ چنانچہ شاعر کو شاعری شروع کرنے سے پہلے شاعری کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہیئے۔ وہ شاعری جو بغیر کسی علمی پس منظر اور ریاضت کے کی جائے اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے۔ برا شعر کہنے والا شاعر جونک کی طرح ہوتا ہے جو قاری کا خون چوستی رہتی ہے۔

چٹان: کیا یہ کہہ کر آپ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی نہیں کر رہے؟

احمد عقیل روبی: نہیں بلکہ میں نئے لوگوں کو شاعری کرنے کا گر سکھا رہا ہوں۔ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ نہ کاغذ ضائع کریں اور نہ وقت۔ جب ورکشاپ کے چھوٹے دس بارہ سال کی ٹریننگ کے بعد مستری بنتے ہیں۔ تو شاعری کے لئے ریاضت ممنوع کیوں ہے۔ یہ مفت میں ہی فیض کی برابری کرنا چاہتے ہیں۔

چٹان: ہمارے ہاں ناقدین عدل سے کام لیتے ہیں یا تعصب سے؟

احمد عقیل روبی: ہمارے نقاد ان چیزوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ کہیں اتنا عدل برتتے ہیں کہ دس غزلوں کے شاعر کو فیض کے برابر لا کھڑا کرتے ہیں اور کہیں اس قدر تعصب سے کام لیتے ہیں کہ شاعر اگر اپنے گروپ کا نہ ہو تو اس میں انہیں کوئی خوبی سرے سے نظر ہی نہیں آتی۔ ہمارے ہاں تنقید اور تخلیق کی بربادی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

اشفاق احمد

○ کالم نگاری نے بہت اچھے ادیبوں کا اتنا وقت لے لیا کہ وہ ادیب نہ بن سکے۔
○ عوام کسی ایسے کندھے کی تلاش میں پھر رہے ہیں جس پر سر رکھ کے وہ رو سکیں۔
○ روحانی عارضے کے لیے ایک بادل کی تلاش دامن گیر رہتی ہے۔

ارژنگ: لکھنا کیسے شروع کیا؟

اشفاق احمد: کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ لکھنا کب شروع کیا۔ میں پڑھنے لکھنے سے بڑی جان چھڑاتا تھا کیونکہ میں اچھا سٹوڈنٹ نہیں تھا۔ مشکل سے پاس ہوتا بلکہ میٹرک میں فیل بھی ہو گیا تھا۔ جب میں ایف اے میں کالج میں داخل ہوا تو پھر میں نے اردگرد پروفیسرز اور اساتذہ کو نئے روپ میں دیکھا۔ وہ کچھ ایسے شفیق لوگ تھے اور اپنا آپ نچھاور کرنے میں تھوڑے سے ''شیخی باز'' بھی تھے۔ ان کی اس تعلّی کا ہمیں بڑا فائدہ ہوا کہ وہ اپنا علم ہم پر نچھاور کرنا چاہتے تھے۔ فلسفے کے ایک پروفیسر لالہ دیس راج بڑی عمر کے پروفیسر تھے ان کی معرفت میں بلھے شاہ سے متعارف ہوا۔ جو کچھ پروفیسر صاحب نے ہمہ اوست کے فلسفہ کے بارے میں بتایا وہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ البتہ بلھے شاہ کی شاعری کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو گیا۔ پھر بلھے شاہ کی شاعری سے پھسلتا پھلستا اس عہد کی اردو شاعری جو زیادہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھی کی طرف جا نکلا اور پھر مجھ سے پوچھے بغیر اور مجھ کو بتائے بغیر میرے اردگرد لکھنے لکھانے کا عمل شروع ہو گیا۔

ارژنگ: ابتداء میں کن سے متاثر تھے؟

اشفاق احمد: ابتداء میں تو انگریزی کے وہ مصنف جن کی نظمیں اور نثر ہمارے کورس میں شامل تھیں ان سے متاثر ہوا پھر اردو نظم و نثر میں ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں نے بڑا ''ہانٹ'' کیا لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب میں خود لکھنے لگا تو میں ترقی پسندی کے ''ہانٹڈ'' ہاؤس سے نکل کر قریب ہی چھوٹی چھوٹی جھگیاں بنانے لگا۔ جو دیکھنے میں تو شاید اتنی خوبصورت نہیں تھی لیکن ان کے اندر کی رہائش بڑی پر فضا اور پر سکون تھی۔

ارژ نگ: بقول منیر نیازی ترقی پسندوں کی تمام شاعری موضوعاتی ہے اور موضوعاتی شاعری گہری شاعری کی ذیل میں نہیں آتی۔ آپ اس خیال سے کس حد تک اتفاق کریں گے؟

اشفاق احمد: میں بھی بالکل سو فیصد یہ سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو ایک پرچہ ترکیب استعمال دیا گیا تھا۔ جس کے مطابق وہ اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے اور بعض اوقات بڑی خاصے کی چیزیں پیش کر جاتے۔ جنگ ختم ہو رہی تھی، انگریز جا رہا تھا، آزادی قریب تھی۔ ایسے میں ترقی پسندی کا لٹریچر طرارے بھر رہا تھا اور موجیں مار رہا تھا۔

ارژ نگ: احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض ایسے بڑے شعراء اور ترقی پسندوں کی موجودگی میں منیر نیازی کی شاعرانہ حیثیت کیا بنتی ہے؟

اشفاق احمد: اصل میں ان کا مقابلہ ایک عجیب سی بات ہے اور کسی کو کسی سے بڑا شاعر قرار دینا بھی کافی مشکل ہو جاتا ہے لیکن شاعری کے اعتبار سے تینوں ہی بڑے توجہ طلب شاعر ہیں اور سننے والے کی نگاہیں اٹھ اٹھ کر ان کی طرف جاتی ہیں۔ منیر بلا شبہ ان میں مختلف شاعر ہے۔ فیض میں جو رومانیت ہے وہ دوسرے دونوں شاعروں میں کم درجے پر ہے۔ لیکن ندیم میں موضوعات کا جو تنوع ہے وہ فیض اور منیر کے ہاں کم ملتا ہے۔ منیر کی شاعری کا بڑا وصف اس تحیر میں پنہاں ہے جو اسے اپنی ذات پر ہے کہ ہیں میں تو اپنے آپ کو بڑا اچھا سمجھتا تھا۔

ارژ نگ؛ آپ کا کہنا ہے کہ کالم نگاری نے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس نقصان کی کچھ وضاحت کریں؟

اشفاق احمد؛ کالم نگاری نے بہت اچھے ادیبوں کا اتنا وقت لے لیا کہ وہ ادیب نہ بن سکے۔

ارژ نگ: کیا ابن انشاء اور عطاءالحق قاسمی کے کالم بھی اسی ذیل میں آتے ہیں؟

اشفاق احمد: یہ دونوں اوران جیسے کچھ اور تخلیقی ادیبوں کو مستثنیات میں رکھا جا سکتا ہے؟
ارژنگ: کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ قدرت اللہ شہاب کو بابا بنانے میں ممتاز مفتی اور آپ کا بڑا ہاتھ ہے؟
اشفاق احمد: لوگوں کا میں دل نہیں توڑنا چاہتا تھا کہ شاید ایسے ہی ہے۔ اصل میں قدرت اللہ شہاب ایک معمولی دو ٹکے کا آدمی تھا۔ نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ شہرت، نہ ہی کوئی معاشرتی مقام چنانچہ میں نے اور ممتاز مفتی نے سوچا کہ اس کو ایک بزرگ کی حیثیت سے مشہور کر دیتے ہیں۔ ہمارا دوست معروف ہو جائے گا چنانچہ ایسے ہی ہوا لوگوں نے اس کی عزت شروع کر دی۔ پھر دس پندرہ لکھنے والوں نے مل ملا کر شہاب نامہ لکھنا شروع کیا۔ ایک ایک باب اپنے ذمے لیا اور اسے مکمل کر کے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب کے نام سے شائع کرایا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے چشم زدن میں قدرت اللہ بابا بھی بن گیا اور ادیب بھی۔
ارژنگ: شہاب نامے میں شامل چند مافوق فطرت واقعات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟
اشفاق احمد: شہاب نامے میں جن مافوق الفطرت واقعات کا ذکر ہے وہ میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے لیکن میں ان کا بطلان نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہے تو میں اسے تسلیم کر لیتا ہوں کہ ایسا ہوا ہوگا۔ اس دلیل سے اسے نہیں کاٹتا کہ چونکہ میرے ساتھ ایسا واقعہ نہیں گزرا اس لیے غلط ہے۔
ارژنگ؛ ایک بابا جی آپ کے بھی تو ہیں؟
اشفاق احمد: جی ہاں: وہ میرے مرشد ہیں ان کا نام حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نور والے ہیں۔ ان کا ڈیرہ میاں میر صاحب کے دروازے کے عین سامنے انفنٹری روڈ پر ہے۔ اب وہ اس جہان سے پردہ کر چکے ہیں۔
ارژنگ: کیا ان بابا جی سے شہاب صاحب کا بھی ملنا تھا؟
اشفاق احمد: بالکل میری وجہ سے شہاب صاحب ان سے بہت دفعہ ملے اور وہ بابا جی کا بڑا احترام کرتے تھے۔
ارژنگ: تو کیا قدرت اللہ شہاب اور آپ دونوں ایک ہی سلسلے سے منسلک ہیں؟

اشفاق احمد: شہاب نامے میں چھوٹا منہ بڑی بات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہاب صاحب کا سلوک کے راستے سے گہرا تعلق تھا۔لیکن میں علم تصوف کا جرنلسٹ ہوں۔ میں اس علم کے بارے میں متعلقہ ریفرنس اکٹھے کر کے فراہم کرسکتا ہوں لیکن خود صوفی نہیں ہوں نہ ہی میں اس راستے کا مسافر ہوں جس طرح ایک مالدار اور آسودہ حال آدمی کمیونزم کا قائل ہوتا ہے۔ کچھ ایسی کیفیت میری ہے۔ میں دل و جان سے تصوف کا قائل ہوں لیکن بدقسمتی سے اس راہ کو اختیار نہیں کرسکا۔

ارژنگ: آپ کی اس خواہش کی راہ میں کیا رکاوٹ حائل ہے؟

اشفاق احمد: میں سمجھتا ہوں کہ میری راہ میں خوف اور خواہش حائل ہیں اور یہی دو انسانی راستے کے سب سے بڑے دو خوفناک بھیڑیئے ہیں۔

ارژنگ: ان سے چھٹکارے کی کوئی راہ؟

اشفاق احمد: جس طرح جسمانی عارضے کے لیے کسی حکیم طبیب یا ڈاکٹر کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اسی طرح روحانی عارضے کے لیے ایک بادل کی تلاش دامن گیر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر حکیم کی تلاش پر تو لوگ معترض نہیں ہوتے لیکن کسی بابے کی حضوری میں جانے کی راہ میں سب سے بڑا پتھر لوگ ہی ہوتے ہیں۔ جن کا مریض کے ساتھ کوئی ذہنی، جسمانی، عقلی یا روحانی تعلق بھی نہیں ہوتا۔

ارژنگ: کیا ہمارے مسائل کا حل صرف روٹی ہے؟

اشفاق احمد: ہمارے ہاں کسی کو روٹی کپڑا اور مکان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے چودہ کروڑ عوام کسی ایسے کندھے کی تلاش میں پھر رہے ہیں جس پر وہ سر رکھ کر رو سکیں مگر بدقسمتی سے وہ کندھا نہیں ملتا۔

ارژنگ: کیا ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں؟

اشفاق احمد: یہ پیشین گوئی تو نہیں کی جاسکتی یہ سوال صحافیوں سے کیا جانا چاہیے وہ اس کی بہتر نشاندہی کرسکتے ہیں۔

ارژنگ: بڑے اخبارات کے ادبی ایڈیشن ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

اشفاق احمد: وہ بھی ادب کے فروغ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جتنا کہ بڑے ادبی مجلّے یا پرچے۔

ڈاکٹر انور سجاد

○ ہمارے ہاں مقابلے کا احساس نہیں ہے۔
○ ہر زمانے میں سماج جس فن کا مستحق ہوتا ہے اس کو وہی ملتا ہے۔
○ ہمارے ہاں اب فلمسازی میں مستری زیادہ ہیں۔

ارژنگ: آپ نے اپنے ادبی کیرئیر کا آغاز کب اور کیسے کیا؟
ڈاکٹر انور سجاد: اب یہ اچھی طرح یاد نہیں مگر ظاہر ہے ادبی کیرئیر کا آغاز پہلے ہی ہوا اور پڑھائی کی عادت تو اُستادوں نے بچپن سے ہی ڈال دی تھی۔ پھر کتابوں کا سفر جاری رہا اور یہ کتابیں نئی دُنیائیں تخلیق کرتی تھیں۔ تو اس تخلیق کا ہم بھی حصہ بنے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ بندہ خود چاہتا ہے کہ اپنی ذات کا اظہار کرے۔ اب مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ غالباً میری پہلی کتاب 52ء میں نقوش میں چھپی تھی۔ جس کا نام ''ہوا کے دوش پر تھا''۔ یہ میرے باقاعدہ کیرئر کا آغاز تھا۔ اسی دوران ہماری منٹو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہاں بہت بڑے لوگ آتے تھے۔ ان سے ہماری دوستی ہوگئی۔ بس وہیں سے انسپائریشن کا سامان شروع ہوا۔
ارژنگ: منٹو صاحب کے ساتھ اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود آپ کے ہاں ان کی چھاپ نظر نہیں آتی؟
ڈاکٹر انور سجاد: نہیں میں منٹو صاحب کے ساتھ کوئی زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ بس یہی کوئی ان کے آخری پانچ چھ سال میں مجھے ان کا ساتھ میسر رہا۔

ارژ نگ: یہ عرصہ اتنا مختصر بھی نہیں۔ پھر بھی کسی نہ کسی حوالے سے تھوڑا بہت اثر تو بندے پر رہ جاتا ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: شروع شروع میں تو سب لوگوں کی تحریروں کا اثر تھا۔ اگر آپ نے میری پہلی کہانیوں کا مجموعہ پڑھا ہو تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میں خود اپنے لیے ایک الگ ڈائریکشن کا وسیلہ پیدا کرنا چاہ رہا تھا۔ اس وقت جو سرخیل تھے اپنے اپنے اسلوب کے وہ سب کے سب بہترین تھے۔ مگر میں ان کا زیادہ کھل کر اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ خود کو کافی مقید سا محسوس کرتا تھا۔ اکثر تخلیق کے بعد میں کچھ بجھ سا جاتا تھا کہ جیسے کچھ رہ گیا ہے۔

ارژ نگ: افسانے کے حوالے سے ابھی آپ نے جن لوگوں کے نام لیے ہیں ان میں احمد ندیم قاسمی کا نام شامل نہیں ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: احمد ندیم قاسمی بھی ان لوگوں میں برابر کے شریک تھے۔

ارژ نگ: آپ کہہ رہے تھے کہ آپ نے شعوری طور پر اپنا اسلوب تبدیل کرنے کی کوشش کی؟

ڈاکٹر انور سجاد: گریجویلی تبدیل ہوا میری ضروریات کے مطابق شعور کا ظاہر ہے دخل ہوتا ہے اور ویسے بھی شاعر تو نہیں ہوں کہ مضامین غیب سے خیال میں آئیں۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے اچھے شاعر کے پیچھے ان شعوری کوششوں کا دخل بھی ہوتا ہے۔

ارژ نگ: اب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آئندہ کون کون سی کتابیں شائع ہونے والی ہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: میری اب تک شائع ہونے والی کتابوں میں چار مجموعے افسانوں کے ہیں۔ تین ناول ہیں اور ابھی گزشتہ اٹھارہ سالوں سے میں نے افسانہ لکھنا چھوڑا ہوا ہے جس کی مجھے سمجھ نہیں آتی۔

ارژ نگ: غالباً ڈراموں میں آپ کی مصروفیت تو اس کی ایک وجہ نہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: نہیں ڈرامہ تو ایک فارم آف ایکسپریشن ہے۔ عادتاً میں لکھتا نہیں ہوں کہ اچھا برا جو آئے لکھ دو۔ اتنا پڑھنے کے بعد میرے معیارات شاید بہت آگے نکل گئے ہیں۔ میں خود اپنے معیار پر پورا نہیں اُتر پا رہا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بس فکشن لکھنے کو جی

نہیں چاہتا۔

ارژ نگ: شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کچھ عرصہ سے منظر سے غائب ہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: نہیں ایسا نہیں ہے۔ پی ٹی وی پر اکثر سال دو سال بعد میرا ایک لانگ پلے چل جاتا تھا۔ اب پی ٹی وی نے شاید یہ سلسلہ بند کر دیا ہے۔ کمرشل لکھنے میں بہت چوزی ہوں۔ ابھی میرا ایک سیریل چل رہا ہے۔

ارژ نگ: لیکن اگر آپ کی بات عوام کے سر سے گزر جاتی ہے تو؟

ڈاکٹر انور سجاد: عوام آج کل دراصل جم کر کچھ دیکھتی نہیں ہے۔ جب سے ڈش اور کیبل کا چکر چلا ہے اتنی چوائس ہے ان کے پاس انہیں شاید مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

ارژ نگ: لیکن جب آپ کسی مقابلے میں جاتے ہیں تو وہاں پھر ایسی صورت حال ہو گی۔

ڈاکٹر انور سجاد: کس مقابلے میں؟

ارژ نگ: ظاہر ہے جب زیادہ چینل ہوں گے تو ناظرین کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ایک مقابلے کی کیفیت تو بنے گی۔

ڈاکٹر انور سجاد: ہمارے ہاں مقابلے کا احساس نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ٹیلی ویژن پر آپ جو بھی لکھ دیتے ہیں وہ کسی نہ کسی صورت میں چل ہی جاتا ہے۔

ارژ نگ: کیا وجہ ہے کہ پی ٹی وی کے ڈراموں کا وہ پہلے سا معیار نہیں رہا؟

ڈاکٹر انور سجاد: میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ہر زمانے میں سماج جس فن کا مستحق ہوتا ہے اس کو وہی ملتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں آج کا سماج ایسے فن کا مستحق ہے کیونکہ وہ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں۔

ارژ نگ: آپ پہلے اداکار ہیں یا لکھاری؟

ڈاکٹر انور سجاد: میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ یہ دونوں اظہار کے مختلف طریقے ہیں۔ وہ کام جو اداکاری میں ہو سکتا ہے وہ تحریر میں نہیں ہو سکتا اور جو تحریر میں ہو سکتا ہے وہ اداکاری میں نہیں۔

ارژ نگ: اگر آپ کو ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو؟

ڈاکٹر انور سجاد: کیوں کرنا پڑے؟ کون کروائے گا یہ انتخاب؟

ارژنگ: زندگی میں کبھی ایسا موڑ آ جائے۔

ڈاکٹر انور سجاد: تو میں یہ بات مانوں گا ہی نہیں۔ مجھے یہ کون کہہ سکتا ہے یا کسی بھی مخصوص رائٹر کو یہ کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم یہ کرو یہ نہ کرو۔

ارژنگ: کبھی شعر کہنے کا خیال بھی سوجھا؟

ڈاکٹر انور سجاد: ہاں شاعری بہت پڑھی۔ شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن کچھ محدود سا معاملہ تھا۔ پورا خیال نہیں آتا تھا۔

ارژنگ: کبھی فلم کی طرف بھی آپ گئے؟

ڈاکٹر انور سجاد: فلمیں بھی لکھیں اور تقریباً 60 کی بات ہے تین فلمیں لکھی تھیں۔

ارژنگ: کیا نام تھے ان فلموں کے؟

ڈاکٹر انور سجاد: ایک پرچھائیں، ایک افسانہ تھی اور ایک ہم جولی۔

ارژنگ: کامیاب فلمیں تھیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: بالکل!

ارژنگ: تو پھر یہ سلسلہ جاری کیوں نہیں رکھا؟

ڈاکٹر انور سجاد: پہلے جو لوگ تھے وہ مستری نہیں تھے۔ ہمارے ہاں اب فلمسازی میں مستری زیادہ ہیں۔

ارژنگ: آپ کی طرح تقریباً سب کہنے والے یہی کہتے ہیں کہ فلموں میں پڑھے لکھوں کی کمی ہے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ کہاں سے آئیں گے؟

ڈاکٹر انور سجاد: ہر قسم کے کام کے لیے کسی خاص قسم کے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ شروع شروع میں اشفاق صاحب گئے تھے۔ فلم کی طرف دراصل فلموں والے پڑھے لکھے لوگوں کو ہضم نہیں کر پاتے۔ کیونکہ جو ٹائپ آف فنانس آتا ہے اس کی ڈیمانڈز اور ہوتی ہیں۔

ارژنگ: جبکہ ہمارے ہمسایہ ملک میں فلموں کے حوالے سے ہر اچھے برے تجربات ہو رہے ہیں۔

ڈاکٹر انور سجاد: انہوں نے اپنی فلم انڈسٹری پر زور بہت دیا ہے۔

ارژنگ: ہمارے ہاں ایسا کیوں نہیں ہو سکا؟

ڈاکٹر انور سجاد: ہندوستان میں جاگیردار ختم ہو چکا ہے۔ یہاں پر جاگیردار ابھی تک موجود ہے۔ لہٰذا ہر وہ کام جو فارمنگ کا ہے وہ یہاں کے لوگوں کی نفسیات میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہ کنجروں والا کام ہے۔

ارژنگ: کامیابی اور شہرت دو الگ الگ چیزیں ہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: کامیابی کس کو سمجھتے ہیں۔ ہر فنکار میں ایک خود پرستی ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں بہت اچھا ہوں۔ ہر بندہ اپنے نزدیک بہت کامیاب ہے۔

ارژنگ: آپ کو یہاں تک پہنچنے میں کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟

ڈاکٹر انور سجاد: میں نے کبھی نہ کامیابی نہ شہرت کی خواہش کی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک خوبی سے سرفراز فرمایا جس کا اظہار میں اس حد تک پوری ایمانداری سے کرتا ہوں۔ میں نے کوئی شعوری کوشش نہیں کی کہ میں بہت نامور یا کامیاب انسان بنوں۔

ارژنگ: آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ جو پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے وہ پہنچا پائے ہیں کہ نہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کوئی ایسا پیمانہ نہیں ہے کہ میں یہ بتا سکوں کہ لوگوں تک میرا پیغام پہنچا ہے کہ نہیں۔

ارژنگ: بطور ڈرامہ نگار اپنے ہم عصروں میں سے آپ کو کون لوگ پسند ہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: بہتر ہوگا کہ اگر میں کہوں کہ مجھے لوگوں کی بجائے کام زیادہ پسند ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لیں کہ میں شخصیت پرست نہیں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی پسند آ جاتا ہے کبھی کوئی۔

ارژنگ: عجیب بات ہے کہ یہ سوال جب بھی کسی ادیب سے کیا جاتا ہے وہ اس کا بڑا سیاسی قسم کا جواب دیتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سجاد: میں بالکل سیاست نہیں کر رہا۔ بلکہ صاف صاف بتا رہا ہوں۔ بہت بڑے

بڑے ناموں میں اگر آپ مجھے بھی شامل کرتے ہیں۔ تو میں نے بھی برا کام کیا ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں کی جاسکتی کہ آپ کو کون پسند ہے۔ ذاتی طور پر مجھے ہر وہ ڈرامہ پسند ہے جس کا زندگی کے ساتھ تعلق ہو۔

ارژنگ: آج کل ٹی وی پر ہر دوسرا یا تیسرا ڈرامہ اصغر ندیم سیّد کا چل رہا ہے تو کیا مقدار کی زیادتی سے معیار پر فرق نہیں پڑتا؟

ڈاکٹر انور سجاد: میں نہیں جانتا کہ کیوں ٹی وی زیادہ نہیں دیکھتا لیکن وہ اچھے ڈرامہ نگار ہیں اور کمرشل کام میں بعض اوقات ''گھلے آم'' بھی آجاتے ہیں۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کی کیا اہمیت ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: گروہ بندیوں میں بعض اوقات اچھی چیزیں بھی آجاتی ہیں لیکن نقصان ذرا زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کا کوئی گروپ ہے اور آپ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اگر مجھ میں واقعی کوئی صلاحیت ہے تو ظاہر ہے میں آپ سے بہت کچھ سیکھ کے آگے بڑھوں گا لیکن گروہوں میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنا غلط ہے۔ ذاتی اختلاف تو رہتے ہیں اور ذاتی اختلاف ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن ذاتی اور شخصی حوالے سے جو ار کیے جاتے ہیں اس سے نقصان ہی پہنچتا ہے فائدہ کوئی نہیں۔

ارژنگ: تقریبات میں شرکت کے حوالے سے کسی تقریب میں جانے یا نہ جانے کا انتخاب کیسے کرتے ہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: تقریب کی اہمیت دیکھ کے۔ اگر واقعی کوئی ایسی تقریب ہے جس میں مجھے شمولیت کرنی چاہیے تو میں ضرور جاتا ہوں۔

ارژنگ: آپ نے اپنے اساتذہ سے کچھ سیکھا؟

ڈاکٹر انور سجاد: مشکل یہ ہے کہ حکمت کے جو بڑے بڑے نسخے ہوتے تھے اس طرح آج بھی ہمارے ہاں رواج جاری ہے کہ کوئی نہ کوئی اُستاد آپ کو گائیڈ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فن کے ساتھ اس کا ہنر بھی آپ کو آنا چاہیے۔ فن بذاتِ خود اس وقت تک کارآمد نہیں جب تک آپ کو اس کے کرافٹ کا پتہ نہ چلے۔ کرافٹ کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ اس کی

ٹریننگ ضروری ہے اور اساتذہ تو شاید اسی طرح ٹریننگ کرتے ہوں کہ غلط شعر کو اچھا کروایا۔ کہانی میں کوئی سقم آیا تو بتا دیا کہ یار یہ اس طرح کی ہوتی ہے۔ ہاں ایسا کوئی بندوبست نہیں جو ٹیلنٹ کو پالش کر سکے جوان کو کرافٹ دے سکے۔

ارژنگ: اگر کوئی آپ سے سیکھنا چاہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: میں تو سکھا نہیں سکتا اس لیے کہ جب میں خود سیکھنے کے عمل میں ہوں میں تو ابھی خود طالب علم ہوں۔ میں کسی کو کیا سکھاؤں گا۔ ہاں البتہ اگر کسی یونیورسٹی سے مجھے دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ڈرامے کے کرافٹ کے بارے میں آ کر کچھ بتایئے تو لیکچر شپ کے لیے وہ سارے کا سارا پراسس مجھے پڑھنا ہوگا کہ مجھے طالب علموں کو کیسے پڑھانا ہے۔

ارژنگ: ادیب اور شاعر کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

ڈاکٹر انور سجاد: آئی ڈونٹ نو! ادیب شاعر اور جتنے بھی تخلیقی لوگ ہیں یہ اپنا کردار خود متعین کرتے ہیں۔ بعض لوگ ساری عمر انعامات کے پیچھے اقتدار کی غلامی میں ہی گھومتے رہتے ہیں اور اس کے لیے وہ مختلف حربے بھی استعمال کرتے ہیں۔ دوسری طرف محمد خالد اختر کو کوئی پرواہی نہیں۔ وہ ساری زندگی بس اپنا کام کرتے ہیں۔

ارژنگ: بطور ادیب آپ نے اپنی ذمہ داریوں کو کہاں تک پورا کیا ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: جس بات کو میں سچ جانتا ہوں اس کو میں نے پوری قوت بغیر کسی ڈر خوف کے اور بغیر کسی مصلحت کے پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔

ارژنگ: آج کل لکھنے کے حوالے سے آزادی حاصل ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: ہاں! انسان کو بات کرنے کا ڈھنگ آنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ آپ ہمیشہ ہی دھونس سے بات کریں۔ ضروری نہیں کہ آپ کڑوی دوا ویسے ہی پینے کو کہہ دیں۔ کچھ کیپسول بھی ڈال دیتا ہے بندہ۔ بندے کو پتا ہونا چاہیے کہ کس وقت اپنی بات کیسے کہنی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ کس وقت کیا بات کہنی ہے۔ وہ ابن الوقتی اور مصلحت کے زمرے میں آتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کس وقت اور کیسے بات کہنی ہے لیکن کہنی ضرور ہے۔

ارژنگ: بعض اوقات علامت اکثر لوگوں کے سر سے بھی تو گزر جاتی ہے۔

ڈاکٹر انور سجاد: اگر علامت آپ معاشرے کے ساتھ شیئر کر رہے ہیں تو وہ کبھی سر سے نہیں گزرتی اور اگر گزرنے کی کوشش بھی کرتی ہے تو وہ کم از کم پڑھنے والے کو ڈسٹرب ضرور کرتی ہے۔ اگر وہ سنجیدہ قاری ہے تو وہ اس کے معنی تلاش کرنے کی کوشش کرے گا۔ ہمارے ہاں جس طرح سنجیدہ رائٹنگ کا فقدان ہے اسی طرح سنجیدہ قاری کا بھی فقدان ہے۔

ارژنگ: ہمارے ہاں ادب اور ادیبوں کی بہتری کے لیے حکومتی سطح پر جو ادارے بنے ہیں ان کی کارکردگی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: کبھی کبھار کوئی بندہ آ کے چمک کو کھا جاتا ہے لیکن کمٹڈ کوشش نہیں ہے۔ اس کے لیے بندے کو رِسک لینا پڑتا ہے۔ محکمہ کے اندر فائٹ کرنا پڑتی ہے۔ جو لوگ اپنی نوکریوں سے محبت کرتے ہیں وہ لوگ تو ادارے کو زیادہ دور نہیں لے جا سکتے۔ وہ اپنے مختلف تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے وہاں جمے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادارے خراب ہیں۔ جس طرح ہم نے نیف ڈیک کو بند کر دیا کہ کارکردگی بری ہے۔ کس طرح بری ہے۔ بھئی! برے لوگوں کی وجہ سے تو آپ اچھے لوگ آگے لائیں۔ ادارے بند کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا کہ جی فلاں ادارہ کام نہیں کر رہا اس لیے بند کر دیا۔ کیوں کام نہیں کر رہا آپ نے ادارہ بنایا کیوں تھا اگر اس نے کام نہیں کرنا تھا۔ آپ نئے بندے لے آئیں۔

ارژنگ: نئے لکھنے والوں کو کوئی مشورہ دیں گے؟

ڈاکٹر انور سجاد: نئے لکھنے والوں کو میں کیا کوئی مشورہ دوں گا بلکہ نئے لکھنے والے مجھے کافی مشورے دیتے ہیں۔ ویسے بھی یہ مشورے بڑے محنتی قسم کے لوگ دیتے ہیں مثلاً اشفاق صاحب ہیں۔ وہ مشورہ دے سکتے ہیں۔

ارژنگ: قومی سطح پر جب بھی حکومت کو کسی مسئلے کے حوالے سے مشاورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ادیبوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: آپ نے یہ سب سے اہم سوال کیا ہے۔ میں بڑا خوش ہوں کہ آپ نے یہ سوال کیا ہے۔ اس کے کئی جواب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جن سے مشورے کی ضرورت

ہوتی ہے یعنی رائٹرز وغیرہ سے تو یہ بتاؤں کہ کبھی ہم نے آپس میں مل بیٹھ کر قومی معاملات پر غور نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ ادب ضمیر ہوتا ہے۔ ہم نے اپنا یہ رول ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ رائے عامہ بنانے والے نہیں رہے۔ اس لیے حکومت کو ان کے پریشر کا اندازہ ہی نہیں۔ مجھے کوئی کانفرنس بتایئے سوائے حکومتی کانفرنسوں کے جو ادیبوں نے اپنے طور پر کسی مسئلے پر صوبائی یا قومی سطح پر خود آرگنائز کی ہو۔ حلقے میں ایک آدھ مسئلے پر شاید کوئی بحث ہو جاتی ہے۔

ارژنگ: آپ اس مسئلے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہیں؟

ڈاکٹر انور سجاد: بالکل کرتا ہوں۔

ارژنگ: آپ نے اس حوالے سے کیا کیا ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: میں کچھ نہیں کرتا۔

ارژنگ: کیوں نہیں کرتے؟

ڈاکٹر انور سجاد: اس لیے کہ مجھے سب کا پتا ہے۔ وہ کوئی الزام دے دیتے ہیں۔ یہی کہ اس کا کوئی مقصد ہے۔

ارژنگ: اس کا حل کیا ہے؟

ڈاکٹر انور سجاد: ادیبوں کو جوائن کرنا چاہیے۔ فورم بنانا چاہیے تاکہ قومی سطح پر بات کریں اور آگے پہنچائیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کسی آدمی کی اس میں دلچسپی ہی نہیں۔

ارژنگ: پھر کون آگے آئے گا؟

ڈاکٹر انور سجاد: یہ نوجوان لوگوں کا کام ہے۔

ارژنگ: اس صورت میں کیا سینئرز ان کا ساتھ دیں گے؟

ڈاکٹر انور سجاد: بالکل ساتھ دینا تو چاہیے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ نوجوانوں کو سنجیدہ لیتے ہی نہیں۔ وہ صرف اخباری بیانات تک ہی محدود ہیں کہ نوجوان بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

○ سنجیدہ شاعر اپنی شاعری میں محبوبہ کے اردگرد جبکہ مزاحیہ شاعر منکوحہ کے اردگرد دکھائی دیتا ہے۔

○ ایوارڈز کا تعلق، تعلق سے ہے کارکردگی سے نہیں۔

○ ہر بڑے شاعر کا اپنا نقاد ہے جو نوحہ خواں کی حیثیت سے اُس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

ارژنگ: آپ نے سنجیدہ شاعری بھی کی لیکن اس میں آپ کو وہ شہرت و کامیابی نہ مل سکی جو بطور مزاحیہ شاعر کے ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: اگر اس سوال سے آپ کی مراد یہ ہے کہ میں اپنی سنجیدہ شاعری سے مایوس ہو کر شعوری طور پر ادھر آیا تو شاید یہ الزام درست نہیں، کیونکہ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے فنون جیسے وقیع ادبی جریدے سے چھپنے کا آغاز کیا اور یہ گزشتہ صدی کے ساتویں دہائی کے وسط کی بات ہے آج کی بات نہیں جب سینکڑوں ادبی پرچے ادبی رزق کی تلاش میں ادیبوں سے ان کی تخلیقات کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اسی طرح اس وقت بھی دوسرے شہروں میں ملفوف مشاعرے پڑھا کرتا تھا اور اپنی سنجیدہ شاعری سے مطمئن تھا لیکن ساتھ ہی کہیں ایک مزاح نگار بھی کسی کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ڈرا ہوا، سہا ہوا اور چپ چاپ اندر ہی اندر منمناتا ہوا۔ پھر جب میں اسلام آباد آیا اور یہاں جنرل شفیق

الرحمٰن، سید ضمیر جعفری، سرفراز شاہد اور انور مسعود کی رفاقت میسر آئی تو اس مزاح نگار نے سر اٹھانا شروع کر دیا اور جب اسے تھاپڑا ملا تو یہ اور شیر ہو گیا۔ لاہور میں بھی مجھے عطاء الحق قاسمی جیسے صاحب طرز مزاح نگار کی قربت حاصل رہی بلکہ یوں سمجھئے کہ انہوں نے ہی ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے میری ساری ٹریننگ کی اور میں آج جو کچھ ہوں انہی کے طفیل ہوں ۔عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سنجیدہ شاعری کا اپنا مقام ہے مزاحیہ شاعری کا اپنا تاہم یہ درست ہے کہ جو شہرت مجھے شاعری کے باعث حاصل ہوئی وہ شاید سنجیدہ شاعری سے نہ ملتی کیونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار شعراء میں اپنا الگ اور منفرد مقام بنانا آسان کام نہیں۔

ارژنگ: مزاحیہ شاعری کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: مزاحیہ شاعری کی ادبی حیثیت وہی ہے جو ادب میں شاعری کی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص سنجیدہ شاعری کر رہا ہے کوئی قومی شاعری کر رہا ہے کوئی مذہبی شاعری کر رہا ہے کوئی موضوعاتی شاعری کرتا ہے اور کوئی مزاحیہ شاعری کر رہا ہے۔ مزاح دراصل بات کرنے کا ایک انداز ہے۔ موضوعات تو مزاح کے بھی وہی ہیں جو سنجیدہ کے ہیں بس ان موضوعات کی ٹریٹ منٹ اور انہیں استعمال کرنے کا انداز مختلف ہے۔ دونو ں طرح کے شاعر ملا محتسب، دوغلے پن، ظاہر داری، ظلم، زیادتی، معاشرتی تفاوت، امیرو غریب کے فرق اور طبقاتی تفریق کو طنز و تنقید کا نشانہ بناتے ہیں اور اس پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ایک ایسے خوشحال معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں اور دکھاتے ہیں جو مساوات اور عدل پر مبنی ہو۔ دونوں طرح کے شاعر لطیف جذبات کے ابھار کے لیے معاملا ت من و تو بیان کرتے اور وصل و فراق کے رونے روتے ہیں بس اس فرق کے ساتھ کہ سنجیدہ شاعر اپنی شاعری میں محبوبہ کے اردگرد جب کہ مزاحیہ شاعر منکوحہ کے اردگرد دکھائی دیتا ہے۔

ارژنگ: ہمعصر مزاحیہ شاعروں میں کون سے پسند ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: حاضر سروس شعراء میں سے انور مسعود، امیر اسلام ہاشمی، سرفراز شاہد ،اطہر شاہ جیدی، ضیاء الحق قاسمی، خالد مسعود اور زاہد فخری خاص طور پر پسند ہیں کہ یہ لوگ

اپنی اپنی جگہ مزاحیہ شاعری کو نئے آہنگ اور نئے رنگ سے روشناس کرا رہے ہیں۔ وفات شدگان میں سے سید ضمیر جعفری نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یعنی اردو کی مزاحیہ شاعری میں سلسلہ ضمیر یہ اور پنجابی کی مزاحیہ شاعری میں سلسلہ مسعود یہ سے تعلق رکھتا ہوں۔

ارژنگ: بقول منیر نیازی ادبی ایڈیشن، اخبارات و رسائل پراگندگی پھیلا رہے ہیں ایک ادبی اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ کیا کہیں گے؟

ڈاکٹر انعام الحق: منیر نیازی ایک فقرے باز شخص ہیں۔ ترنگ میں آ کر کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ خود منیر نیازی کو بھی تو پورے ملک میں انہی ادبی ایڈیشنوں نے ہی پھیلایا ہے حالانکہ وہ پراگندگی نہیں ہیں بلکہ سرتاپا حسن اور خوبصورتی ہیں۔ ۷۷۔۱۹۷۶ء کے زمانے میں عطاء الحق قاسمی نے نوائے وقت کے اکلوتے ادبی ایڈیشن کے ذریعے منیر نیازی کے چست اور تیکھے انٹرویوز کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔ اس لیے ایک ہی سانس میں سب کو لپیٹ لینا موزوں نہیں۔ ادبی اخبار اور ادبی ایڈیشن ادب اور فروغ ادیب کے ابلاغ کا ایک موثر بلکہ موثر ترین ذریعہ ہیں تاہم کبھی کبھی کہیں ایسی باتیں بھی چھپ جاتی ہیں جنہیں پڑھ کر گھن آتی ہے اور لکھنے والوں کی شودرانہ ذہنیت کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں بھی منیر نیازی سے متفق نہیں ہوں کیونکہ ایسے لوگ پراگندگی نہیں بلکہ براہ راست گندگی پھیلا رہے ہیں

ارژنگ: آپ بیک وقت استاد نقاد اور شاعر ہیں آپ کے نزدیک آپ کی اصلی پہچان کس حوالے سے ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: میرا خیال ہے کہ میری اصل پہچان شاعری ہی ہے۔ باقی اضافی شوق ہیں تاہم یہ شوق بھی ادبی ہی ہیں جو تخلیقی سفر کو آسان بنانے میں مدد ثابت ہو رہے ہیں۔ مثلاً ٹی وی کے صبح کے لائیو پروگرام سخن رنگ کی کمپیئرنگ کے باعث ہر ہفتے آٹھ دس کتابیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں اور ایک دو ادیبوں سے تفصیلی ملاقات ہو جاتی ہے۔

ارژنگ: ہمارے ہاں کارکردگی اور ایوارڈز کا آپس میں کس حد تک تعلق ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: ایوارڈز کا تعلق، تعلقؔ سے ہے کارکردگی سے نہیں۔ جس سے کوئی

تعلق ہوتا ہے یا جس کا کوئی تعلق ہوتا ہے وہ ایوارڈ لے جاتا ہے۔ بعضوں کی کارد یکھی جاتی ہے بعضوں کی کارکردگی، تاہم جینوئین ادیبوں کو بھی بعض اوقات کوئی ایوارڈ مل جاتا ہے۔ صرف ادب میں ہی نہیں ہر معاملے میں صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں پوری دنیا میں اور صرف آج سے ہی نہیں بلکہ ہبوط آدم سے ہی عدلیہ کے کردار سے کوئی مطمئن نہیں رہا۔ چنانچہ ادبی عدلیہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ حتیٰ کہ نوبل ایوارڈ کے پیچھے آپ کو کئی کئی کہانیاں ملیں گی۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کی کیا اہمیت ہے اور آپ کا تعلق کس ادبی گروہ سے ہے۔؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: ادبی گروہ بندیوں میں بندیوں کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت بندوں کے اور گروہ کے گرو کا اس میں ایک خاص کردار ہوتا ہے۔ میں ادب کے فرقہ قاسمیہ کے ندیموں میں سے ہوں اور عطاء الحق قاسمی کے حوالے سے حق پرست گروپ سے تعلق رکھتا ہوں۔

ارژنگ: ملکی و بین الاقوامی مشاعرے ادب کی ترویج میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق: بہت مثبت کردار ادا کر رہے ہیں۔ شاعروں اور مشاعروں کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ مشاعروں کی وجہ سے شاعروں میں مسابقت اور شاعری میں جدت ہے۔ ان کھاڑوں میں اتر کر پہلوانانِ سخن اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گویا یہ مشاعرے دراصل شاعری کے مظاہرے ہیں۔

ارژنگ: ہمارے نقاد کس حد تک غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: ان کے غیر جانبدار ہونے کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔ جب چاہتے ہیں غیر جانب دار ہو جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں غیر ذمہ دار ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو ادب خاصا بدقسمت ہے ہر گروہ کا اپنا نقاد ہے۔ ہر بڑے شاعر کا اپنا اپنا نقاد ہے جو نوحہ خواں کی حیثیت سے اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ دو تین نقاد میری نظر میں تھے جنہوں نے اپنی بڑی ساکھ بنا رکھی تھی مگر افسوس کہ وہ بھی شاعرات کے ہاتھوں مات کھا گئے۔ ہمارے نقاد بے چارے مجبور نقاد ہیں ان سے تو عربی شاعر ابو نواس ہی بہتر تھا جسے خلیفہ وقت نے اپنی شاعری کے بارے رائے دینے کے لیے کہا اور سچی رائے دینے کے بدلے میں اسے

جیل بھیج دیا گیا۔ جب سزا کاٹ کے واپس آیا اور خلیفہ وقت نے پھر اسے تازہ کلام سنا کر رائے چاہی تو ابونواس اٹھ کر چل پڑا خلیفہ نے پوچھا کدھر؟

ابونواس بولا جیل اور کدھر:

ارژنگ: لاہور اور اسلام آباد کی ادبی فضا میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: وہی جو لاہور اور اسلام آباد کی آب و ہوا میں ہے ۔لاہور کے بڑے شاعر عہد کے لحاظ سے بڑے اور اسلام آباد کے بڑے شاعر عہدے کے لحاظ سے بڑے ہیں۔

ارژنگ: آج کل کس کام میں مصروف ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: آج کل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے چھ پاکستانی زبانوں (بلوچی، براہوئی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، سندھی) میں ایم فل پاکستانی زبانیں کے کورس کے اجزاء میں مصروف ہوں۔ خیال ہے کہ اس سال اگست سے یہ کورس شروع کرادیا جائے اور اس سلسلے میں موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر انوار حسین صدیقی خود بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ تاہم خاصا کٹھن مرحلہ ہے اور آج کل ہمارے شعبے کی پوری ٹیم دن رات اس کٹھن مرحلے کو سر کرنے میں مصروف ہے۔ قومی یکجہتی کے فروغ اور کثیر اللسانی ماہرین کی کمی پوری کرنے کے لیے یہ کورس یقیناً ایک سنگ میل ثابت ہوگا اور اسی لیے آج کل میری ساری توجہ اس طرف ہے۔

ارژنگ: روداد نکالنے کا خیال کیسے آیا؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: بس بیٹھے بیٹھے دسمبر ۱۹۹۹ء میں جنون سوار ہوا اور جنوری ۲۰۰۰ء میں پہلا شمارہ نکال باہر کیا۔ ایک سال تک تو یہ سلسلہ ریگولر چلتا رہا مگر اب دیگر مصروفیات نے اس میں تعطل میں ڈال دیا ہے۔

ارژنگ: اب تک کے تخلیقی سفر سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید: اللہ کا شکر ہے جس نے لفظوں کو برکت دی اور ان میں تاثیر کی قوت پیدا کی۔

اسلم کولسری

○ ہمیں سارے تجربات مسلمہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہوں گے۔

○ مجھے وہ آنگن بہت یاد آتا ہے جس میں میرے ماں باپ کے قدموں کے نشان ہوا کرتے تھے۔

○ میں نے تیر کسی فن میں بھی نہیں مارا، ناکامی البتہ اپنی محنت سے حاصل کرتا ہوں۔

موجودہ دور میں مشاعرہ ڈرامہ بنتا جا رہا ہے۔ جدت اور ندرت اچھی بات ہے لیکن تجربات مسلمہ حدود میں رہتے ہوئے کرنے ہوں گے۔ یہ بات نامور شاعر اور کالم نگار اسلم کولسری نے ارژنگ کے ساتھ ایک انٹرویو میں کہی۔ مزید گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں صاحب کتاب کا تعارف اور کتاب کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔

ارژنگ: شاعری کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی؟

اسلم کولسری: میٹرک کے بعد جب گاؤں سے اوکاڑہ آیا تو جہاں میں رہتا تھا وہاں قریب ہی کالج کے چند طالب علم بھی رہتے تھے۔ انہی میں سیّد ناصر بھی تھے۔ میں ان دنوں پرائیویٹ کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔ سیّد ناصر سے میری دوستی کالج مشاعروں میں حصہ لینے تک تھی۔ وہ غزل کہتے تھے میں ان کی غزل میں کبھی رائے دیا کرتا تھا۔ انہی دنوں ستلج کاٹن ملز میں مشاعرہ ہوا۔ صدارت ڈپٹی کمشنر ساہیوال نے کی۔ مہمان خصوصی ناصر شہزاد تھے۔ سیّد ناصر جمعے کو میرے پاس آئے کہ مشاعرے میں شرکت کرنی ہے اور میرا نام بطور شاعر

دے دیا ہے۔ میں نے پریشان ہو کر کہا میں نے کبھی شعر کہا نہیں۔ سیّد ناصر نے بہت اصرار کیا تو میں نے غزل کہنے کی کوشش کی۔ اس طرح میں نے اپنا پہلا باقاعدہ شعر یہ کہا:

سوئے مقتل چل رہے ہیں پھر بھی محو رقص ہیں
ساز سے کچھ کم نہیں زنجیر کی جھنکار بھی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:

ہم بھی تنکے چن رہے ہیں آشیانے کے لیے
گو نظر آتے ہیں طوفان کے آثار بھی

پہلی بار جب سٹیج پر گیا تو ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن سامعین کی حوصلہ افزائی پر دوسرے شعر کے بعد سنبھل گیا۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اوکاڑہ میں پندرہ روزہ ادبی نشست ہوتی تھی وہاں راؤ جمشید علی خاں لے گئے۔ جہاں ایچ غلام صادق اور محمد اقبال، راؤ تحسین، سیف اللہ صاحب اور کچھ اور دوست کافی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اسی طرح وہاں پروفیسر ممتاز محی الدین صاحب بھی تھے۔ ان کے ہاں محفل ہوتی تھی جس میں اسلم نجمی، انور چوہدری، یونس خان اور دوسرے دوست شریک ہوتے تھے۔ وہاں یہ شاعری پروان چڑھتی رہی۔ اس کے بعد ٹیچنگ چھوڑ کر عرفان فاریسی میں آ گیا۔ جہاں ایڈووکیٹ حفیظ جاوید مرحوم، ڈاکٹر ضیاء الحق، ڈاکٹر سیّد خالد جو آج کل ارجنٹائن میں پاکستان کے سفیر ہیں۔ منور جاوید اور صوفی عبدالباری صاحب جو خود بھی شاعر تھے وہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ میں نے اپنی پہلی غزل اوراق کو بھیجی۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے واپس کر دی کہ یہ انداز بہت پرانا ہے۔ تب تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن بعد میں غور کرتا رہا ذہن اس طرف آمادہ ہو گیا۔ اس کے بعد شاعری کا رنگ بدلا اور غزل سامنے آئی جس کے دو شعر دوستوں نے پسند کیے۔

شہر میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

میں نے اپنے سارے آنسو بخش دیے
بچے نے تو ایک ہی پیسہ مانگا تھا

اس کے بعد اقبال صلاح الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑی شفقت اور مہربانی کا ثبوت دیا اور مجھے مجموعہ کلام ترتیب دینے پر آمادہ کیا۔ مجموعے کی ترتیب وتزئین میں پروفیسر ابواعجاز اور حفیظ صدیق نے بہت معاونت کی۔ اس طرح اقبال صلاح الدین صاحب کی توسط سے میرا پہلا مجموعہ ''نخلِ جاں'' کے نام سے سامنے آیا۔ 1981ء میں لاہور آ گیا۔ یہاں مکتبہ تعمیر انسانیت کے سعید اللہ صدیق صاحب سے سعد اللہ شاہ صاحب نے متعارف کرایا۔ سعید صاحب بہت مہربان ثابت ہوئے۔ میرے باقی مجموعے انہوں نے ہی شائع کیے ہیں۔

ارژنگ: اب تک آپ کے کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

اسلم کولسری: اب تک میرے سات شعری مجموعے آ چکے ہیں۔ ان میں چھ اُردو اور ایک پنجابی میں ہے جن کے نام بالترتیب یوں ہیں:

نخلِ جاں، کاش، ویرانہ، پنچھی (پنجابی) نیند، جیون اور برسات

اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد اکرم چغتائی کے توسط سے آسٹریا کی جدید شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔ جو ''ایک نظر کافی ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ نثر کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لیکن روزنامہ مشرق میں ''روشنیوں سے دور'' کے عنوان سے کالم لکھتا رہا ہوں۔

ارژنگ: کبھی ٹی وی ڈرامے فلمی کہانیاں یا گیت وغیرہ لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

اسلم کولسری: سوچتا تو ہوں لیکن یہ فلم اور ٹی وی کا راستہ مجھے بہت دُشوار نظر آتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کا جو ایک خاص انداز ہے وہ مجھے نہیں آتا۔ کبھی اتفاق ہوا تو ضرور کوشش کروں گا۔ جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے تو ریڈیو، ٹیلی ویژن کے لیے میں نے گیت لکھے ہیں لیکن فلم سے رابطے کا اتفاق نہیں ہوا۔ موقع ملا تو ضرور لکھوں گا بلکہ میری خواہش ہے کہ کوئی اچھی ٹیم ملے تو میں فلم کے گیت اور کہانی لکھوں۔

ارژنگ: اب تک آپ کو کسی کتاب پر ایوارڈ ملا اور اگر نہیں تو اس کی وجہ آپ کے نزدیک

کیا ہے؟

اسلم کولسری: ابھی تک مجھے کسی کتاب پر ایوارڈ نہیں ملا۔ شاید اس لیے کہ ان میں سے کوئی کتاب ایوارڈ کے قابل نہیں ہوگی۔

ارژنگ: ہمارے ناقدین ادب انصاف سے کام لیتے ہیں؟

اسلم کولسری: میرے خیال میں تو انصاف سے کام لیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہماری فطرت میں وضع داری بھی ہے۔ اس لیے لحاظ سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

ارژنگ: دیباچہ اور فلیپ نگاری کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

اسلم کولسری: دیباچے اور فلیپ نگاری میں تنقید کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس میں صرف کتاب کی خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مثبت رائے ہی بھلی لگتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کتاب کا دیباچہ نگار یہ لکھے کہ کتاب پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔

ارژنگ: موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار رہ گیا ہے؟

اسلم کولسری: مشاعرے ہونے چاہئیں تاکہ سامعین اور ناظرین کو تھیٹر ڈرامے اور کھیل کے علاوہ بھی کچھ تو میسر ہو۔ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ دوسری تینوں چیزیں تھیٹر ڈرامہ اور کھیل اس قدر غائب ہو گئے ہیں کہ مشاعروں میں سامعین تھیٹریکل موڈ لے کر آتے ہیں اور زیادہ تر ہوٹنگ انجوائے کرتے ہیں لیکن یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے اور بہتری کی اُمید رکھنی چاہیے۔ بیرونِ ملک مشاعروں کی فضا نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے پردیسیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع ملتا ہے۔ وطن سے آنے والوں کو سننے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک خالص دیسی تقریب ہوتی ہے جسے وہ پردیس میں خوب انجوائے کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ سوال کہ مشاعروں میں جو سیکھنے اور سکھانے کی روایت تھی باقی ہے یا نہیں تو میں کہوں گا کہ مشاعرے کی روح اب سامعین کے دل و دماغ میں نہیں ہوتی نہ ان کا مقصد کوئی سیکھنے کا ہوتا ہے۔ وہ صرف ہوٹنگ کرنے آتے ہیں۔

ارژنگ: کسی شاعر کی کامیابی کا معیار مشاعروں میں اس کی مقبولیت کو قرار دیا جاسکتا ہے؟

اسلم کولسری: مشاعروں میں وہ لوگ بھی جاتے ہیں جو کسی اور حوالے سے مقبول ہوتے ہیں۔ یہاں میں ایک واقعہ بیان کروں گا۔ قطر کے ایک مشاعرے میں عطاء الحق قاسمی صاحب کو بہت داد ملی۔ مشاعرے کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں ادبی ایڈیشنوں کی وجہ سے مشاعروں میں بلایا جاتا ہے۔ ایسا نہیں آپ نے دیکھا کہ لوگوں نے مجھے کتنی محبت سے سنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ مختلف حوالوں سے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کسی کو میری کالم نگاری پسند ہے کسی کو میرے ڈرامے اچھے لگتے ہیں۔ اسی طرح وہ میری شاعری کو بھی پسند کرتے ہیں۔

ارژنگ: جدت پسندی کے نام پر ہمارے ہاں ادب میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے مطمئن ہیں؟

اسلم کولسری: جدت اور ندرت اچھی بات ہے لیکن ہمیں سارے تجربات مسلمہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کرنے ہوں گے۔ تبھی وہ مقبول ہوں گے۔ جدت کے نام پر غزل میں ردیف کو پہلے، قافیہ کو درمیان میں رکھ دینا اس سے بات نہیں بنے گی۔

ارژنگ: ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب میں سے کس پر یقین رکھتے ہیں؟

اسلم کولسری: دونوں ضروری ہیں۔ ادب برائے اصلاح بھی اور ادب برائے ادب بھی۔ مگر ان میں تناسب ہونا ضروری ہے۔ ادب برائے ادب بھی ادب برائے زندگی ہے۔

ارژنگ: ہم عصر شعراء میں کون کون پسند ہے؟

اسلم کولسری: سبھی پسند ہیں اور سبھی بہت اچھا شعر کہتے ہیں۔ بزرگ بھی حق ادا کر رہے ہیں اور نوجوان بھی حیران کر رہے ہیں۔ ان میں میں شامل نہیں ہوں۔

ارژنگ: نامور ادیب ظفر اقبال کا تعلق بھی آپ کے شہر اوکاڑہ سے ہے۔ آپ ان کو بطور شاعر معتبر سمجھتے ہیں یا بطور کالم نگار؟

اسلم کولسری: میں تو ظفر اقبال کو بطور شاعر زیادہ معتبر سمجھتا ہوں لیکن ان کی کالم نگاری بھی اچھی ہے۔ جس طرح انہوں نے شاعری میں نئی سمتیں روشن کی ہیں وہی کوشش وہ کالم نگاری میں بھی کرتے ہیں لیکن اہمیت ان کی شاعری کو ہی حاصل ہے۔

ارژنگ: کس صنف ادب میں لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتے ہیں؟

اسلم کولسری: یوں تو سب کچھ لکھتے ہوئے آسانی محسوس کرتا ہوں۔ تاہم میں نے تیر کسی فن میں بھی نہیں مارا۔ اپنی سی جو کوشش کرتا ہوں وہ اگرچہ ناکام ہوتی ہے لیکن میرے لیے وہ دُشوار نہیں ہوتی اور یہ آسانی خدا تعالیٰ کی عطا ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ ناکامی البتہ اپنی محنت سے حاصل کرتا ہوں۔

ارژنگ: شعر کیوں کہتے ہیں؟

اسلم کولسری: قدرت نے یہ صلاحیت عطا کی بعد میں ایسا ماحول ملا کہ میں شعر گوئی کی طرف مائل ہوتا گیا۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

ارژنگ: اگر یہ خداداد صلاحیت ہے تو پھر سینئر، جونیئر کا جھگڑا کیسا؟

اسلم کولسری: دیکھیں صلاحیت بھی تو کم یا زیادہ ہو سکتی ہے اور پھر اس میں انسان کی محنت اور ریاضت اس درجہ بندی کا باعث بنتی ہے۔

ارژنگ: شاعری میں ''محنت اور ریاضت'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت کریں گے؟

اسلم کولسری: میں اپنا تجربہ بتاتا ہوں۔ بعض اوقات شعر کہنے کا موڈ ہوتا ہے۔ اسی دوران میں کوئی کام یا مجبوری سامنے آ جاتی ہے۔ میں شاعری کے موڈ کا بیڑہ غرق کر کے اس کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ یہ میری غفلت ہے یا بے نیازی ہے۔ اگر ایسی کیفیت میں میں کام کو خواہ کتنا بھی ضروری کیوں نہ ہو نظر انداز کر کے اپنی اس کیفیت سے استفادہ کروں اور شاعری یا ذہن میں آئی ہوئی غزل کو مکمل کروں تو اسے محنت کہیں گے۔ میں ایک مدت سے ایسی کیفیت کو ہوا میں اُڑا رہا ہوں سو محنت نہیں کر رہا ہوں۔ جہاں تک ''ریاضت'' کا تعلق ہے اس میں مطالعہ شامل ہے۔ علم عروض پر مکمل دسترس حاصل کرنے کی کوشش شامل ہے اور میرے مرحوم دوست حسن رضا خان کا مشورہ شامل ہے کہ روزانہ شاعری کرو۔ بے شک وہ غزلیں پھاڑتے چلے جاؤ۔ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی آپ ایسی غزل کہنے میں ضرورت کامیاب ہو جائیں گے جس سے آپ مطمئن ہوں گے۔

ارژنگ: اور ان شعراء کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو روزانہ اس ریاضت سے تو

گزرتے ہیں اوراس کے نتیجے میں وہ اب تک لاتعداد مجموعوں کے مصنف ہیں۔مگران کی شاعری سے نہ تو قاری مطمئن ہےاور غالباًنہ وہ خودہی مطمئن ہیں؟

اسلم کولسری: اگر وہ خود مطمئن نہ ہوتے تو کبھی بھی مجموعے شائع نہ کرتے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ان کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں ان سے کہیں زیادہ انہوں نے انتخاب کرتے وقت ضائع کردیے ہوں۔

ارژنگ: غالباًآپ طنز کررہے ہیں؟

اسلم کولسری: (مسکراتے ہوئے) ہرگزنہیں۔

ارژنگ: اب تک آپ کے جتنے بھی انٹرویوز چھپے ہیں ان میں آپ نے اس بات کا خاص اہتمام کیاہے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ایسا آپ مزاجاً کرتے ہیں یا احتیاطاً؟

اسلم کولسری: زیادہ مزاجاً کم کم احتیاطاً۔

ارژنگ: اس احتیاطاً کوہم ''بزدلی'' بھی کہہ سکتے ہیں؟

اسلم کولسری: ضرور۔

ارژنگ: بےشک آخرت میں اس کا حساب دیناپڑے؟

اسلم کولسری: اللہ معاف کرنے والاہے۔

ارژنگ: گویا آپ ایسے شعراء کےحوالے سے ڈنڈی مارنے کااعتراف کررہے ہیں؟

اسلم کولسری: اب مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی پڑے گی۔دیکھیں ایک تو میری طبیعت میں لڑائی جھگڑا نہیں۔دوسرا مجھے اس کا تجربہ بھی نہیں اور تیسری بات اگر آپ غور کریں جس شخص نے آپ کودکھ پہنچایاہے اس نے کبھی نہ کبھی آپ کوسکھ بھی پہنچایا ہوگا۔میں ارادتاً ان خوشگوار لمحوں کواپنے ذہن میں ہمیشہ زندہ رکھتاہوں۔اس طرح دُکھ کی اذیت کم ہوجاتی ہےاور میں اس سطح پرنہیں آتا کہ لڑائی جھگڑے پرآمادہ ہوجاؤں۔اس کیفیت کو میں نے ایک شعر میں بھی بیان کیاہے۔

بہر صورت ستم سہنا کسے مرغوب ہے لیکن
کوئی احسان کر دیتے وہ بیداد سے پہلے

ارژنگ: کیا شاعری میں بسیار گوئی شاعری کے معیار پر اثر انداز نہیں ہوتی؟

اسلم کولسری: نہیں میرے بھائی اچھا شاعر جتنا بھی زیادہ لکھے اچھا لکھے گا۔ جیسے مولانا روم اور علامہ اقبال اور کئی دوسرے شعراء کرام اور کم تر صلاحیت والا شاعر ساری زندگی میں تین بھی شعر کہتے تو تینوں بیکار ہوں گے۔

ارژنگ: یہاں ''کئی دوسرے شعراء'' سے آپ کا اشارہ کن کی طرف ہے؟

اسلم کولسری: میں نے مولانا روم اور علامہ اقبال کا ذکر کر کے ان شعراء کی جانب اشارہ کر دیا ہے جو اس سطح کے ہیں۔

ارژنگ: کبھی نثر لکھنے کا خیال آیا؟

اسلم کولسری: میں نے لکھنے کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا اور ایک انتہائی دردناک افسانہ لکھا۔ دردناک پر داوین لگا لیجیے۔ اس وقت میرے واحد سامع اور میرے دوست سیّد ناصر تھے۔ ان کو سنایا تو وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ یاد رہے کہ انتہائی دردناک افسانہ تھا۔ چنانچہ میں نے افسانے کے اس دردناک انجام پر کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ شاعری کے سلسلے میں ایسا نہ ہو سکا بلکہ شاعری پر مجھے انہوں نے ہی اُکسایا تھا اور پہلی غزل پر خوب داد دی تھی لیکن سنجیدگی کے ساتھ۔ اس طرح یہ سلسلہ چل نکلا۔ روزنامہ مشرق میں رہتے ہوئے کالم نگاری کی کوشش کی۔ کچھ لکھے وہ ''اینویں'' سے تھے۔ آج کل تو شاعری بھی بہت کم کم ہو رہی ہے۔

ارژنگ: اب تک آپ کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

اسلم کولسری: اب تک میرے آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک پنجابی شعری مجموعہ ہے اور باقی سات اُردو مجموعے ہیں۔

ارژنگ: آٹھ مجموعوں کی اشاعت کے باوجود آج تک آپ نے کسی مجموعے کی تقریب رونمائی نہیں کی۔ خبر سننے میں نہیں آئی۔ حالانکہ آپ کے دوستوں کی ایک لمبی چوڑی فہرست ہے؟

اسلم کولسری: میں جب اوکاڑہ میں تھا تب میری پہلی کتاب ''نخل جاں'' شائع ہوئی تھی۔ اس کی تقریب لاہور میں ہوئی تھی اور اس کا اہتمام نعیم اظہر مرحوم، انور قمر اور یوسف مثالی

نے کیا تھا۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ باقی کتابوں کی تقریب رونمائی نہیں ہوئی۔ کیونکہ مجھے اس کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ ہاں البتہ پچھلے دنوں خبریں اور ادبی تنظیم ''روش'' کے زیر اہتمام میرے ساتھ ایک تقریب ہوئی جس کا اہتمام ممتاز نوجوان شاعر ثناء اللہ شاہ نے کیا۔ بلکہ انہوں نے مجھے اس تقریب کے لیے مجبور کیا اور اس کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی پرخلوص کوششیں کیں اور آپ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ روزنامہ ''خبریں'' کے طاہر انجم اور عفت علوی نے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں انتہائی جدوجہد کی۔

ارژنگ: اس تقریب میں ملک کے ممتاز نقاد خواجہ زکریا نے آپ کو عصر حاضر کے دس بہترین شعراء میں شمار کیا۔ آپ کے خیال میں باقی نو کون سے ہیں؟

اسلم کولسری: اصل میں جب کسی کے ساتھ تقریب منعقد کی جاتی ہے تو اس کی کارکردگی کی تعریف کی جاتی ہے۔ خامیوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے بھی میری حوصلہ افزائی کی جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

ارژنگ: کیا ایسا ممکن ہے کہ خواجہ صاحب جیسا سنجیدہ نقاد برسرعام اتنی بڑی رائے محض کسی کی عزت افزائی کے لیے دے دیں؟

اسلم کولسری: پھر میں عرض کروں گا کہ ایسی تقریب کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اس بات کو ان کی حتمی رائے نہیں سمجھنا چاہیے۔

ارژنگ: آپ اتنے مردم بےزار کیوں ہیں؟

اسلم کولسری: ایسی بات نہیں۔ میں فطری طور پر کم آمیز ضرور ہوں۔ خلوت کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔

ارژنگ: آپ لاہور جیسے شہر میں ایک عرصہ سے رہ رہے ہیں لیکن مزاجاً ابھی تک آپ اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکل سکے کیوں؟

اسلم کولسری: واقعی مجھے گاؤں بہت یاد آتا ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اب اس کا وجود باقی نہیں رہا۔ مجھے وہ آنگن بہت یاد آتا ہے جس میں میرے ماں باپ کے قدموں کے نشان ہوا کرتے تھے۔ وہ درخت بھی یاد آتے ہیں جن کے نیچے کھیلتے ہوئے میرا بچپن گزرا۔

گاؤں کے بڑے بوڑھے اور ہمجولی بہت یاد آتے ہیں۔ میں انہیں بھلا نہیں سکتا۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں۔

ارژنگ: آپ کا ایک شعری مجموعہ ''کاش'' کے نام سے چھپا ہے۔ کسی حد تک آپ کی ساری شاعری اس ایک لفظ کے گرد گھومتی ہے۔ اس ''کاش'' کی وضاحت کریں گے؟

اسلم کولسری: کاش اپنی وضاحت خود ہے اور اس کی تفصیل میری شاعری میں بھی موجود ہے۔

ارژنگ: میں نے تفصیل کی نہیں محرک کی بات کی ہے؟

اسلم کولسری: اصل میں میں زندگی کو جس طرح بسر کرنا چاہتا تھا۔ ویسے نہیں کر پایا حالات بھی موافق نہیں تھے اور انتھک جدو جہد بھی نہ کر سکا۔ یوں کہیں:

سدا آنکھیں رہیں برسے ہوئے بادل کے ٹکڑے پر
اچانک راستے پر کوئی دریا بھی نہیں آیا

ارژنگ: دوحہ/قطر میں منعقد ہونے والی تقریبات کے روحِ رواں ملک مصیب آپ کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ ان تقریبات کے سلسلے میں آپ ان سے کس حد تک تعاون کرتے ہیں؟

اسلم کولسری: مجلس فروغ اُردو ادب کے بانی ملک مصیب الرحمٰن صاحب اور ان کے رفقاء بلاشبہ فروغ ادب کے سلسلے میں بے مثال خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر وہ کوئی چھوٹی موٹی خدمت میرے ذمے لگاتے ہیں تو اسے میں پورا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا زیادہ تر تعلق مجلّے کی ترتیب و تدوین سے ہوتا ہے۔

اعزاز احمد آذر

○ میں نہیں سمجھتا کہ شاعری میں خاص طور پر اُستادی شاگردی ہو سکتی ہے۔
○ شاعر اور ادیب کا معاشرے میں وہی کردار ہوتا ہے جو قدرت نے تفویض کر کے اُسے بھیجا ہے۔
○ ہمیں بے شمار نادان دوستوں کی نسبت محض گنتی کے کمٹڈ ساتھیوں کی ضرورت ہے۔

ارژنگ: شعروادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟
اعزاز احمد آذر: پتہ نہیں۔ قدرت نے یہ کوئی سزا دے کے ہی بھیجا تھا۔ مجھ پر اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب میں عرف عام میں شاعر بن چکا تھا۔
ارژنگ: شاعر ''بن چکے'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟
اعزاز احمد آذر: شعر کہنے کی جو صلاحیت ہے اس سے میری مراد یہ ہے کہ شعر تو میں کافی عرصہ سے کہتا چلا آ رہا تھا طبیعت ابتدا سے ہی موزوں تھی اور اسی دوران میں شاعری کی باریکیاں کافی حد تک سیکھ چکا تھا۔ جس کا احساس میرے شعر پڑھ کر لوگوں نے مجھے دلایا۔
ارژنگ: شاعری کی طرف خاص طور پر کیسے راغب ہوئے؟
اعزاز احمد آذر: یہ رجحان تو فطری طور پر تھا۔ ہمارے ایک سینئر دانشور مرحوم مشتاق بٹ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں دو قومیں ایسی ہیں جن میں کوئی بھی ماں جب کسی بچے کو جنم دیتی ہے تو

وہ شاعر ہی کو جنم دیتی ہے۔ ایک عرب ماں اور دوسری پنجابی ماں۔ اب یہ بعد کی بات ہے کہ کوئی اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتا ہے یا اس کی پرورش کرتا ہے لیکن پیدائشی طور پر اس میں رجحان موجود ہوتا ہے اور اب میں ایک طویل تجربے اور مشاہدے کے بعد ان کے اس نظریے کی تائید کرتا ہوں۔ رجحان تو ظاہر ہے یہ فطری تھا۔ اب رہی بات کہ کسی شاعر سے متاثر ہونے کا سوال تو میں ابتداء سے ہی شاعروں سے کم متاثر ہوا ہوں۔ میں جب متاثر ہوا شعر سے متاثر ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے اپنے سینئر اور اپنے ہم عصر شعراء کو ان کے کلام کو خاصا توجہ سے سنا اور پڑھا ہے۔ ان کے ساتھ نشست و برخاست کا جب سے موقع ملنا شروع ہوا ہے ان لمحات سے بھی پورا استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سو عین ممکن ہے کہ ان سب چیزوں نے مل کر میری فنی اور فکری تربیت میں اپنا رول ادا کیا ہو۔

ارژنگ: گویا آپ نے باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی؟

اعزاز احمد آذر: جی بالکل نہیں کی اور میں نہیں سمجھتا کہ شاعری میں خاص طور پر اُستادی شاگردی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک شاعر ہونے کی شرط اوّل خیال اور فکر کی دولت سے مالا مال ہونا ہے اور خیال تو قدرت کی عطا ہے۔ شاعری کا دوسرا حصہ کرافٹنگ ہے۔ شعر کی بنت کاری کہہ لیں اسے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو کسی بھی عمر میں کہیں سے بھی سیکھا جا سکتا ہے اور اس کے لیے شاعر ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارے نقاد حضرات ہوتے ہیں۔

ارژنگ: آپ نے شعر میں کرافٹنگ کا عمل کہاں سے سیکھا؟ اور اگر کسی نے نہیں سکھایا تو کیا آپ نے یہاں تک کا سفر اکیلے ہی طے کیا ہے؟

اعزاز احمد آذر: جی ہاں۔ ان معنوں میں، میں نے شاعری میں کسی کی خاص شاگردی نہیں کی۔ میرا استاد زمانہ، وقت اور حالات رہے ہیں اور اس سے پہلے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں دراصل مطالعے، مشاہدے اور اپنے سینئرز کے علاوہ اپنے ہم عصروں کی ہم نشینی اور ہم مجلسی کو بھی اس ضمن میں اپنا اُستاد سمجھتا ہوں کہ ان سب باتوں سے مجھے شعر فہمی اور فن شناسی کا موقع ملا۔

ارژنگ: اب تک آپ کے کتنے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟
اعزاز احمد آذر: میرے اب تک چار شعری مجموعے اور ایک کتاب بچوں کی نظمیں چھپ چکی ہے۔ دھیان کی سیڑھیاں، محبت مشغلہ تھی، موسم سی برساتاں دا، کب صبح ملن ہو گی اور تتلی پھول اور چاند۔ اس کے علاوہ چھٹا مجموعہ زیرِ طبع ہے ''تم ایسا کرنا''۔ اس کے علاوہ ایک انتخاب کیا تھا میر تقی میر سے اعزاز احمد آذر تک۔ کوئی دو سو پچیس شاعروں کی ساڑھے چار سو غزلیں۔
ارژنگ: یہ انتخاب میر سے اعزاز احمد آذر تک ہی کیوں رہا؟ کیا آپ کے بعد اور کوئی قابلِ ذکر شاعر نہیں ہے؟
اعزاز احمد آذر: میں نے یہ دانستہ کیا ہے ''اعزاز احمد آذر تک'' اس انتخاب میں میں نے سب سے آخر میں اپنی غزل رکھی ہے۔ یہ ایک میرا سوچا سمجھا اقدام تھا۔ دراصل میں اس انتخاب میں اپنے ہم عصروں اور اپنے سے جونیئر شعراء کو بھی جن کا کلام میں نے منتخب کیا ہے انہیں احترام دینا چاہتا تھا اور ان سب کا کلام پہلے نمبروں پر رکھا ہے۔
ارژنگ: آپ نے لفظ جونیئر کا انتخاب کیا ہے۔ شعر و ادب میں اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟
اعزاز احمد آذر: اس میں بنیادی بات ماہ و سال کی ہے۔ یہ فطرت کا ایک اصول ہے دُنیا میں بعد میں آنے والا شخص اپنے پہلے آنے والے کا جونیئر ہے۔ یہ وضاحت میں نے آپ کے سوال میں موجود مخصوص یعنی سینئر جونیئر کی بنیاد پر کی ہے۔ اچھے بُرے کی نہیں جبکہ مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کا حوالہ معیارِ کلام بھی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ماہ و سال کے حوالے سے جونیئر اور سینئر ہونے کو ملحوظ رکھنا ضروری بھی ہے اور مناسب بھی۔
ارژنگ: آپ کالم نگاری بھی کرتے ہیں لیکن آپ کو بطور کالم نگار وہ شہرت نہ مل سکی جو آپ کی شاعری کے حصے میں آئی؟
اعزاز احمد آذر: اصل میں کالم نگاری کو نہ تو پیشہ ورانہ طور پر اختیار کیا اور نہ میں نے اپنے آپ کو ہمہ وقت کالم نگار کے طور پر اسٹیبلش کیا ہے۔ یہ دراصل اُفتادِ طبع کی بات ہے کہ زندگی میں سماج میں اور ہمارے اردگرد کے عمومی ماحول میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں

جو اپنی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور ان پر ذہنی اور فکری سطح پر رد عمل پیدا ہوتا ہے۔

ارژنگ: آپ کی نظر میں ہمارے ہاں پیشہ ور کالم نگار کون سے ہیں؟

اعزاز احمد آذر: ایک طویل فہرست ہے اور ممکن ہے کہ نام لکھے جائیں تو بہت سے نام فوری طور پر ذہن میں نہ بھی آئیں اور یہ بھی ہے کہ معاشرے کے مختلف طبقے کے لوگ مختلف طرح کے اخبارات اور کالم نگاروں کے قارئین ہوتے ہیں جو ضروری نہیں کہ سب کالم نگاروں سے واقف ہوں لیکن اگر چیدہ چیدہ برسبیل تذکرہ نام لیا جائے تو ان میں ارشاد احمد حقانی، نذیر ناجی، عبدالقادر حسن، عطاء الحق قاسمی، حسن نثار، منو بھائی، خالد حسن، ارشاد عارف، عباس اطہر، ظفر اقبال وغیرہ وغیرہ۔

ارژنگ: آپ بیک وقت شاعر، کالم نگار اور ڈرامہ نگار ہیں۔ اگر آپ کو ان تینوں شعبوں میں اپنے پسندیدہ ایک ایک بندے کا نام لینے کو کہا جائے؟

اعزاز احمد آذر: کالم نگار منو بھائی، شاعر احمد فراز اور ڈرامہ نگار بھی منو بھائی ہی ٹھیک ہیں۔

ارژنگ: کسی بھی شاعر اور ادیب کا معاشرے میں کیا کردار ہونا چاہیے؟

اعزاز احمد آذر: شاعر اور ادیب کا معاشرے میں وہی کردار ہوتا ہے جو قدرت نے اسے تفویض کر کے دنیا میں بھیجا ہے اور اس کردار کی یا اس مطلوبہ کردار کی نشاندہی اس کی فکر اور اس کا کلام کرتا ہے۔ شاعر کسی بھی زمانے کا ہے اور کسی بھی زبان کا زندگی معاشرے اور عموماً انسانی ماحول میں وہ جس خوبصورتی، خیر بھلائی کا، جمالیات کی علامت ہے اور یہی سب کچھ یا اس سب کچھ کا اگر اس کے عملی کردار میں بھی اپنی جھلک دے تو آپ کے سوال کا جواب مجسم صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ کے ہاں غم روزگار کی نسبت غم جاناں کی کیفیات نمایاں ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

اعزاز احمد آذر: یہ محض اتفاق ہے کہ آپ کی نظر سے زیادہ ایسا کلام گزرا ہے لیکن اگر یوں بھی ہو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ جو میرے بارے میں اے بی اشرف نے لکھا ہے کہ میں محبت کا شاعر ہوں تو میں واقعی محبت کا شاعر کہلانا پسند کرتا ہوں لیکن یہ محبت ہمہ جہت محبت ہے۔

ارژنگ: پنجابی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لیے کس حد تک سوچتے ہیں؟

اعزاز احمد آذر: میں بنیادی طور پر پنجابی ہوں اور میری فنی اور فکری پرورش میں پنجاب کی ثقافت اور پنجابی زبان نے ایک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ میں اصولی طور پر بات کا قائل ہوں کہ پنجاب میں نہ صرف پنجابی زبان کو بلکہ پاکستان کے تمام باقی خطوں میں باقی زبانوں کو سرکاری غیر سرکاری اور عمومی سطح پر وہ حیثیت حاصل ہو جو ان کا حق ہے اور یہی ساری ثقافتیں پاکستان کی مجموعی ثقافت کو ''رچ'' بنانے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں یہاں یہ وضاحت ضرور کر دوں کہ عالمی پنجابی کانگریس کے حوالے سے اب نہیں بلکہ اعزاز احمد آذر 1968ء اور 1969ء سے مرحوم مشتاق بٹ کے فورم دیس پنجاب محاذ سے پنجابی زبان زبان ادب اور ثقافت کا کارکن ہے۔

ارژنگ: آپ نے پنجابی زبان وادب کے لیے اب تک جو جدوجہد کی اس کا کوئی نتیجہ نکلا؟

اعزاز احمد آذر: بہت زیادہ تفصیل میں جائے بغیر جس کا میں تذکرہ اپنے بہت سے مضامین، کالموں اور مختلف تقریبات میں کر چکا ہوں محض یہ بات کافی ہے۔ میں جس جدوجہد کرنے والے قافلے کا رُکن ہوں یہ دراصل اسی کی تگ ودو کا حاصل ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے پنجابی ایم اے کی کلاسز کا اجراء کر دیا ہے اور ریڈیو پر پنجابی میں خبریں اور دوسرے پروگرام نشر ہونے لگے اور ان میں کافی حد تک اضافہ بھی ہوا ہے۔

ارژنگ: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پنجابی زبان وادب کے فروغ کے لیے عالمی پنجابی کانگریس صحیح سمت سفر کر رہی ہے؟

اعزاز احمد آذر: یہ ایک ایسی بات ہے جس پہ متضاد آراء دی گئی ہیں اور میں اصولی طور پر سمجھتا ہوں کہ عالمی پنجابی کانگریس کے چیئر مین فخر زمان کو چاہیے کہ بہت بنیادی اور مختصر ایجنڈے کو اپنے منشور کی بنیاد بنائیں اور بہت واضح دوٹوک اور قطعی قسم کی سوچ رکھنے والے افراد کو اپنا ہم سفر بنائیں لیکن محض عددی گنتی بڑھانے کے خیال میں ان لوگوں کو اپنا رفیق نہ سمجھیں جو محض نام ونامود اور دیگر مفاد کی خاطر ہر قافلے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ہمیں بے شمار نادان دوستوں کی نسبت محض گنتی کے چند کمٹڈ ساتھیوں کی ضرورت ہے۔

اعجاز رضوی

○ ہر شخص دوسرے کو شرمندہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔

○ باقاعدہ اُستادی شاگردی کا زمانہ گزر چکا ہے۔

○ مشاعرہ شاعر کے قد میں نہیں اکاؤنٹ میں اضافہ کرتا ہے۔

ارژنگ: اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟

اعجاز رضوی: میں ۶ نومبر ۱۹۵۹ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ لاہور کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی گورنمنٹ ایم۔اے۔او کالج میں اور اقراء میگزین کا ایڈیٹر رہا، ایم۔اے او کالج میں ہی عطاء الحق قاسمی صاحب، امجد اسلام امجد صاحب، تحسین فراقی عارف عبدالمتین صاحب، حفیظ صدیقی اور محمد نواز خان صاحب سے محبت کا رشتہ قائم ہوا۔

ارژنگ: شاعری کی ابتداء کیسے ہوئی

اعجاز رضوی: شاعری کی ابتداء فورتھ ایئر کی کلاس کے لیے الوداعی نظم لکھ کر کی اس زمانے میں آفتاب حسین اختر مجوکہ، ضیاء الحسن، امجد طفیل بھی ایم اے۔او کالج میں زیر تعلیم تھے۔

ارژنگ: خاندان میں اور بھی کوئی شاعر ہے؟

اعجاز رضوی: خاندان میں ہر شخص شاعر ہے۔ کیونکہ سب ہی وزن میں لکھتے ہیں۔ ویسے والد صاحب کے علاوہ مرے چچا سلمان رضوی بہت ہی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور میرے استاد بھی ہیں۔

ارژنگ: آپ صرف نظم لکھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

اعجاز رضوی: میں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور اب تو نثری نظمیں بھی لکھ رہا ہوں ویسے نظم لکھنے کی کوئی خاص وجہ ہے نہ ہی مجبوری، بس موڈ کی بات ہے شاید میں نظم میں بہتر طور پر بات کہہ سکتا ہوں۔

ارژنگ: سنا ہے آپ اختر حسین جعفری مرحوم کو نظم کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں؟

اعجاز رضوی: کسی کو سب سے بڑا شاعر ماننے کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی سب سے چھوٹا بھی ہو گا ابرار صاحب اختر حسین جعفری، نظم کے بہت ہی خوبصورت شاعر ہیں بلکہ وہ راشد اور مجید امجد کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ نظم کا سفر ابھی بہت مختصر ہے، مگر اس سفر میں اختر حسین جعفری راہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ارژنگ: آپ نے احمد ندیم قاسمی صاحب اور فیض صاحب کا نام نہیں لیا؟

اعجاز رضوی: فیض صاحب کا مقام و مرتبہ تو غزل کی وجہ سے ہے اور فیض صاحب کے لیے بالکل ضروری نہیں کہ ان کو ہر خانے میں فٹ کیا جائے، فیض صاحب بڑے شاعر ہیں اور ندیم صاحب بڑے شاعر اور افسانہ نگار۔

ارژنگ: قاسمی صاحب نے فیض احمد فیض کے بارے میں رسالہ ''معاصر'' میں ایک مضمون لکھا ہے آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

اعجاز رضوی: قاسمی صاحب اور فیض صاحب ایک تحریک اور ایک نظریئے اور ایک ہی وقت کے شاعر ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ فیض احمد فیض کے رابطے قاسمی صاحب سے زیادہ تھے۔ باقی رہی شراب یا گورنر سے دوستی، یا وڈیرے سے یاری تو ان چیزوں سے فیض صاحب کی شاعری کو کوئی فرق نہیں پڑتا، ندیم صاحب کی ہر بات سچی ہے، مگر یہ بات کرنے کے لیے وقت غلط چنا گیا۔ یہ باتیں فیض صاحب کی زندگی میں کرتے تو بہت ہی اچھا ہوتا، اس طرح چند نئی باتیں سامنے آتیں اب تو صرف مخالفت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آیا اور پھر ایسے مضمون کی حفاظت اور حمایت کرنے کے لیے جن لوگوں کی ندیم صاحب کو ضرورت تھی۔ وہ افرادی قوت ندیم صاحب کے پاس نہیں رہی، ویسے اس طرح کے مضمون سامنے آنے چاہئیں تا کہ صرف شاعری نہیں شخصیت بھی سامنے آئے۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندی سے کیا مراد ہے؟

اعجاز رضوی: ادبی گروہ بندی کی بات ہی بیکار ہے کیونکہ یہاں ادبی گروہ بندی نہیں ہے یہاں تو مطلب پرستی یا مفادی گروہ بندی ہے۔ کاش ادبی گروہ بندی ہو اور کچھ نئے مسائل، نئی نظمیں یا ادب سامنے آئے۔

ارژنگ: آپ تو یہ بات نہ کریں کیونکہ آپ خود احمد ندیم قاسمی کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں؟

اعجاز رضوی: احمد ندیم قاسمی صاحب اردو ادب کی واحد شخصیت ہیں جن کے مشہور و معروف گروہ کا روئے زمین پر کہیں وجود نہیں، یہ گروہ سینہ بہ سینہ چل رہا ہے اور اس کی ہر خبر سدید سنٹر اقبال ٹاؤن سے نکلتی ہے اور اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں دفن ہو جاتی ہے۔ اس گروہ کا کوئی ٹھکانہ ہے نہ آشیانہ۔۔

ارژنگ: سننے میں آیا ہے کہ احمد ندیم قاسمی سے آپ کا کچھ اختلاف ہے؟

اعجاز رضوی: جناب عالی اختلاف تو برابر کے لوگوں میں ہوتا ہے میرا اور ندیم صاحب کا اختلاف۔ عجیب سی بات ہے کہاں ندیم صاحب جیسا بلند شاعر، ادیب، دانشور اور کہاں میں وہ تو میرے لیے سرپرست کا درجہ رکھتے ہیں۔

ارژنگ: آپ نے رسالہ فنون میں کام کیا یہ تجربہ کیسا رہا؟

اعجاز رضوی: میرا یہ تجربہ بہت ہی خوشگوار رہا، اس تمام عرصہ میں مجھے ندیم صاحب کی جو قربت اور محبت میسر آئی، وہ میری زندگی کا خوبصورت اور اہم حصہ ہے، ندیم صاحب میرے استاد، محسن اور بہت ہی شفیق بزرگ ہیں۔

ارژنگ: ادبی پرچوں کی حالت کیسے بہتر بنائی جا سکتی ہے؟

اعجاز رضوی: بہت سے ادبی پرچوں کی حالت تو اس کے مدیر ہی بہتر بنا سکتے ہیں، ہاں کچھ ادبی پرچوں کو مالی امداد دے کر بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ امداد ان پرچوں کا حق ہے، یہ امداد اشتہارات کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے۔۔ خریداری کی صورت میں بھی۔

ارژنگ: آپ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری رہے یہ تجربہ کیسا رہا؟

اعجاز رضوی: حلقہ ارباب ذوق سے تعلق کا عرصہ بہت زیادہ ہے سیکرٹری یا جوائنٹ سیکرٹری

تو کچھ عرصے کے لیے بنا، حلقہ ارباب ذوق ہی نہیں کسی بھی ادبی تنظیم کے کسی بھی عہدے پر کام کرنا بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ ہر شخص دوسرے کو شرمندہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے اور میں کسی کی فرمائش پر کسی کو شرمندہ، ذلیل یا پریشان نہیں کر سکتا تھا۔۔۔اس لیے کچھ پریشان رہا ،مگر اس تمام عرصہ میں دوستوں کا تعاون اور سینئر احباب کی محبت نے بہت سہارا دیا۔۔۔سو میں اس کو بھی اچھا تجربہ ہی کہہ سکتا ہوں مگر کہیں کہیں مشکلات کا سامنا رہا۔

ارژنگ: آپ شاعری میں کس سے اصلاح لیتے ہیں؟

اعجاز رضوی: ابتداء میں اپنے چچا سلمان رضوی کو نظمیں دکھاتا تھا۔ پھر خالد احمد، اشرف جاوید، عباس تابش سے مشورہ کرتا رہا، یوں ندیم صاحب کی اصلاح اور مشورہ حرف آخر ہے ،ویسے باقاعدہ استادی شاگردی کا زمانہ گزر چکا ہے۔

ارژنگ: نثری نظم کے بارے میں کیا خیال ہے؟

اعجاز رضوی: نثری نظم پوری دنیا میں لکھی جا رہی ہے، اس لیے اس کو رد نہیں کیا جا سکتا مگر شاعری کی ابتدا ہی بے وزن شاعری سے کرنا اور ان کو نثری نظم کہنا سراسر غلط ہے غزل اور نظم میں کچھ لکھنے کے بعد اگر نثری نظم لکھی جائے تو کوئی حرج نہیں۔

ارژنگ: آپ کی گفتگو بہت پُر مزاح ہوتی ہے، مگر نظمیں بہت سنجیدہ ہوتی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

اعجاز رضوی: عام گفتگو اور نظم لکھنے میں بہت فرق ہے، گفتگو وقت گزاری ہے اور نظم لکھنا ایک سنجیدہ کام ہے۔اس لیے اس میں سنجیدگی کا ہونا ضروری ہے۔

ارژنگ: آپ شاعری کرتے ہیں، مزاح لکھتے ہیں اور اب ڈرامہ بھی لکھ رہے ہیں، سب کچھ کیسے کرتے ہیں؟

اعجاز رضوی: پہلی بات تو یہ کہ میں ٹیلی ویژن کے لیے اب سے پہلے صبح کی نشریات میں بھی چلتے چلتے کے عنوان سے ڈرامے لکھ چکا ہوں اور اب پھر لکھ رہا ہوں۔ لیکن بات وہی ہے کہ شاعری اپنے لیے، مزاح دوستوں کے لیے اور ڈرامہ پیسوں کے لیے لکھتا ہوں اور یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا ہے یہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا، بس اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ ہمت دیتا ہے۔

ارژنگ: مشاعرہ کسی شاعر کے قد میں کس قدر اضافہ کرسکتا ہے؟

اعجاز رضوی: مشاعرہ شاعر کے قد میں نہیں اکاؤنٹ میں اضافہ کرتا ہے، شاعر کا قد صرف اس کے کام سے ہوتا ہے اور وہ بھی ٹوٹل کام ایک غزل سے ایک لاکھ کمایا جا سکتا ہے مگر قد میں ایک انچ کا اضافہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ارژنگ: آپ مشاعروں میں کم جاتے ہیں کیا وجہ ہے؟

اعجاز رضوی: مشاعرہ میں جانے کا مالی فائدہ مجھے بھی اچھا لگتا ہے، مگر مجھے دعوت ہی کم ملتی ہے، دعوت وصول کرنے کا ہنر مجھے نہیں آتا۔

ارژنگ: آپ کے بہت سے کالم ادب کے دائرے سے باہر نظر آتے ہیں، آپ کیا کہتے ہیں؟

اعجاز رضوی: میں نے کچھ ردعمل کے کالم ضرور لکھے ہیں شاید آپ کا اشارہ اس طرف ہے ویسے میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جو ادب کے دائرے سے باہر ہو۔

ارژنگ: عدیم ہاشمی، ظفر اقبال، اجمل نیازی اور منیر نیازی سے آپ کی کیا دشمنی ہے؟

اعجاز رضوی: عدیم ہاشمی، ظفر اقبال، اجمل نیازی یا منیر نیازی سے میری کوئی دشمنی نہیں بلکہ میری اس پوری کائنات میں کسی سے بھی کوئی دشمنی نہیں ہاں اختلاف ضرور ہے اور وہ بھی اتنا اختلاف کہ جو بات آپ دوسروں کے لیے کہتے ہیں وہ اپنے لیے بھی پسند کریں۔ یہ عجیب دانشوری ہے کہ آپ اپنے انداز تحریر، اپنی زبان، اپنی حرکات سے دوسروں کو پریشان کریں اور پھر فخر کریں کوئی ہمارا جواب نہیں دے سکتا بس اتنی سی بات ہے کوئی بھی شخص میرے کسی پیارے کو چھیڑ کر یہ سمجھے کہ اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ میں کسی بھی اختلافی بات کا جواب بہت تفصیل سے اور بہت بے خوفی سے دے سکتا ہوں، یہ میری خوبی ہے یا خامی اس کا فیصلہ دوست ہی کرسکتے ہیں؟

ارژنگ: آپ خاکہ لکھتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟

اعجاز رضوی: خاکہ ہو یا کوئی اور چیز اگر اخلاق سے گری ہوئی ہے تو وہ بڑی نہیں ہوسکتی ہاں خاکہ لکھتے ہوئے میں یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اس شخصیت کے بیڈ روم سے دور رہوں۔ اور صرف اتنا ہی پینٹ کروں جتنا وہ نظر آتا ہے یا نظر آسکتا ہے، فرضی خاکہ نگاری۔۔ فحش نگاری

ہے، اس میں خاکہ والی کوئی بات ہے نہ ہی اخلاقیات۔
ارژنگ: آپ کے پہلے مجموعہ ''سفر واجب ہوا'' اور دوسرے مجموعہ ''بہت سے دکھ ہیں'' میں بہت واضح فرق ہے۔۔۔اس کی کیا وجہ ہے؟
اعجاز رضوی: کسی شاعری کی کتابوں میں فرق ہونا تو اچھی علامت ہے، ایک ہی طرح لکھتے جانا کوئی اچھی بات نہیں۔۔۔پہلی کتاب ہو یا دوسری یا اور کوئی آنے والی، میں نے با قاعدہ بیٹھ کر شعوری کوشش سے کبھی کام نہیں کیا۔بس آہستہ آہستہ کتاب تیار ہو جاتی ہے۔
ارژنگ: آپ کیا چیز شوق سے پڑھتے ہیں؟
اعجاز رضوی: پڑھنے کے معاملے میں بڑا بدنیت ہوں ہر چیز پڑھنے کو دل کرتا ہے مگر آٹو بائیو گرافی، اور ناول شوق سے پڑھتا ہوں۔
ارژنگ: اردو میں ناول بہت کم لکھا گیا۔اس کی کیا وجہ ہے؟
اعجاز رضوی: ناول بہت فرصت میں لکھا جاتا ہے اور آج کل کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ ناول لکھے۔اب ناول پر ٹائم برباد کرنے سے بہتر ہے ڈرامہ لکھا جائے۔۔۔اور پیسے کمائے جائیں، ویسے پاکستان میں بہت ہی بڑے ناول موجود ہیں، پاکستان کے حوالے سے انتظار حسین، انیس ناگی، عقیل روبی، مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، عبداللہ حسین کے ناول قابل قدر ہیں۔
ارژنگ: کمپیوٹر دور میں کتاب کس طرح زندہ رہ سکتی ہے؟
اعجاز رضوی: سائنس کتنی بھی ترقی کر جائے کتاب زندہ رہے گی، کیونکہ پڑھنے کا ایک اپنا مزہ ہے؟
ارژنگ: آپ کسی ادارے کے لیے اردو ویب سائٹ بنا رہے ہیں، وہ کیا کام کر رہے ہے؟
اعجاز رضوی: اردو ادبی ویب سائٹ دنیا کی بہت بڑی ویب سائٹ ہے، اس میں میر تقی میر سے لے کر آج تک کے لوگ شامل ہیں یہ ایک بڑا کام ہے اور بہت محنت طلب بھی یہ کام میٹا کرافٹ کیلیفورنیا کالج کے چیئرمین نثار احمد شیخ کی سرپرستی میں بہت تیزی سے مکمل ہو رہا ہے۔میرے لیے فخر کی بات ہے کہ میں ادیبوں، شاعروں کا نمائندہ بن کر ان کے ساتھ اس

کام میں شامل ہوں، یہ ویب سائٹ بہت جلد آن لائن ہو جائے گی اور پاکستانی ادیبوں، شاعروں کے لیے باعث فخر ہو گی۔۔

ارژنگ: آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہے؟

اعجاز رضوی: میں آج کل بچوں کا پروگرام سیر داستاں لکھ رہا ہوں، جو اگلی سہ ماہی میں پاکستانی ٹیلی ویژن سے نشر ہو گا، دوسری بڑی مصروفیت ویب سائیٹ ہے جس کے لیے مجھے بہت پڑھنا پڑھتا ہے۔۔۔اور ساتھ ساتھ اپنی لکھائی پڑھائی بھی جاری ہے۔

ارژنگ۔ آپ کی آنے والی کتابیں کون سی ہیں؟

اعجاز رضوی: میری آنے والی کتابوں میں ''یہ مجھ سے کون بچھڑا ہے'' شاعری اور بندہ بشر خاکہ اور ایک کتاب خوف اور اداسی کی نظمیں، انگلش ترجمے کے ساتھ آ رہی ہے، اس کتاب میں صرف ایٹمی موضوع پر نظمیں ہیں۔

اظہر غوری

○ ہمیں ایسے سماجی نظام کی ضرورت ہے جس میں رشتے لالچ سے ناواقف ہوں۔
○ میں غالب اور حالی کو قابل تقلید نظریات کا حامل سمجھتا ہوں۔
○ ہمارے معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس، اعصابی دباؤ اور ازدواجی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ جاری ہے۔

ارژنگ: کچھ اپنے بارے میں بتایئے؟

اظہر غوری: ذاتی زندگی میرے تئیں قابل ذکر نہیں ہے۔ میرے لیے صرف تخلیقی زندگی اور غیر تخلیقی دنیا ہی اہمیت رکھتی ہے۔ میں روزگار کی خاطر گذشتہ بیس برس سے پرنٹ میڈیا کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اس عرصہ میں مجھے شعوری اور لاشعوری طور پر مختلف کامیاب اور ناکام تجربات کرنے کے مواقع میسر آئے جن سے میں نے بھرپور استفادہ کیا اور غیر مشروط محبت شائع کی۔

ارژنگ: ''غیر مشروط محبت'' ہر ادبی حلقے میں موضوع بحث ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

اظہر غوری: اس کی کئی وجوہ ہیں، پہلی یہ کہ ہمارا معاشرہ سنجیدہ عمل سے کٹ چکا ہے اور موضوع کو معروض سے ہم آہنگ بنانے پر محنت کرنے کا وقت کسی کے پاس نہیں۔ دوسری یہ کہ ناقدین نے اسے نو جدلیات فلسفے اور عائلی نفسیات کی کتاب یا ناول اور سائنسی و معاشرتی علوم کی کتاب بھی قرار دیا۔ حال آں کہ میرا مقصد ایسا نہ تھا اور نہ ہی یہ میری تمام شاعری کا مجموعہ ہے۔ غیر مشروط محبت اس میں میری صرف ۲۳۲ نظمیں شامل ہیں، جو میں

نے انسانی تعلق اور عدم مطابقت کے مسئلے کو محسوس کرتے ہوئے تخلیق کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ایسے سماجی نظام کی ضرورت ہے، جس میں رشتے لالچ سے ناواقف ہوں، دوستیاں حسد سے لاتعلق ہوں اور محبت مفادات سے ناآشنا ہو۔ مرد اور عورت کے مستحکم تعلق کے لیے صرف لفظ محبت ناکافی ہے، چوں کہ مشروط محبت بھی تو محبت ہی کہلاتی ہے۔

ارژنگ: اس ضمن میں آپ کا نظریہ کیا ہے؟

اظہر غوری: میں سمجھتا ہوں کہ غیر مشروط محبت کے نظریے سے معاشرے میں عدم توازن کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ دراصل عورت اور مرد کے درمیان غیر مشروط تعلق کے قیام اور باطنی آسودگی کا ضامن ماحول مہیا کیے بغیر عالمی امن کا تصور ناممکن ہے۔

ارژنگ: ہمارے معاشرتی رویوں کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

اظہر غوری: ہمارے معاشرے میں عدم تحفظ کا احساس بے رحم اعصابی دباؤ، کھچاؤ، مایوسی اور ازدواجی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ جاری ہے۔ افراد فیکٹری، دکان یا دفتر سے باہر نکلیں تو بھی ان کی زندگی شروع نہیں ہوتی، پریشانیاں اور مشکلات انہیں نارمل ہونے ہی نہیں دیتیں۔ ان کی ساری زندگی کی محنت رضا کارانہ نہیں، بلکہ جبری ہے۔ ہر شعبے میں منڈی اور کارزار کے قوانین نافذ ہیں۔ معیار زندگی کی چکا چوند، سٹے بازی، جوئے لالچ اور بدعنوانی سے کمائی ہوئی دولت کے انباروں کو کروڑوں بے روزگار چھو بھی نہیں سکتے۔

معاشرے میں بیش تر پولیس، فوجی افسر، بیوروکریٹس، سیاست دان، صحافی، سرکاری اہلکار اور کاروباری لوگ انتہائی پیمانے پر لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ لالچ ہر چیز و ناچیز کے غالب اصولوں کی مسند پر فائز ہے، بلکہ ہماری ثقافت اور تہذیب کا مرکز ہے۔ یہ ایسا سماج ہے، جہاں مقتدر صرف اپنے حق میں مرتبے، طاقت اور دولت کی صورت حال کو اطمینان بخش سمجھتے ہیں۔ اس مہذب معاشرے میں اکثر زن و مرد ضمیر فروش اور نظریہ فروش ہیں۔ یہاں کے ترقیاتی عمل کے ردعمل میں انسانوں سمیت ہر شے قابل فروخت پانے کے لیے سرگرداں ہے۔

ارژنگ: ''غیر مشروط محبت'' کی شاعری کا اس معاشرتی تناظر میں کیا کردار ہے؟

اظہر غوری: میرے لیے غیر مشروط محبت زندگی کا روز مرہ ہے، جب کہ اس معاشرے میں برائے فروخت شے بننے سے بچ رہنے والے افراد کے لیے ایک آئیڈیل ہے۔ مفاد پرستانہ تعلق سازی نے غیر مشروط محبت کو زندگی سے دور کسی کالے پانی میں قید کر رکھا ہے۔ جیسے ایک نا قابل حصول خواب ایک کہانی جو حقیقت سے اتنی دور ہے جتنی زندگی سے بعید ترین کہکشاں، ظاہر ہے کہ وحشیانہ حالات سے وحشیانہ رویوں نے ہی جنم لینا ہے۔ اس اندوہ ناک صورت حال میں میری شاعری زن و مرد کو حقیقی انسانیت کے ساتھ وقار اور عزت نفس کا احساس دلانے کے لیے کوشاں ہے۔ میں لوگوں کو ہر قسم کی فنکارانہ خوبی اور انسانی گرم جوشی کا تحفہ دینا چاہتا ہوں، جو تمام زن و مرد کو غیر مشروط محبت کے ذریعے مل چکا ہے۔

ارژنگ: حلقہ تصنیف ادب میں ایک خاتون نے کہا تھا کہ مردوں اور عورتوں کی خامیوں کا ذکر آپ نے معاشرتی اصلاح کے لیے نہیں کیا بلکہ آپ نے عورتوں کی مادر پدر آزادی کی تحریک کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کیا جواب دیں گے؟

اظہر غوری: اس اعتراض کا جواب دینا میرے بجائے ادب کے ناقدین کا منصب ہے۔ تا ہم میں اتنا کہوں گا کہ سب سے پہلے ماڈل ٹاؤن کی ایک لائبریرین شاعرہ نے اخلاق باختہ ہو کر میرے خلاف نعرے بازی کے ذریعے سستی شہرت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی، لیکن اسے یہ پتہ نہیں تھا کہ مہنگائی کے اس دور میں شہرت اتنی بھی سستی نہیں۔ وہ میرے خلاف گروہ بندی کے لیے در در پر جا کر منہ کی کھاتی اور ذلیل ہوتی رہی بہت سے ادیب مجھے اس کے ماضی کے گندے قصے سنا کر میری تالیف قلبی کرتے، لیکن میں ایسی چھچھوری حرکات کا نوٹس لینا گوارا نہیں کرتا اور جہاں تک روبیہ کا تعلق ہے وہ اردو ادب کے بجائے انگریزی صحافت کے متعلق ہے۔ اس کا تعلق ادب کے بجائے کچھ مخصوص عادات کے حامل ادیبوں سے ہے ایک ادیب کے بقول وہ کسی شادی دفتر کا رخ کرتی ہے، مگر اس کے قدم چوپال کی جانب کھینچے چلے جاتے ہیں۔ اسے عالمی ادب یا اردو شاعری کی تنقید، تاریخ اور ارتقاء سے کوئی واقفیت نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو اس نے انگریزی ادب اور تنقیدی

اصول بھی پڑھے یا سنے تک نہیں۔ اگر وہ گمراہ اور بے راہ رو یورپی عورتوں جیسی آزادی چاہتی ہے تو غیر مشروط محبت اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ میرا کام مردوں یا عورتوں کی غیر فطری آزادیوں کی تحریک کی مخالفت کرنا نہیں بلکہ اپنے تخلیقی عمل سے وابستہ رہنا ہی ہے۔

ارژ نگ: کیا آپ نے واقعی شہناز مزمل اور روبیہ جیلانی کے خلاف نظمیں لکھی ہیں؟

اظہر غوری: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مذکورہ خواتین کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا تک نہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ نہ معلوم کس کے بہکاوے میں آ کر خوش فہمی کا شکار ہو گئیں۔ اگر میں اس قبیل کے زن و مرد کو موضوع بناتا تو غیر مشروط محبت شاعری کے سنجیدہ مجموعوں میں شمار نہ ہوتی۔

ارژ نگ: تو پھر کیا آپ نے ''غیر مشروط محبت'' میں عورتوں کی مخالفت کی ہے؟

اظہر غوری: دیکھئے جب ہم کوئی ناول، شاعری یا نفسیات، فلسفے کی کتاب پڑھتے ہیں اور کوئی ڈراما یا فلم دیکھتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم اس میں شامل اچھے یا برے کرداروں کی تشریح کو اپنی ذات پر منطبق کر لیں، یا ولن کے کردار کی تشریح یوں کریں کہ سبھی مرد ایسے ہوتے ہیں، یا پھر ویمپ کے کردار کی توجیہ اس طرح کریں کہ سبھی خواتین ایسی ہوتی ہیں۔ جہاں تک پراپیگنڈا کا تعلق ہے، بہت سے ایسے بدقسمت گزرے ہیں جنہوں نے آسمانی کتابوں کے بارے میں ہرزہ سرائی کی اور خود ہی ملعون و مطعون کہلائے۔ اپنی طرف سے تو اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ میں مردوں کی نسبت عورتوں کا زیادہ حمایتی، حلیف اور احترام کرنے والا انسان بنا رہنا چاہتا ہوں۔ دراصل ''غیر مشروط محبت'' سلسلہ وار نظموں کا ایسا مجموعہ ہے، جس میں زن و مرد کو مثبت اشتراک عمل کا احساس دلانے والی کہانیوں کی کہانی تخلیق ہوئی ہے۔ اگر کوئی عطائی نقاد اس کے مجموعی تاثر سے ہٹ کر کسی نظم یا کسی سطر پر اعتراض کرے، تو دوسروں کو گمراہ کرنے کے بجائے وہ خود ہی گمراہ ہو جائے گا۔ سیاق و سباق کے بغیر تخلیقی ادب کا جائزہ لینا یا تخمینہ لگانا ممکن نہیں ہے۔

ارژ نگ: کیا ''غیر مشروط محبت'' کی مقبولیت کے ردعمل میں آپ کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے؟

اظہر غوری: دراصل تمام انسان کبھی ہم خیال نہیں ہو سکتے، اس دنیا میں کوئی بھی نظریہ اور فلسفہ

متفق علیہ نہیں ہوسکتا۔ کسی نظریے سے اختلاف کرنا ہر باشعور فرد کا حق ہے، لیکن اختلاف کے لیے ادب کے تنقیدی اصولوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ ایک ادبی حلقے میں روبیہ جیلانی کی طرح اختلاف برائے اختلاف ایسا ہی ہے، جیسے فلمی حلقوں میں پہلے سے موجود ہیروئنز اپنے بدکار مافیا کے ذریعے کسی نئی ہیروئین کا من گھڑت سکینڈل بنوا دیتی ہیں، لیکن اس کے برعکس خود منافقت سے اسے خوش آمدید کہہ رہی ہوتی ہیں۔ لیکن روبیہ جیلانی کی پبلک ریلیشنگ بہت وسیع ہے، اس سے خصوصی تعلقات رکھنے والے ادیب چاہتے ہیں کہ میں جواباً کچھ نہ کہوں، وہ کہتے ہیں کہ بے چاری روبیہ اپنی ناسمجھی کی ماری ہوئی ایک دکھی عورت ہے۔ وہ اپنے سابق عائلی حالات اور جنونی حرکات کے باعث شیزوفرینیا کی ذہنی مریضہ بن چکی ہے۔ مزید برآں زمانے کی ستم ظریفی نے اسے منفی طور پر ہذیانی بنا دیا ہے۔ چوں کہ ''غیر مشروط محبت'' کی مقبولیت سے ایک ادبی مافیا کے نمائندہ مصنوعی شاعروں کو اپنی کمرشل مارکیٹ متاثر ہونے کا خدشہ لاحق ہے، اس لیے انہوں روبیہ جیلانی کو تخریب کاری کے لیے ہائر کیا، لیکن وہ غیر تربیت یافتہ کمانڈو ہے، اس لیے پہلی واردات میں ہی پکڑی گئی اور کسی بھی ذہنی، جسمانی ریمانڈ یا تفتیش کے بغیر اعتراف کر لیا کہ اس نے تو ابھی خود ''غیر مشروط محبت'' کا مطالعہ بھی نہیں کیا اور کچھ نام نہاد مقبول عام ادیبوں کا بہکاوے میں آ کر غل غپاڑہ کیا۔ مجھے اس افسوس ناک واقعہ کا قطعاً قلق نہیں، کیوں کہ میں بخوبی جانتا ہوں، ہمارے معاشرے میں اکثر افراد اتنی الجھنوں کا شکار ہیں کہ کوئی بھی لالچ دے کر، کرایے پر لے کر یا بے وقوف بنا کر انہیں استعمال کر سکتا ہے۔

ارژنگ: آپ کے مخالف ادبی مافیا میں اور کون کون شامل ہے؟

اظہر غوری: روبیہ نے دیگر جن لوگوں کو اپنا پشت پناہ یا فریق بنایا، وہ سبھی اس امر کی تردید کر چکے ہیں، لہٰذا اس کی ایف آئی آر خارج ہو چکی ہے، نیز وہ اردو ادب، میں اتنی بھی حیثیت نہیں رکھتی کہ اسے کوئی مستقل موضوع بنا لیا جائے۔ میں کوئی اتنی بڑی شخصیت نہیں کہ وہ میری شاعری کو ایشو بنا کر یا کوئی گھٹیا اعتراض کر کے شہرت حاصل کر سکے، وہ میرے لیے کسی اجنبی فرد یا رشتے میں باجی جیسی ہے۔ اگر وہ صائمہ وحید روپڑی جتنی بھی سمجھدار ہوتی تو بر

وقت شہرت حاصل کر سکتی تھی، لیکن افسوس کہ وہ بہت سا وقت ضائع کر چکی ہے۔ ادبی حلقوں میں آنے والے اس کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے، میں گزشتہ بارہ برس تک ادبی لوگوں، محفلوں اور حلقوں سے الگ تھلگ رہا ہوں، اس لیے مجھے موجودہ ادبی سیاست کا کوئی علم نہیں کہ اصل میں کون کیا ہے اور مجھے یہ سب جاننے کا ذرا بھی شوق نہیں۔

ارژنگ: آپ نے ''غیر مشروط محبت'' کی نظموں میں جتنے بھی زنانہ کردار متعارف کروائے انہیں ''تم'' کا نام دیا اور سبھی مردانہ کرداروں کو ''میں'' کا نام دیا۔ شاید اسی لیے کچھ لوگ ان نظموں کو اپنی ذات پر منطبق کرتے ہوئے آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ اگر آپ مردوں اور عورتوں کے مختلف کرداروں کے علیحدہ علیحدہ نام رکھ لیتے تو بہتر نہ ہوتا؟

اظہر غوری: پہلے آپ مثال کے طور پر جناب احمد ندیم قاسمی کے افسانے بعنوان سفارش: پر ہونے والے ایک تنقیدی محاکمے اور نصابی تشریح کا المناک واقعہ سن لیں۔

روبیہ جیلانی جیسے کسی عطائی نقاد نے نصابی شرح میں قاسمی صاحب کا بطور افسانے کے مرکزی کردار، نام لے کر انہیں گالیاں دیں۔ حال آں کہ قاسمی صاحب نے اپنے مذکورہ افسانے کے مرکزی کردار کو واحد متکلم کے طور پر بیان کیا تھا، جو ایک دفتر بابو ہے اور کسی سے وعدہ کر کے بھی اس کی سفارش کے لیے وقت نہیں نکال سکتا، اور جب وہ آدمی مرکزی کردار کا شکریہ ادا کرنے آتا ہے تو اسے یہ نہیں بتاتا کہ تمہارا کام میرٹ پر ہوا ہے، کیوں کہ وہ سفارش نہیں کر پایا۔ روبیہ جیسے جاہل نقاد کو اتنا پتا بھی نہیں ہوتا کہ: میں: پر مشتمل کردار کا تخلیقی ادب میں یہ مطلب نہیں کہ مصنف اپنا ذاتی واقعہ بیان کر رہا ہے۔ اگر کوئی ''غیر مشروط محبت'' کے کردار میں ''میں'' سے یہ سمجھ لے کہ اظہر غوری کی اپنی بات ہے تو یہ نہ صرف اس کی حماقت ہے، بلکہ اس کے علم کل کا پیمانہ بھی ہے۔ عطائی نقاد ایسے جبل جہالت ہیں، جنہیں کھودا جائے تو اندر سے مردہ چوہا ہی برآمد ہوتا ہے۔ عطائی نقاد کسی بھی تخلیق کے کردار پر جو گزرے، اسے سچا واقعہ سمجھ لیتے ہیں اور پھر اس کو اپنی ذات سے آئیڈنٹی فائی کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ حال آں کہ تخلیقی ادب میں امکانی صداقتیں ہوتی ہیں۔ جس طرح ان امکانی صداقتوں کو بالکل مبالغہ اور جھوٹ سمجھنا غلط ہے، اسی طرح کسی تخلیق

میں موجودہ امکانی صداقتوں کو تاریخی واقعات کا درجہ دینا بھی غلط ہے، مگر ایسے عطائی نقاد کسی بھی ادب پارے کو اپنا ذاتی حریف یا حلیف سمجھ لیتے ہیں۔ وہ نارمل ہوں تو کسی بھی واحد متکلم کردار کو صرف اور صرف ایک تخلیقی کردار کے طور پر سمجھیں، کسی مصنف کی یا اپنی کہانی تصور نہ کریں۔

ارژنگ: ''غیر مشروط محبت'' میں پابند نظموں سے زیادہ نثری نظمیں ہیں۔ نیز نثری شاعروں اور روایتی غزل گو، شاعروں کے مابین جو متعصبانہ رویہ پایا جاتا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

اظہر غوری: ہر تعصب کی وجہ جہالت اور خوش فہمی ہوتی ہے۔ اصل معاملہ صرف شعری اظہار کا ہے، ہیت، اسلوب، لسانی اور عروضی اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں۔ جہاں تک میرے تخلیقی عمل کا تعلق ہے، میں جس مقام پر پابند شاعری کے ذریعے اپنا احساس اور جذبہ بیان کر سکتا تھا، وہاں میں نے عروض کا استعمال کیا، لیکن جہاں میرا مافی الضمیر رکاوٹ کا شکار ہو رہا تھا، وہاں میں نے عروض کا دامن چھوڑ کر نامیاتی شعری اظہار کا ہاتھ تھام لیا۔ میں غالب اور حالی کو قابل تقلید نظریات کا حامل سمجھتا ہوں۔

اصغر شامی

○ حقیقی ادب مضافات میں ہی پروان چڑھتا ہے۔
○ میرا نظریہ ادب صرف اور صرف ادب برائے اصلاح ہے۔
○ ادیبوں کی طرف سے مفت پڑھنے کا رُجحان حوصلہ شکنی کا باعث ہے۔

اصغر شامی سرگودھا ڈویژن کے معروف شاعر، صحافی اور ادیب ہیں، انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پنجابی ادب کے پہلے دس ناول نگاروں میں شامل ہیں۔ جس پر انڈیا ریڈیو سے تبصرے نشر ہو چکے ہیں اور اِن کی مشہور نظم نور جہاں دے مزار اتے مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

ارژنگ: ادبی سفر کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

اصغر شامی: کسی بھی شخص کو کوئی خصوصیت یا اعزاز قدرت کی طرف سے مقدر کے طور پر عطا ہوتا ہے جس کا ادراک اسے اپنے ماحول کی نسبت سے ہوتا ہے چونکہ میرے گھر کا ماحول عین مشرقی اور اسلامی ہے اس لیے بچپن ہی سے پنجابی کے معروف شاعر اور صوفی دائم اقبال دائم کا شاہنامہ اسلام اور سید وارث کی ہیر وارث شاہ پڑھنے کا شرف حاصل رہا اور اس دوران مصرعے کہنا بھی عام شغل رہا تاہم شاعری کا باقاعدہ آغاز میں نے ۱۹۶۹ء میں کیا۔ جب میں گورنمنٹ ڈگری کالج میں فرسٹ ایئر میں تھا۔ ایک گلاب کے پودے پر

پھول کو کانٹوں میں گھرا دیکھ کر فی البدیہہ لبوں سے یہ شعر ادا ہوا۔۔۔

جدھر ویکھیا گلشن دے وچہ عجب تماشہ مچیا اے
پھلاں اتے کنڈیاں دی ہرتھاں سرداری لگدی اے

اور اس طرح میں باقاعدہ شعر کہنے شروع کیے اور یہ شعری ابتداء اس شعر کے بعد زیادہ اردو ہی میں ہوا کرتے تھے اور میں نے بھی اردو میں کہنا شروع کیا اور ممتاز مقامی شاعر سید اعجاز کرنالوی مرحوم کے سامنے زانوے تلمذ طے کیا۔

ارژنگ: آپ نے پنجابی زبان کو ہی اظہار کا ذریعہ کیوں بنایا؟

اصغر شامی: پنجابی میری مادری زبان اور لہجہ شاہپوری ہے چونکہ پنجابی ادب کو اب تک وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جو کم از کم پنجاب میں اس کا حق ہے اور پھر ۱۹۶۹ء۔۱۹۷۰ء میں تو صرف گنے چنے رائیٹرز تھے جب کہ اس کے برعکس اردو میں لکھنے والے شاعر وادیب سو نہیں تو ۹۹ فیصد ضرور تھے چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ پنجابی رائٹر کے طور پر کم مدت میں بہتر مقام حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مادری زبان ہونے کے باوصف ذخیرہ الفاظ میرے پاس اردو سے کہیں زیادہ تھا اس لیے میں نے پنجابی زبان کو ذریعہ اظہار بنایا اور اس ضمن میں میری ایک نظم' شاعر دیس پیار دا' مشاعروں میں میری شناخت بنی اور اسے سننے کے بعد میرے بزرگ رفقاء سید حامد شاہ کسٹمز انسپکٹر اور ممتاز مقامی دانشور جنرل سیکرٹری سٹی مسلم لیگ عنایت مرزا مرحوم نے کہا کہ میں پنجابی میں زیادہ خوبصورت لکھتا ہوں۔ صرف پنجابی میں لکھنے کا مشورہ دیا اور اب اللہ کے فضل و کرم سے ایک پنجابی رائٹر کی حیثیت سے میری الگ پہچان ہے۔

ارژنگ: آپ نے پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھا، کالم نگاری کی اور پنجابی ناول بھی تخلیق کیا آپ کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟

اصغر شامی: پنجابی کے ساتھ اردو میں کچھ کہنا یہ نہ صرف اردو ادبی معاشرت کے حوالہ سے میری مجبوری اور ضرورت ہے بلکہ اردو زبان کا بھی مجھ پر حق ہے اور میں نے چند نظمیں،

غزلیں اورافسانے وغیرہ لکھ کر یہ حق ادا کرنے کی کوشش کی تا کہ پنجابی عصبیت کی چھاپ نہ لگےاور جہاں تک میری ذاتی پسند کا تعلق ہےاس کی بنیاد کوئی موضوع ہوتا ہےاوراس کی منا سبت سے میں فیلڈ منتخب کرتا ہوں ۔تا ہم پنجابی ناول لکھنے کے عمل کو آگے بڑھانے کی خواہش ہے۔

ارژنگ: پریت کے بعد کوئی دوسرا ناول لکھنے کے بارے میں کبھی سوچا؟

اصغرشامی: میں چاہتا ہوں کہ پریت کے بعد کوئی نیا موضوع تلاش کروں اوراسے ناول کی شکل دوں اوراس ضمن میں محنت کشوں کے حقوق کے حوالہ سے لکھنے کی ابتداء کر دی ہے۔ جہاں تک پریت کی شہرت کا تعلق ہے اس کی فکشن انسانی جذبوں کے بہت قریب اور منظرنگاری فطری حسن کی عکاس ہےاور مزید شہرت اس وجہ سے ہوئی کہ ڈاکٹر شہباز ملک صدر شعبہ پنجابی ادب پنجاب یونیورسٹی کے ایک تبصرہ پر ریڈیوامرتسر جالندھر سے تبصرہ نشر ہو اور ناول نے مجھے پاکستان میں ۷ویں ناول نگار کا اعزاز بھی بخشا۔

ارژنگ: سننے میں آیا ہے کہ آپ نے علامہ محمد اقبال کی کتاب پیام مشرق کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا ہے؟

اصغرشامی: پیام مشرق حضرت علامہ اقبالؒ کا فارسی مجموعہ کلام ہے۔جس کی ادبی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں تا ہم میں دوران سفر ایک نا معلوم پنجابی بزرگ کو ٹرین میں باہمی گفتگو کے دوران یہ کہتے سنا کہ اگر یہ پنجابی میں ہوتی تو پھر ہمیں بھی پتہ چلتا کہ یہ کیسے انمول موتی ہیں۔چنانچہ اس روز سے ہی میں نے پیام مشرق کو پنجابی میں منظوم کرنے کا فیصلہ کرلیااور ۱۹۸۰ء میں کام شروع کیااوراب یہ اللہ کے فضل وکرم سے مکمل ہے۔

ارژنگ: آپ کی شہرۂ آفاق نظم ''نور جہاں دے مزار اُتے'' ہے کیا اس کے بعد کوئی دوسری اس معیار کی نظم تخلیق ہوسکی یا نہیں؟

اصغرشامی: پنجابی شعروادب میں میری زیادہ تر شناخت میری پنجابی نظمیں ہیں جو ۱۹۷۸ء

میں پہلی دفعہ ''ڈوہنگیاں سوچاں'' کے عنوان سے منظر عام پر آئیں۔ اس کتاب میں غزلیں بھی ہیں۔ تاہم توں حکم تے کر'' تقدیر دا بکھیڑا، وسریاں گلاں'' حسرت اور غلطی دا اقرار وغیرہ ایسی نظمیں ہیں کہ مشاعرہ میں فرمائش پر بیک وقت تین تین چار چار نظمیں پڑھیں اس کے بعد مجھے نظم کا شاعر کہا جانے لگا جب کہ مجھے بھی نظم لکھ کر لطف آتا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں میں نے اہم خیال کرتے ہوئے نظموں پر زیادہ توجہ دی اور علامتی وتمثیلی نظموں کے علاوہ فلسطینی بچی دے ناں، کمہار، فصل ونگاں نی کڑییے، نور جہاں دے مزار اتے اور وارننگ ایسی نظمیں ہیں جنہیں لوگ فرمائش کر کے سنتے ہیں۔ ونگاں اور وارننگ گوندل بار کے مقامی لہجہ میں لکھی گئی ہیں۔

تاہم نور جہاں دے مزار اتے واقعی ایک شاہکار نظم ہے جس کی گونج ہندی ادب تک پہنچ چکی ہے لیکن اس معیار کی کوئی اور تخلیق ابھی نہیں ہوئی

ارژنگ: آپ کا نظریہ ادب کیا ہے؟

اصغر شامی: میرا نظریہ ادب صرف اور صرف ادب برائے اصلاح ہے ادب برائے امن وآشتی اور ادب برائے عشق ہے۔ میں تفرقہ بازی اور تعصب سے نفرت کرتا ہوں۔

ارژنگ: مضافات میں رہنے والے حقیقی تخلیق کاروں کو کن مشکلات کا سامنا ہے؟

اصغر شامی: دنیا جانتی ہے کہ حقیقی ادب مضافات ہی میں پروان چڑھتا ہے اور چڑھ رہا ہے سید وارث شاہ نے ملکہ ہانس میں بیٹھ کر ہیر وارث شاہ حضرت محمد بخش نے کھڑی شریف میں سیف الملوک اور ایسے ہی دیگر صوفیائے کرام نے اپنے گاؤں میں انمول داستانیں اور واریں لکھیں جب کہ برصغیر کے نامور شعرائے کرام احمد ندیم قاسمی، اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق بھی گاؤں ہی سے ہے۔ مضافاتی شاعروں، ادیبوں کے پاس پروجیکشن کے مواقع بہت کم ہیں اور وہ چھوٹی موٹی نشستیں، مشاعرے وغیرہ منعقد کر کے اپنے جذبات کی تشفی کرتے ہیں اور اس ضمن میں وہ میڈیا مراکز میں بیٹھے ہوئے شعراء کرام کی حسب توفیق

خدمت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس لاہور، راولپنڈی، ملتان اور کراچی میں میڈیا پر قابض ان شعرائے کرام نے کبھی بھی مضافاتیوں کو لفٹ نہیں دی، البتہ جوان مراکز میں پہنچا مقامیوں سے آگے نکل گیا اس لیے مضافاتی شعرائے کرام کو چاہیے کہ وہ میڈیا مراکز میں کم ازکم لاہور اور راولپنڈی کے پروگراموں میں شرکت کے لیے ذرائع تلاش کریں اور اپنی حیثیت منوائیں۔

ارژنگ: اپنے علاقہ کی ادبی صورت حال کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کریں؟

اصغر شامی: مقامی ادبی صورتِ حال جزوی جمود کا شکار ہے جس سے ٹیلنٹ ضائع ہو رہا ہے۔ ۲۷ برس پہلے بزمِ سخن، انجمن فروغ ادب نے بہت کام کیا۔ جب کہ آج کل انجمن فروغ ادب، حلقہ اربابِ سخن اور سرسید لٹریری سرکل تین تنظیمیں ایسی ہیں جن کو تقریبات منعقد کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان میں سرسید لٹریری سرکل نے گزشتہ برسوں میں مقامی انتظامیہ کے تعاون سے اور اپنی مدد آپ کے تحت بعض یادگار محفلیں منعقد ہونے والا جشن شوکت راز یادگار رہے۔ انجمن فروغ ادب کی سرگرمیاں ہمیشہ کی طرح بیٹھک مشاعروں تک محدود ہیں۔

ارژنگ: کیا ادبی اخبارات ادب کے فروغ کے سلسلہ میں کام کر رہے ہیں یا نہیں؟

اصغر شامی: اخبار شائع کرنا بڑا دل گردے کا کام ہے اور پھر ادبی اخبار نکالنے والا تو کوئی بہت ہی ادب پرور ہوگا جو ادبی اخبار نکالے وجہ یہ ہے کہ اخبار شائع کرنے کے لیے ایک معقول رقم کی ضرورت ہے جب کہ شاعروں، ادیبوں کی طرف سے مفت پڑھنے کا رجحان حوصلہ شکنی کا باعث ہے۔

احمد جلیل

○ ادب میں مضافاتی اور غیر مضافاتی کی تقسیم انتہائی غیر فطری ہے۔

○ ادب میں گروہ بندیوں کا قائل نہیں ہوں۔

○ ظفر اقبال نے اُردو ادب کو نئے ذائقوں سے روشناس کرایا ہے۔

احمد جلیل کا اصل نام عبدالجلیل اور قلمی نام احمد جلیل ہے اوکاڑہ کینٹ کے ایک مقامی ادارے کے سربراہ ہیں۔ نظم، غزل اور نثر میں یکساں مہارت رکھتے ہیں تاہم ان کا اصل میدان غزل ہی ہے۔ بڑے خوبصورت شعر کہتے ہیں ان کی شاعری پرت در پرت ادب کے نئے نئے ذائقوں سے روشناس کراتی ہے۔ اوکاڑہ اور گردونواح میں برپا ہونے والی جملہ ادبی تقاریب کا وہ مرکز ومحور ہوتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ ان کے بغیر کوئی ادبی تقریب مکمل نہیں ہوتی تو بے جا نہ ہوگا مقامی ادبی تنظیم کے جنرل سیکرٹری ہیں اور اس تنظیم کے زیر اہتمام آئے دن خوبصورت ادبی تقاریب کا انعقاد کرنا ان کا مشغلہ اور معمول ہے اب تک اس تنظیم کے تحت بے شمار یادگار ادبی تقاریب منعقد ہو چکی ہیں جن کا کریڈٹ بلاشبہ احمد جلیل کو جاتا ہے اس حوالے سے ان کی Contribution قابل قدر ہیں۔ بطور انسان وہ انتہائی مخلص اور شریف الطبع ہیں دوسروں کے دکھ پر تڑپ اٹھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے منفی رویے ان کی شاعری کا موضوع بنے بغیر نہیں رہ سکتے آپ چاہے اسے مزاحمتی رنگ سے موسوم کرلیں لیکن یہ وہ بے رحم سچائیاں ہیں جن سے کوئی بھی دردمند دل صرف نظر کر کے نہیں گزر سکتا ویسے بھی سچا ادب اپنے ماحول کا عکاس ہوتا ہے لہٰذا ایک

حساس شاعراس سے کیونکر پہلو تہی کرسکتا ہے ان کی شاعری میں جذبوں کی سچائیاں بیبا کانہ جھانکتی ہوئی نظر آتی ہیں ان کے لہجے کی خوشبو الگ سے محسوس ہوتی ہے ان کی شاعری پڑھ کر ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

چٹان: شاعری کی طرف کیسے آئے؟

احمد جلیل: صحیح طرح سے تو یاد نہیں لیکن یہ سانحہ بہت پہلے ہو گیا تھا۔

چٹان: آپ کی شاعری میں مزاحمت کا رویہ بہت نمایاں ہے اس کی کوئی خاص وجہ؟

احمد جلیل: کوئی بھی لکھاری ہو اس ماحول سے لاتعلق نہیں رہ سکتا جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہو، میری شاعری میں مزاحمتی رویہ درحقیقت میرے ان محسوسات کا عکس ہے جن کو میں نے شدت سے محسوس کیا معاشرے میں نظر آنے والے منفی رویے غیر اختیاری طور پر میری شاعر ی میں در آئے ہیں مثلاً جب میں نے یہ شعر لکھا تھا تو ایک خاص کیفیت سے گزرا تھا۔

کس حسرت سے کھلونوں کی دکاں تکتے ہیں
ہائے وہ بچے جو ضد کر کے مچل بھی نہ سکے

اس طرح زندگی جس جبر کا شکار ہے وہ احساس میرے اشعار میں در آتا ہے مثلاً

کٹے ہوئے ہیں پرندے کے بال و پر دیکھو
سجے ہوئے ہیں صلیبوں پہ کتنے سر دیکھو

تاہم میری شاعری میں رجائیت کا عنصر بھی نمایاں نظر آئے گا۔ مثلاً

اندھیری رات کے موسم نئے نہیں ہیں جلیلؔ
کہ ظلمتوں سے ہمارا سدا جہاد رہا

چٹان: مضافاتی اور غیر مضافاتی ادب کے بارے میں آپ کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

احمد جلیل: میرے خیال میں ادب میں مضافاتی اور غیر مضافاتی کی تقسیم انتہائی غیر فطری ہے۔ مجھے ادب میں یہ اصطلاح ایک اضافی چیز معلوم ہوتی ہے معیاری ادب مضافات میں تخلیق ہو رہا ہو یا بڑے شہروں میں وہ ادب ہے اس کی پذیرائی ہونی چاہیے اگر کسی گروہ بندی یا تعصب کی بنا پر اس کی پذیرائی نہیں ہوتی تو میں اس کو بددیانتی سمجھتا ہوں۔

چٹان: مضافات کے ادیبوں کے ساتھ میڈیا کا جو رویہ ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

احمد جلیل: میں سمجھتا ہوں کہ مضافات کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ میڈیا کا رویہ فی الوقت انتہائی نامناسب ہے میڈیا پر جو کچھ پیش کیا جاتا ہے الا ماشاءاللہ اس کے معیار پر رونا آتا ہے اس کے مقابلے میں جو ادب مضافات میں تخلیق ہو رہا ہے اگر میں اسے ادب کا اعتبار اور معیار کہوں تو بے جا نہ ہوگا کچھ نام تو اتنے معتبر ہیں کہ بڑے شہروں کے ادبی جگادری ان سے خائف ہیں انہیں ڈر ہے کہ اگر یہ لوگ میڈیا پر آ گئے تو ان کی ویلیو ماند پڑ جائے گی اس ضمن میں، میں مسعود احمد کا نام لینا چاہوں گا غزل کو جس مقام پر انہوں نے پہنچا دیا ہے کسی بڑے شہر کا شاعر تو شاید اس کا تصور بھی نہ کر سکے اس طرح مضافات کے حوالے سے قمر رضا شہزاد، اوصاف، شیخ، واصف سجاد، اکرم ناصر کے نام بھی کم معتبر نہیں لیکن میڈیا کا رویہ ان لوگوں یا ان جیسے لوگوں کے ساتھ کبھی حوصلہ افزاء نہیں رہا۔

چٹان: ہم عصر شعراء میں سے آپ کا پسندیدہ شاعر کون سا ہے؟

احمد جلیل: اس ضمن میں میری پسند کا دائرہ کار ذرا وسیع ہے تاہم میں مسعود احمد کو جدید غزل کا اعتبار سمجھتا ہوں، دیگر ہم عصر شعراء میں مجھے ظفر اقبال، اسلم کولسری، احمد فرید اور سعود عثمانی بھی پسند ہیں گئے دنوں کے شعراء میں مجھے ناصر کاظمی اور ساغر صدیقی پسند ہیں۔

چٹان: ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں آپ کا کیا نقطہ نظر ہے؟

احمد جلیل: ادب میں گروہ بندیوں کا قائل نہیں ہوں بلکہ میں اسے غیر فطری حد بندیوں کا نام دوں گا اچھا ادب جو بھی تخلیق کرے میرے لئے قابل احترام ہے تاہم میں احمد ندیم قاسمی کی نئی تخلیق کا مداح ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں کسی گروہ بندی سے منسلک ہوں اس عمر میں بھی ان کے کلام میں ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

چٹان: ادب میں جو نت نئے تجربات ہو رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

احمد جلیل: ظفر اقبال، فرحت عباس شاہ، عدیم ہاشمی اور بہت سے دوسرے لوگ ادب میں نئے نئے تجربات کر رہے ہیں۔ میں ان سب سے متفق تو نہیں لیکن ضرور کہوں گا کہ ان کے تجربات سے ادب کو بہر حال فائدہ پہنچا ہے بالخصوص ظفر اقبال نے شاعری میں جو نئے نئے

تجربات کئے ہیں ان میں سے کچھ کے ذائقے تو اچھے ہیں اگر چہ آب رواں اور غبار آلود سمتوں کے بعد ظفر اقبال کی غزل کو وہ پذیرائی نہیں ملی تاہم انہوں نے اردو ادب کو جو نئے الفاظ اور تراکیب دی ہیں وہ قابل تحسین ہیں انہوں نے اردو ادب کو نئے ذائقوں سے روشناس کروایا ہے۔

چٹان: آپ کا رجحان نظم کی طرف ہے یا غزل کی طرف؟

احمد جلیل: میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں لیکن کچھ جذبوں کو نظم میں پرونے کی بھی سعی کرتا رہتا ہوں، مسعود احمد اور اسلم کولسری کی رائے ہے کہ میری نظم بہت توانا ہے تاہم اس کا فیصلہ تو وقت اور قاری کرے گا۔

چٹان: کیا عہد حاضر کی کوئی شاعرہ پروین شاکر کا خلا پر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

احمد جلیل: میرے خیال میں ہر سچے سخنور کا کوئی دوسرا نعم البدل نہیں ہوسکتا جہاں تک پروین شاکر کا تعلق ہے اس کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب میں اس کا خلا شاید کبھی پر نہ ہو سکے، اس کی ناگہانی موت پر میں نے دو نظمیں لکھیں تھیں جو مختلف اخبارات میں بھی چھپیں سچی بات یہ ہے کہ اس کے جانے سے اس کے انداز میں عورت کی نمائندگی کرنے والی کوئی اور شاعرہ مجھے نظر نہیں آتی میں نے اس کی وفات پر جو اشعار لکھے ہیں ان میں دو اشعار یوں ہیں۔

وہ جس کے نام کی بکھری نگر نگر خوشبو
ادب سے روٹھ گئی آج وہ مگر خوشبو
اسے سلیقہ تھا ہر ایک بات کہنے کا
سماعتوں کے وہ سب کھولتی تھی در خوشبو
وہ خود کلامی تیری، تیرا جبر سے انکار
ہیں تیری سوچ کے صد برگ نامہ بر خوشبو

چٹان: آپ بہت دیر سے لکھ رہے ہیں پھر آپ کی کتاب آنے میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی؟

احمد جلیل: کوئی خاص وجہ نہیں یوں سمجھ لیں سنجیدگی سے کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں دیا لیکن

جب مسعود احمد کا پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا تو پھر وہ مجھے با اصرار کہنے لگے کہ کتاب جلد از جلد آنی چاہیئے میرا شعری مجموعہ ''دور مت نکل جانا'' درحقیقت مسعود احمد کے پیہم اصرار کا نتیجہ ہے تاہم اب میں بھی محسوس کرتا ہوں یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھا یہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ میرا دوسرا شعری مجموعہ منظر منظر ڈوب رہا ہے انشاء اللہ بہت جلد منظر عام پر آ جائے گا۔

چٹان: نئے لکھنے والوں کے لئے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

احمد جلیل: اس وقت وطن عزیز میں جو جنس وافر مقدار میں دستیاب ہے وہ شعراء ہیں جسے دیکھو وہ مشق سخن کے نام پر مشق ستم کر رہا ہے اس میں شک نہیں کہ نئے لکھنے والوں میں کئی معتبر نام بھی سامنے آئے ہیں لیکن زیادہ تر لکھنے والوں کو ابھی بہت اصلاح کی ضرورت ہے میرا انہیں مشورہ ہے کہ وہ لوگ پہلے زیادہ سے زیادہ شعری ادب کا مطالعہ کریں پھر اس فیلڈ میں آئیں وادی سخن کی طرف قدم بڑھائیں اگر کوئی الجھن محسوس ہو تو کسی استاد سے رہنمائی حاصل کر لیں۔

چٹان: کسی بھی ادیب یا شاعر کو اپنی پہچان کروانے کے لئے کیا کچھ کرنا چاہیئے۔

احمد جلیل: جائز حدوں کے اندر رہتے ہوئے پوری محنت، لگن، شوق اور ایمانداری سے کام کرنا چاہیئے۔

اے جی جوش

○ میں خود بھی نہیں جانتا کہ کیوں اور کس لیے شعر کہتا ہوں۔
○ نئے لکھنے والوں سے پرانے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔
○ اس عمر میں رانجھا بننے کی کوشش بھی کروں تو کون سی ہیر میرے انتظار میں ہوگی۔

ارژنگ: شعر کیوں اور کس لیے کہتے ہیں۔ بالکل سچ سچ بتائیں؟
اے جی جوش: سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کیوں اور کس لیے شعر کہتا ہوں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ میرا کوئی تصوراتی محبوب ہے۔ میں جس کے لیے شعر کہتا ہوں وہ جس دن سامنے آ گیا آپ کو بھی بتا دوں گا۔
ارژنگ: آپ کی شگفتہ طبیعت کے برعکس آپ کی شاعری میں ہجر و فراق کی جو کیفیات نمایاں ہیں اس کا کوئی خاص پس منظر ہے؟
اے جی جوش: شاعر کا مزاج کے ساتھ کم اور دل کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ میں شاعری دل کے موسم سے متاثر ہو کر کرتا ہوں۔ اس لیے میری شاعری میں ہجر و فراق کا تاثر زیادہ ہے۔ کیونکہ میرے دل کو اکثر ایسے جذبات سے واسطہ پڑتا ہے۔ بقول غالب ''دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں''
ارژنگ: کاروبار یا شاعری میں سے آپ کو کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو؟ ایمانداری سے جواب دیں۔
اے جی جوش: یہ سوال آپ ذرا دیر کے بعد پوچھ رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے میں 72

سال کا ہو گیا ہوں۔ آپ مجھے بے تکلفی سے ستر ہ بہتر ہ کہہ سکتے ہیں۔ اس عمر میں کیا خاک انتخاب کروں گا۔

ارژنگ: اگر آپ کو جوگ کے لیے کہا جائے کس ہستی کے لیے آپ ایسا کرنے کو تیار ہوں گے؟

اے جی جوش: جو الزام جوانی میں لیے جاتے ہیں وہ آپ بڑھاپے میں میرے سر تھوپنا چاہتے ہیں۔ میں اس عمر میں رانجھا بننے کی کوشش بھی کروں تو کون سی ہیر میرے انتظار میں ہوگی۔ یہ وہ عمر ہے جس میں اللہ کا ورد کیا جا سکتا ہے۔ اس کار نیک کے لیے میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔

ارژنگ: خوبصورتی سے کس حد تک متاثر ہوتے ہیں؟

اے جی جوش: خوبصورتی ہر انسان کو متاثر کرتی ہے لیکن کائنات میں تو حسن کے ہزاروں رُوپ ہیں۔ اگر آپ کی مراد صنف نازک کی خوبصورتی ہے تو میں انسان ہوں فرشتہ نہیں۔ اس لیے جس حد تک کوئی انسان صنف نازک کے حسن سے متاثر ہو سکتا ہے میں بھی ہوتا رہتا ہوں اور جب تک آنکھوں میں دم ہے ہوتا رہوں گا۔

ارژنگ: ادبی رسالہ نکالنے کا خیال کیسے آیا؟

اے جی جوش: ادبی رسالہ نکالنے کا خیال بھی تو خاص طور پر نہیں آیا تھا۔ دماغ میں خلل سا ضرور رہا جس نے آہستہ آہستہ ارادے کی شکل پائی اور یکم جنوری 1995ء کو میں نے ماہنامہ ''ادب دوست'' کا پہلا شمارہ نکال کر اللہ کے فضل سے اس ادارے کو تقویت دی۔ ہاں یہ سب تمہارا کرم ہے آقا کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔

ارژنگ: بطور مدیر آپ کو کن مشکلات سے گزرنا پڑا؟

اے جی جوش: مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔

ارژنگ: ہم عصر شعراء میں سے کن سے متاثر ہیں؟ چند ایک کے نام ضرور لیں۔

اے جی جوش: کچھ شعراء کے بعض اشعار بہت پسند آتے ہیں اور ان کو بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ قتیل شفائی، ناصر کاظمی، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی بطور خاص پسند ہیں۔

ارژنگ: خواتین کیسی شاعری کر رہی ہیں اور آپ کن خواتین کی شاعری سے متاثر ہیں؟

اے جی جوش: صدیوں سے خواتین پر شاعری کی جاتی ہے۔ اب خواتین کی شاعری پر تبصرہ کرنا پل صراط سے گزرنے کی بات ہے اور پھر ہمارے ہاں جبکہ مرد حضرات کبھی شاعری کے میدان میں شاعرات کو کھلے دل سے تمغہ یا اعزاز دینے کی جرات نہیں کرتے۔ البتہ مصلحتاً اپنے اپنے گوشہ پسندیدگی میں داد کے ڈونگرے برسا دیتے ہیں۔ اب میں کس کو خوش اور کس کو ناراض کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ بہر حال میں پروین شاکر کے بعد شبنم شکیل، ریحانہ قمر اور یاسمین حمید کی شاعری سے کافی متاثر ہوں۔

ارژنگ: آپ نے بیرونِ ملک میں کافی ادبی دورے کیے ہیں۔ وہاں کی ادبی صورت حال کے بارے میں کچھ بتائیں؟

اے جی جوش: بیرونِ ملک دوروں کے لیے میں اتنے کم وقت کے لیے گیا کہ وہاں مجھے ادیب صورتوں سے آشنائی ہوئی مگر وہاں کی ادبی صورت حال کو جاننے کے لیے وہاں جتنے قیام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا مجھے موقع نہیں ملا۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیاں کیا ہیں اور آپ کا تعلق کس گروہ سے ہے؟

اے جی جوش: میری دانست میں شعبہ تخلیق میں گروہ بندی کا تصور ہی بددیانتی پر مبنی ہے۔ لہٰذا میں ادب میں گروہ بندی کی مکمل نفی کر رہا ہوں۔ اگر ادیب اور شاعر بھی گروہ بند ہیں تو پھر مذہبی تفرقہ بازی پیدا کرنے والوں سے اہل قلم کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔

ارژنگ: نئے لکھنے والوں سے مطمئن ہیں؟

اے جی جوش: نئے لکھنے والوں سے پرانے کبھی مطمئن نہیں ہوئے لیکن اس عدم اطمینان کے باوجود نئے لکھنے والوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ شعر و ادب کا کارواں بدلتی زندگی کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور چلتا رہے گا۔

ارژنگ: شاعری میں اصلاح کے عمل کو کس حد تک جائز سمجھتے ہیں؟

اے جی جوش: میں شاعری میں خیال کی حد تک اصلاح کا قائل نہیں ہوں۔ ہاں کچھ لکھے بندھے قوائد کی حد تک اصلاح لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ارژنگ: ادب میں کیا کارنامہ سرانجام دینے کی خواہش رکھتے ہیں؟

اے جی جوش: کارنامے سرانجام دینے کی اُمنگ بھری عمر سے گزر چکا ہوں۔ اب کارنامے سرانجام دیتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر خوش ہونا اور جینا چاہتا ہوں۔

ارژنگ: کاروباری مصروفیات میں سے ادب کے لیے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟

اے جی جوش: ایک عمر ہوتی ہے جب آدمی کاروبار کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ پھر ایک ایسی عمر ہوتی ہے کہ جب کاروبار آدمی کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ آج کل میں اس عمر میں سے گزر رہا ہوں کہ جب چاہوں اپنے شوق کو کاروبار پر ترجیح دوں اور کاروبار کا کچھ بگاڑے بغیر اپنا ادبی رانجھا راضی کرسکتا ہوں۔

انور مسعود

○شاعری وہ جو نیکی کے ساتھ دلچسپی اور برائی کے ساتھ نفرت دلائے

○نوجوان نسل کی گرفت لفظ پر ڈھیلی پڑ گئی ہے۔لفظ کا فنکارانہ استعمال نہیں ہو رہا

○ جس ماحول میں ادیب رہتا ہے اُس کی سیاسیات اور سماجیات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے

ارژنگ: ذریعہ اظہار شاعری کیوں منتخب کیا؟ لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

انور مسعود: بات یہ ہے کہ میں جس گھر میں پیدا ہوا وہاں شاعری کا ماحول موجود تھا۔میری نانی اماں شاعرہ تھیں اور تایا بھی شاعر تھے۔جس شہر میں پرورش پا رہا تھا وہاں بھی شاعری کا بہت دور دورہ تھا۔شاعری میں مجھے شروع سے ہی دلچسپی تھی۔آپ دیکھیں کہ میں فارسی کی شاعری پڑھتا تھا حالانکہ مجھے فارسی کی بالکل سمجھ نہیں تھی۔میری والدہ کو لٹریچر سے بہت دلچسپی تھی۔والد صاحب نے بچپن میں ہی مجھے حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' لا کر دیا۔ اب بھی اُس کے کئی شعر مجھے زبانی یاد ہیں۔یہ وہ ماحول تھا جس میں شوق پروان چڑھا اور لکھنے کا خیال آیا۔یہاں میں اپنے شفیق اساتذہ چوہدری فضل حسین اور سیّد حامد حسین کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔انہوں نے بھی اس بابت بہت رہنمائی فرمائی۔

ارژنگ: آپ پیدا کہاں ہوئے؟ بچپن کہاں گزرا؟ اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے گا؟

انور مسعود: پیدائش تو میری سوہنی مہیوال کے چناب والے گجرات میں ہوئی۔مگر والد

صاحب کاروبار کے سلسلے میں لاہور ہجرت کر گئے۔ پرائمری سکول یعنی پانچویں جماعت تک کی تعلیم میں نے لاہور میں حاصل کی۔ بعدازاں والد صاحب واپس گجرات آ گئے اور ہم لوگ بھی ان کے ساتھ۔ میٹرک میں نے پبلک ہائی سکول گجرات سے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔ F.S.C میں زمیندار کالج میں داخلہ لیا۔ والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے مگر میری طبیعت شاید ڈاکٹری کے لیے موزوں نہیں تھی۔ جب لیبارٹری میں لڑکے مینڈک وغیرہ کی Disection کر رہے ہوتے تو میں غزل لکھ رہا ہوتا تھا۔

ارژنگ: تعلیمی سلسلہ پھر آگے کیسے بڑھا؟

انور مسعود: آرٹس کی تعلیم کی طرف آ گیا تھا۔ ایف اے میں میں نے سکالرشپ حاصل کیا۔ بی اے میں سلور میڈل لیا اور زمیندار کالج گجرات سے گریجوایشن کے بعد میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ سکول کنجاہ میں تھا۔ میری مشہور نظم ''ماں'' گجرات کے قریبی علاقے کنجاہ میں تدریسی زمانے کی یادگار ہے۔ یہ وہاں ہی لکھی گئی تھی۔ دو سال پڑھانے کے بعد میں لاہور آ گیا۔ اورینٹل کالج میں M.A میں داخلہ حاصل کیا اور ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ میری پنجاب میں پہلی پوزیشن تھی۔ اس کے بعد میں نے گورنمنٹ سروس جوائن کر لی۔

ارژنگ: آپ فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ تدریسی زمانہ کیسا گزرا؟ فارسی سے آپ کے خاص لگاؤ کی وجہ کیا ہے؟

انور مسعود: فارسی تو ہمارے گھر کی روایت بھی ہے۔ یوں کہ میری بیوی بھی فارسی پڑھاتی تھی، میں نے بھی فارسی پڑھائی اور اب میری بیٹی بھی کالج میں فارسی پڑھا رہی ہے۔ تدریسی زندگی بڑی بھرپور رہی۔ کئی شہروں میں پڑھایا، ڈیرہ غازی خان، بہاولنگر، پنڈی گھیپ، گجر خان، راول پنڈی، مری میں بھی پڑھاتا رہا۔ اسی دوران ۱۹۷۶ء میں چالیس اساتذہ کے وفد کے ہمراہ چار مہینے کے لیے ایران کے سرکاری دورے پر گیا۔ مجھے اس وفد کی سربراہی کرنے کا موقع بھی ملا۔

ارژنگ: آپ نے اپنی بیگم اور بیٹی کا تذکرہ کیا۔ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں گے؟

انور مسعود: میرے تین بیٹے اور دو بچیاں ہیں۔ سب شادی شدہ ہیں۔ ایک بیٹا لاہور میں عمار مسعود دنیا ٹی وی میں ملازم ہے جس نے پی ٹی وی کا مقبول پروگرام ''رات گئے'' شروع کیا تھا۔ اُس نے ایک نابینا لڑکی سے شادی کی تھی اب تو وہ بے چاری فوت ہو گئی ہے۔ باقی چاروں بچے یہاں اسلام آباد میں ہی رہتے ہیں۔

ارژنگ: ادب کی ترویج و ترقی کے لیے قائم اداروں کی کارکردگی سے آپ مطمئن ہیں؟

انور مسعود: کارکردگی ٹھیک ہی ہے۔ اپنی سطح پر وہ کوشش کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو شکایات بھی ہیں۔ ہر چیز سے ہر کوئی تو مطمئن نہیں ہو سکتا۔ مجھے ذاتی طور پر تو کوئی شکایت نہیں ہے۔ میری پہلی کتاب ''میلہ اکھیاں دا'' پر مجھے پاکستان رائٹر گلڈ کی طرف سے انعام ملا۔ پھر اکادمی ادبیات نے مجھے میری کتاب ''ہن کیہہ کریے؟'' پر ایوارڈ دیا۔ مجھے صدارتی ایوارڈ بھی ملا ہے۔ میری نظر میں تو یہ ادارے اپنا کام دستیاب وسائل میں بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ سب کو مطمئن کرنا تو ممکن بھی نہیں ہے۔

ارژنگ: کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہیے؟

انور مسعود: ادیب جس ماحول میں رہتا ہے اُس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ سماجیات اور سیاست سے الگ ہونا ممکن ہی نہیں اور نہ ہی یہ مستحسن عمل ہے۔ کیا علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ میں حصہ نہیں لیا تھا؟ کیا قائداعظم کے ساتھ اُن کا مکمل تعاون نہیں تھا؟ علامہ اقبال نے تو نہ صرف مقامی سیاست میں حصہ لیا بلکہ عالمی سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ اقوامِ متحدہ کی والدہ لیگ آف نیشنز کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ یہ کفن چوروں کا ٹولہ ہے جس ماحول میں ادیب رہتا ہے اس کی سماجیات و سیاسیات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ میرے خیال میں شاعری وہ جو نیکی کے ساتھ دلچسپی پیدا کرے اور برائی کے ساتھ نفرت دلائے۔ یہ فرض تو میں اپنی حد تک ادا کرتا رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔

ارژنگ: آپ نہیں سمجھتے کہ جب سے پرائیویٹ ٹی وی چینلز کا چرچا ہوا ہے ادبی سرگرمیوں کی کوریج دب سی گئی ہے؟

انور مسعود: میں تائید کرتا ہوں آپ کے خیال کی۔ ادبی کارروائیاں ہمارے ٹی وی چینل پر

کم ہو گئی ہیں۔ کمرشلزم ٹی وی پر چھایا ہوا ہے۔ اب تو بس جب محرم آتا ہے تو ایک سلام کا مشاعرہ ہو جاتا ہے یا پھر عید میلاد النبیؐ پر نعتیہ مشاعرہ کر دیا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں ادب کی ترویج تھی اب نہیں ہے۔ ہاں اخبارات میں ادب کے متعلق مواد مل جاتا ہے۔ جو اس کمی کو کسی حد تک پورا کر دیتا ہے۔

ارژنگ: قومی اخبار کے ادارتی صفحہ پر روزانہ آپ کا قطعہ چھپتا ہے۔ کبھی صحافت بھی کی ہے؟ کالم نگاری کے بارے میں کبھی نہیں سوچا؟

انور مسعود: یہ سوال اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔ کئی شعرا کرام اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ ان میں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی بہت اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور انتہائی اچھے کالم نگار بھی ہیں۔ مگر میری طبیعت کچھ کالم نگاری کی طرف نہیں آئی۔ میں نے ایک دفعہ ایک جگہ لکھا تھا کہ میرے قطعہ کو ہی میرا کالم سمجھ لیجیے۔

ارژنگ: نوجوان ادیبوں کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

انور مسعود: ان کو پیغام صرف یہ ہے کہ شعر و ادب لفظوں کا کھیل ہے۔ جب تک لفظ سے آگاہی نہ ہو تب تک معیاری شعر و ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ لفظوں میں پائی جانے والی موسیقیت اور معنویت کے ادراک کے بغیر لفظ کا مناسب استعمال نہیں آ سکتا۔ نوجوان نسل کی گرفت لفظ پر ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ لفظ کا فنکارانہ استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ نوجوان ادیبوں کو چاہیے کہ وہ سینئرز کو خوب پڑھیں میر تقی میر، مرزا غالب، فیض احمد فیض، مجید امجد سمیت تمام سینئرز ادیبوں کا بھرپور مطالعہ کریں۔

بیدل حیدری

- غزل کو ہر دور میں تجربات کی ضرورت رہی ہے۔
- مشاعروں پر نوکر شاہی کا قبضہ ہے۔
- مجھے اُستاد پرستی اور تلامذہ سازی ورثے میں ملی ہے۔

آج کے مشاعرے بھانڈ، بھنڈالوں کی محفلیں بنتے جا رہے ہیں۔ شاعری میں جھوٹ سچ اور خیر شر کی طرح صرف دو نظریے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کبیر والا میں مقیم ملک کے نامور اور سینئر شاعر بیدل حیدری نے ''ارژنگ'' کے بیورو چیف سے ایک انٹرویو میں کیا۔ انہوں نے مزید گفتگو کرتے ہوئے کہا شعر کا تعلق شعور ہے اور شاعری کرنا باشعور لوگوں کا کام ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بلاشبہ وہ دُنیائے ادب کے عظیم شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔

ارژنگ: شاعری میں نظریے کو کس قدر اہمیت حاصل ہے؟

بیدل حیدری: شاعری بذاتِ خود ایک نظریہ ہے۔ وہ اس لیے کہ شعر کا تعلق شعور سے ہے اور شاعری کرنا باشعور لوگوں کا کام ہے نا کہ جہلا اور دیوانوں کا شغل ہے۔ مزید برآں نظریہ کے صرف دو پہلو ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت نظریہ شعر و فن کا تعلق گراس روٹس کی طرح اس دھرتی اور اس دھرتی پر بسنے والے انسانوں سے ہے۔ شاعری شعوری طور پر انسانی مسائل اور اس کے عقدوں کو کھولتا ہے۔ جبکہ جن لوگوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری اور نظریہ فن بھی منفی ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بعض آسانیوں اور وسائل کی وجہ

سے وقتی طور پر ادب میں تھوڑی بہت جگہ مل ہی جاتی ہے لیکن ان کا ادب وقت کے ساتھ ساتھ مر جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ شاعری میں جھوٹ، سچ اور خیر وشر کی طرح صرف دو نظریے ہیں۔ باطل کو فنا ہے لیکن حق کو فنا نہیں۔

ارژنگ: کیا آج کل غزل میں مزید تجربات کی گنجائش ہے؟

بیدل حیدری: غزل کو ہر دور میں تجربات کی ضرورت رہی ہے۔ جبکہ موجودہ غزل سابقہ تجربات کی آئینہ دار ہے۔ یہ تجربات باعتبار زبان و بیان میں بھی ضروری ہیں اور مضامین غزل کے اعتبار سے بھی ضروری ہیں۔ اگر موجودہ غزل میں تجربات نہ کیے گئے تو آج کی غزل یقینی طور پر یکسانیت کا شکار ہو جائے گی اور ایک ہی قسم کی غزل سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے سامع اور قاری تنگ آ جائیں گے۔ ویسے بھی جمود موت کا دوسرا نام ہے لیکن اس کے معنی ہرگز نہیں کہ غزل میں تجربات بے لگام ہو کر کیے جائیں کیونکہ غزل کے کچھ اپنے بھی تقاضے ضروری ہوتے ہیں۔ اس لیے تجربات کرتے وقت فنی تقاضوں کی پاسداری ضروری ہے۔

ارژنگ: آج کی غزل اور نظم کا موازنہ کیسے کریں گے؟

بیدل حیدری: آج کی غزل ہو یا قدیم غزل اس کا موازنہ نظم سے ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ غزل اور نظم کے اپنے اپنے انداز، اسلوب اور فنی ضابطے ہیں۔ آج کی غزل کا موازنہ قدیم غزل سے تو کیا جا سکتا ہے لیکن نظم سے نہیں اور اسی طرح آج کی نظم کا موازنہ گزشتہ نظم سے کیا جا سکتا ہے۔ میں نظم پر غزل کو اس لیے فوقیت دیتا ہوں کہ آج کی غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل نظم، ایک مکمل کہانی اور ایک مکمل افسانہ ہے۔ جبکہ آج کی نظم صرف ایک ہی مضمون کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی ایک ہی مضمون کو تفصیل کے ساتھ نظم کر لیا جاتا ہے۔ غزل اس اعتبار سے بھی نظم پر بھاری ہے کہ غزل کے اشعار روزمرہ، ضرب الامثال، گانے اور گنگنانے میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ پوری نظم کسی قاری یا سامع کو یاد ہی نہیں رہتی اور ہماری اکثر نظمیں گائیکی کے معیار پر پورا نہیں اُترتیں۔

ارژنگ: احمد ندیم قاسمی کو آپ شاعر، ادیب صحافی یا دانشور کس حیثیت میں زیادہ اہم سمجھتے ہیں؟

بیدل حیدری: احمد ندیم قاسمی بلاشبہ دُنیائے ادب کے عظیم شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ شخصیت

کے حوالے سے بھی آپ ایک عظیم انسان ہیں۔ میری معلومات کے مطابق احمد ندیم قاسمی صاحب نے متعدد شاعروں، ادیبوں کو فنون کے پلیٹ فارم سے متعارف کرایا۔ یہ ہی نہیں بلکہ بعض شعراء کی مالی معاونت بھی کی۔ یہ اور بات ہے۔ ان میں بعض احسان فراموش لوگ بھی شامل ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے حوالے سے بھی قاسمی صاحب کا کردار مثبت رہا۔

ارژنگ: کن شعراء نے ابتدا سے آج تک آپ کو متاثر کیا یا ان کی شاعری آپ کو پسند رہی؟

بیدل حیدری: غزل کے حوالے سے میر تقی میر، آتش لکھنوی، مرزا غالب، فانی بدایونی، مرزا ایاس یگانہ چنگیزی اور اپنے اُستاد گرامی حضرت جلال الدین حیدر دہلوی اور نذر کھتولوی سے متاثر ہوں۔ جب کہ عصر حاضر میں مجھے احمد ندیم قاسمی، ادا جعفری، پروین شاکر، احمد فراز، قتیل شفائی، محشر بدایونی، محترمہ منصورہ احمد کی شاعری پسند ہے۔

ارژنگ: مشاعرہ کا ہماری شاعری و زبان کے فروغ میں کیا کردار ہے؟

بیدل حیدری: مشاعرہ شاعری کے فروغ میں بلاشبہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ زمانہ جاہلیت سے آج تک شاعری کے فروغ کا اہم سلسلہ رہا ہے۔ جب اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹی وی نہیں تھے اور مشاعرہ ہی عوام تک شاعری پہنچانے کا ایک ذریعہ بنتا تھا۔ ایسے درجنوں شاعر ہو گزرے ہیں جو مشاعروں کے بل بوتے پر عظیم شاعر بنے اور تاریخ کا حصہ بن گئے۔ آج کے مشاعرے بھانڈ، بھانڈالوں کی محفلیں بنتی جا رہی ہیں۔ مشاعرہ میں شخصیت فن پر غالب آ گئی ہے۔ مشاعروں پر نوکر شاہی کا قبضہ ہے اور مشاعروں میں صرف ان ہی شاعروں کو بلایا جاتا ہے یا نوازا جاتا ہے جن کا نوکر شاہی سے قریبی رابطہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عوام آہستہ آہستہ مشاعروں سے بیزار ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض نجی محفلیں مشاعروں کے حوالے سے انجمن ستائش باہمی بن کر رہ گئی ہے۔

ارژنگ: آپ کے تلامذہ کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ ان کے حوالے سے کیا کہیں گے؟

بیدل حیدری: مجھے اُستاد پرستی اور تلامذہ سازی ورثے میں ملی ہے۔ لہٰذا میں اپنے اساتذہ کو اپنا مرشد اور تلامذہ کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں۔ مجھے اپنے تلامذہ کی صحیح تعداد تو یاد نہیں کیونکہ میں نے ایسا کوئی رجسٹر نہیں کھولا۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ انکی تعداد دس، بیس، پچاس، سو

نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ جبکہ میں یہ بات بار ہا بڑے وثوق سے کہہ چکا ہوں کہ میرا ہر شاگرد اپنی جگہ منصب اُستادی پر فائز ہے۔

ارژنگ: آپ کے نزدیک آج کل کون کون سے شاعر اچھی شاعری کر رہے ہیں؟

بیدل حیدری: اس وقت پاکستان میں اچھا شعر کہنے والے تقریباً ہر شہر میں موجود ہیں لیکن فیروز شاہ (میاں والی)، انور فیروز (راولپنڈی)، سلیم کوثر (کراچی)، شکیل سروش (امریکہ)، آل عمران (گجر خاں)، سیّد انصر (سرائے عالم گیر)، سالک ربانی (میاں چنوں)، اختر شمار، اطہر ناسک، عباس تابش (لاہور)، شام جعفری (خانیوال)، مظہر بخاری (میاں چنوں)، محمود غزنی، حنیف صوفی اور کاشف سجاد (بورے والا) مقصود حسنی (قصور)، انجم سلیمی (فیصل آباد)، غزالی (گوجرہ)، ناز خیالوی (تاندیوالہ)، ارشاد گرامی (ٹوبہ ٹیک سنگھ)، ارشد جاوید (رحیم یار خان)، صفدر سلیم سیال (جھنگ)، غلام حسین ساجد (لاہور)، طاہر قدیر شکیل ملتانی (خانیوال)، ممتاز اطہر (ملتان)، مظہر قلندرانی (مظفر گڑھ)، حسن رضوی (لاہور)، قمر رضا شہزاد (کبیر والا)، قمر ساجد (کوٹ ادو)، ڈاکٹر عبداللہ عظیم (وہاڑی)، ادریس قمر (چیچہ وطنی)، ارشاد جالندھری (کسوال) اور فیصل عجمی (راولپنڈی) جاندار شاعری کر رہے ہیں۔

ارژنگ: نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام؟

بیدل حیدری:

پیچھے رہ جاؤ گے تکمیل ہنر میں ورنہ
کم سے کم ذہن کو ایک صدی آگے رکھو

(نامور شاعر مظہر بخاری نے ماہنامہ ''ارژنگ'' کے لیے یہ خصوصی انٹرویو ترتیب دیا)

بشریٰ اعجاز

- صرف شخصیت کے بل بوتے پر آپ ادب میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔
- ذاتی طور پر نثری شاعری کو پسند کرتی ہوں۔
- ادبی حلقوں میں خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔

پنجابی صوفیانہ شاعری میں جو جذب و مستی ہے وہ شاید ہی دنیا کی کسی اور زبان میں ہو بابا فریدؒ کی کوک سے لے کر حضرت سلطان باہوؒ کی ہوک تک سیدھے سادھے لفظوں کے پردے میں کہی جانے والی باتوں میں جانے کیا اثر ہے جو دلوں کے راستے روحوں میں اتر جاتا ہے۔ پنجابی صوفیانہ شاعری میں وہ سفر جو بابا فریدؒ سے شروع ہوا تھا میاں ہدایت اللہؒ پر ختم ہو جاتا ہے۔ میاں ہدایت اللہؒ پنجابی زبان کے آخری صوفی شاعر مانے جاتے ہیں ان کے بعد شاعری کے حوالے سے ویسے تو بڑے بڑے نام ہیں جیسے حکیم ناصر، مولا بخش کشتہ، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، فیروز دین شرف، غلام رسول عالمپوری، شریف کنجاہی، عارف عبدالمتین، احمد راہی، ڈاکٹر یونس احقر اور منیر نیازی وغیرہ مگر ان سب کے ہاں صوفیانہ رنگ کی بجائے دنیاوی موضوعات زیادہ ملتے ہیں خال خال ان کے ہاں صوفیانہ مضامین بھی ملتے ہیں مگر ان کی شاعری کا جو مجموعی تاثر بنتا ہے وہ صوفیانہ شاعری کے برعکس ہے مثال کے طور پر عارف عبدالمتین کی شاعری میں ایسے موضوعات بھی ہیں جو صوفیانہ رنگ لئے ہوئے ہیں لیکن کثرت ان کے ہاں بھی دنیاوی موضوعات کی ہے اس کے برعکس جب بشریٰ اعجاز کے پنجابی شعری مجموعہ ''پبھاں بھار'' کا مطالعہ کریں تو اس کی شاعری پر حیرت انگیز حد تک صوفیانہ

شاعری کا گمان گزرتا ہے گویا پنجابی صوفیانہ شاعری کا وہ سلسلہ جو میاں ہدایت اللہؒ پر ختم ہوتا نظر آتا تھا، ایک لمبے وقفے کے بعد بشریٰ اعجاز کے کلام کی صورت میں پھر سے جاری ہو گیا ہے۔ بشریٰ اعجاز اپنے پہلے ہی مجموعے سے نا صرف ادبی حلقوں میں اپنی اہمیت منوا چکی ہیں بلکہ عوام میں بھی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں پنجابی شعری مجموعے کے علاوہ بشریٰ اعجاز کے اردو افسانوں کا مجموعہ ''بارہ آنے کی عورت'' اور سفرنامہ ''حجاز'' بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

چٹان: ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیسے کیا؟

بشریٰ اعجاز: میں نے باقاعدہ لکھنے کا آغاز ۱۹۹۱ء میں کیا ۱۹۹۴ء میں میرا پہلا پنجابی شاعری مجموعہ ''پبھاں بھار'' شائع ہوا جس کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی جس سے مجھ میں لکھنے کا مزید حوصلہ پیدا ہوا لیکن اس سے پہلے ''عرض حال'' کے عنوان سے میرا سفرنامہ حجاز شائع ہو چکا تھا ''پبھاں بھار'' کے فوراً بعد میرا اردو افسانوں کا مجموعہ ''بارہ آنے کی عورت'' شائع ہوا تھا۔

چٹان: نثری شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کیا آپ اسے شاعری سمجھتی ہیں؟

بشریٰ اعجاز: نثری نظم کے حق اور مخالفت میں کافی کچھ کہا جا چکا ہے اور اب بھی یہ بحث زور وشور سے جاری ہے اس بحث سے قطع نظر کہ نثری شاعری کا مستقبل کیا ہے میں ذاتی طور پر نثری شاعری کو پسند کرتی ہوں میں سمجھتی ہوں کہ بعض اوقات ایسا خیال آجاتا ہے جو شاعری کی مروجہ پابندیوں کے اندر شاعر کی گرفت میں نہیں آتا ایسی صورت میں نثری شاعری بہترین ذریعہ اظہار ہے۔ شروع میں، میں نثری شاعری بالکل نہیں کرتی تھی لیکن پچھلے دنوں میں چند نثری نظمیں کہی ہیں جو سننے والوں نے کافی پسند کی ہیں۔

چٹان: ڈش اور انٹرنیٹ کے دور میں کتاب کا کیا مستقبل ہے؟

بشریٰ اعجاز: بہت برا مستقبل ہے۔ نئی نسل الیکٹرانک میڈیا کی دیوانی ہے جس کی وجہ سے کتابوں سے دور ہوتی جارہی ہے حال یہ ہے کہ تیرہ کروڑ سے زائد آبادی والے ملک میں اچھی سے اچھی کتاب گیارہ سو سے زیادہ نہیں چھپتی ہمارے بچپن میں کتاب کا بہت اہم رول تھا بلکہ ہماری عیاشی ہی یہی ہوتی تھی کہ اپنے جیب خرچ سے غیر نصابی کتابیں خرید کر پڑھتے

تھے اب صورت حال مکمل تبدیل ہوگئی ہے نئی نسل کتاب کی بجائے الیکٹرانک میڈیا میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے، رہی سہی کسر رنگ برنگ فیشن میگزین پوری کر دیتے ہیں جن کی موجودگی میں بغیر رنگوں اور تصویروں کے سادہ لفظوں کی کتابیں بور لگتی ہیں۔

چٹان: آپ کے خیال میں نئی نسل کو کتاب کی جانب کیسے راغب کیا جاسکتا ہے؟

بشریٰ اعجاز: میرے خیال میں تو سب سے پہلے ہمیں گھریلو سطح پر بچوں کو کتاب کی اہمیت کے بارے میں بتانا ہوگا۔ اس کے بعد کوشش کرنی چاہیے کہ ہر محلے سکول اور کالج کی سطح پر لائبریریاں بنیں اس کے برعکس صورتحال یہ ہے کہ ہزاروں گھروں پر مشتمل یہ علاقہ (ڈیفنس سوسائٹی) جس میں ہم بیٹھے ہیں اس میں ایک بھی لائبریری نہیں ہے۔

چٹان: شاعری میں آپ کس سے متاثر ہیں؟

بشریٰ اعجاز: مختلف ادوار میں مختلف شعراء کو پسند کیا ہے ویسے بھی میرے نزدیک اہمیت شعر کی ہے شاعر کی نہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں اس بات سے قطع نظر کہ شعر کس شاعر کا ہے اچھے شعر پر داد دیتی ہوں لیکن مجموعی طور پر جن شاعروں نے مجھ پر اثر چھوڑا ہے وہ فیض احمد فیض، مصطفیٰ زیدی، ن م راشد اور احمد فراز ہیں۔

چٹان: نئے لکھنے والوں میں سے کن لوگوں نے متاثر کیا؟

بشریٰ اعجاز: نئے لکھنے والے بہت اچھا لکھ رہے ہیں خاص طور پر مضافات میں بہت اچھی شاعری ہو رہی ہے مجھے سب کے نام تو یاد نہیں لیکن جو چیدہ چیدہ نام یاد ہیں ان میں نصیر احمد ناصر، رفیق سندیلوی، علی محمد فرشی اور فرخ یار شامل ہیں۔

چٹان: ادیبوں کے مجموعی کردار سے کہاں تک مطمئن ہیں؟

بشریٰ اعجاز: جس طرح معاشرے میں اچھے برے دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس طرح ادیبوں میں بھی دونوں قسمیں ہیں اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے ادیبوں سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی ہیں ٹھیک ہے ادیب عام آدمی کی نسبت زیادہ حساس زیادہ پڑھا لکھا ہوتا ہے لیکن بہر حال ادیب بھی انسان ہوتا ہے جو غلطی کر سکتا ہے اور ادیب غلطیاں کرتے بھی ہیں لیکن مجموعی حوالے سے ادیبوں کے کردار کے حوالے سے بات کریں تو میں کہوں گی

کہ میں ادیبوں کے مجموعی کردار سے بالکل مطمئن ہوں۔
چٹان: کسی بھی شاعر کی شہرت میں اس کی شخصیت کا عمل دخل کس حد تک ہوتا ہے؟
بشریٰ اعجاز: صرف شخصیت کے بل بوتے پر آپ ادب میں آگے نہیں بڑھ سکتے ابتداء میں آپ کو تھوڑا بہت ایڈوانٹیج تو مل سکتا ہے لیکن آگے جانے کے لئے دوسرے لفظوں میں نام پیدا کرنے کے لئے آپ کی تخلیق ہی کام آئے گی اس حوالے سے کچھ مثالیں ہیں کہ چند لوگوں کو شہرت صرف ان کی پی آر یا شخصیت کی وجہ سے ملی لیکن ان کی شہرت کا یہ عرصہ انتہائی مختصر رہا جونہی یہ لوگ میڈیا سے غائب ہوئے لوگوں نے انہیں بھلا دیا وجہ صرف اس کی یہی تھی کہ بعض لوگوں نے اپنی ساری عمر کے بعد ایک کتاب لکھی اور ادب میں ان کی حیثیت ایک استاد کی بن گئی اس کے مقابلے میں کچھ لوگ دھڑا دھڑ کتابیں چھپوا رہے ہیں مگر انکی ادبی حیثیت صفر ہے کیونکہ معیار کے بجائے مقدار پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔
چٹان: ادب میں سینئر جونیئر کا معیار عمر ہونا چاہئے یا کارکردگی؟
بشریٰ اعجاز: میرے خیال میں تو کارکردگی معیار ہونا چاہیے۔
چٹان: پنجابی زبان میں جو ادب آج کل لکھا جارہا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟
بشریٰ اعجاز: میں سمجھتی ہوں کہ پنجابی زبان میں جو کچھ آج کل لکھا جارہا ہے اس سے کہیں زیادہ اچھا لکھا جاسکتا ہے۔
چٹان: خواتین شاعرات کے حوالے سے آپ سمجھتی ہیں کہ ان کے ساتھ ادبی حلقوں میں امتیازی سلوک ہوتا ہے؟
بشریٰ اعجاز: بالکل ہمارے ادبی حلقوں میں خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک ہورہا ہے جب کہ میں سمجھتی ہوں کہ عورت کو عورت کے خول میں بند کر کے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس کے ٹیلنٹ کو مدنظر رکھنا چاہیے۔
چٹان: پروین شاکر کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے آپ کے نزدیک شاہدہ حسن، فاطمہ حسن نوشی گیلانی، منصورہ احمد، یاسمین حمید، بشریٰ اعجاز اور شہناز مزمل میں سے کون اس خلا کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

بشریٰ اعجاز: جہاں تک پروین شاکر کی شاعری اور شخصیت کا تعلق ہے اس کی اپنی حیثیت تھی اور رہے گی کسی کے جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ اپنی جگہ رہتا ہے نئے آنے والے یا دوسرے لوگ اپنی جگہ تو بنا سکتے ہیں۔لیکن کسی جانے والے کی جگہ پر کریں یہ ممکن نہیں ہے پروین شاکر ایک بڑی شاعرہ تھی اور اس نے شاعری کے لئے جو قربانیاں دی ہیں یہ اسی کی ہمت تھی دوسری خواتین شاعرات شاید ہی ایسی ہمت کا مظاہرہ کر سکیں۔

چٹان: فلمی شاعری کو ادب سمجھتی ہیں؟

بشریٰ اعجاز: آج کل کی فلمی شاعری کو تو ادب نہیں بھی سمجھتی لیکن ایک دور تھا جب فلموں میں اس معیار کے گیت لکھے جاتے تھے کہ بلاشبہ وہ کسی حوالے سے ادبی معیار پر پورے اترتے تھے لیکن اس کے باوجود پتا نہیں کیوں اس فلمی شاعری کو ادب میں شمار نہیں کیا جاتا جبکہ آج کل کتابوں میں ادب کے نام پر دھڑا دھڑ جو کچھ چھپ رہا ہے اس کو ادب کہا جاتا ہے میں سمجھتی ہوں کہ یہ سراسر زیادتی ہے اور اس دوہرے معیار کو ختم ہونا چاہیے۔

چٹان: اگر آپ کو کسی جانب سے آفر ہو تو آپ فلموں کے لئے گیت لکھیں گی؟

بشریٰ اعجاز: بالکل لکھوں گی لیکن اس شرط پر کہ فلم کی کہانی معیاری ہو۔

چٹان: آپ کی نئی آنے والی کتابیں کونسی ہیں اور کب آرہی ہیں۔

بشریٰ اعجاز: عنقریب میری دو کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں ان میں سے ایک ''بھلیکھا'' کے نام سے پنجابی شعری مجموعہ ہے جبکہ دوسرا انڈیا کا سفرنامہ ہے۔

جاوید شاہین

○ مرے ہوئے گھوڑے کو آپ جتنے مرضی چابک ماریں وہ آگے نہیں بڑھے گا۔
○ اقبال کے بعد اگر کسی کا دور ہے تو وہ فیض کا دور ہے۔
○ اُس زمانے کی شعری حسیات اور موجودہ زمانے کی شعری حسیات میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے۔

ارژنگ: سوسائٹی میں بہت سے لوگ جو کام کرتے ہیں مثلاً کوئی جنرل بن جاتا ہے۔ کوئی کسی ادارے کا سربراہ بن جاتا ہے۔ آپ ایک شاعر ہیں۔ آپ اس حوالے سے کیا محسوس کرتے ہیں کہ آپ کسی قابل فخر شعبے سے وابستہ ہیں یا دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں؟

جاوید شاہین: ایک تخلیقی آدمی ہونا اس میں شاعر، پینٹر، موسیقار ہو یا جو بھی دیگر تخلیقی شعبے میں یہ ایک قدرتی صلاحیت ہے اور یہ لاکھوں لوگوں میں کم کو ملتی ہے۔ پھر اس کے بعد مزید درجہ بندی ہے۔ کوئی اچھا تو کوئی بہت ہی بڑا شاعر ہے۔ اسی طرح موسیقی، مصوری اور جتنے بھی فنون لطیفہ کے شعبے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کسی کو کم اور کسی کو زیادہ نوازتا ہے۔ جن کو زیادہ ملتا ہے وہ نام کماتے ہیں۔ سوچ کی گہرائی ان کو دوسروں سے مختلف کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب اور اقبال کو قدرت نے غیر معمولی صلاحیتیں دیں جس کے سبب اللہ نے ان کو غیر معمولی شہرت اور عزت سے نوازا۔ آپ کے سوال کے جواب میں اگر دیکھیں تو ہمارے ہاں ادیب کی قدر ہے لیکن باہر کے ملکوں بہت زیادہ قدر ہے۔ 1993ء کی بات ہے نیو یارک کے ہوائی اڈے پر میں اور میری بیوی جب ہوائی اڈے سے باہر نکل رہے تھے

ہمارے پاس دو تین بیگ تھے۔ عملے کے ایک آدمی نے تلاشی کی غرض سے ہمیں ایک بیگ کھولنے کو کہا۔ تلاشی کے دوران اتفاق سے میری ایک کتاب جس پر میری تصویر بھی تھی کپڑوں کے اُوپر ہی رکھی تھی۔ اسے پتا چلا کہ میرا لکھنے سے تعلق ہے تو اس نے تلاشی موقوف کر کے ہم سے معذرت کی اور ہمارے ساتھ بڑی عزت سے پیش آیا۔ وہ کہنے لگا آپ ایک لکھاری ہیں۔ ہم آپ کی تلاشی نہیں لے سکتے۔ ایک اجنبی ملک کے اس آدمی کے رویے نے جو کہ ہماری زبان سے بھی واقف نہیں تھا مجھے بڑا متاثر کیا۔ اس وقت مجھے خود پر بڑا فخر محسوس ہوا کہ میں واقعی ایک باعزت شعبے سے منسلک ہوں۔

ارژنگ: ہم دیکھتے ہیں کہ بیرونِ ملک میں ہمارا پاسپورٹ دیکھ کر ہمیں ایک الگ لائن میں کھڑا کر دیا جاتا ہے لیکن پاکستانی پاسپورٹ کے باوجود انہوں نے بطور شاعر آپ کو خصوصی عزت دی؟

جاوید شاہین: جی بالکل۔ انہوں نے یہ کہا کہ پاکستانی بھی اگر تخلیق کار ہے تو وہ اس عزت کا مستحق ہے۔

ارژنگ: ہمارے ہاں ادیبوں کے حوالے سے عوام میں ایسا رویہ کیوں پیدا نہیں ہو سکا؟

جاوید شاہین: ہمارا کلچر یورپ اور امریکہ کے کلچر سے مختلف ہے۔ آپ کے ادیبوں میں حسد ہے۔ حالانکہ تخلیقی آدمی ہیں لیکن ان کے ہاں میں نے اتنا حسد دیکھا ہے کہ کیا بتاؤں۔ ہمارے ہاں بالکل مختلف شعری فضا ہے اس لیے ہمارے ہاں گروہ بندیاں ہیں۔ اگر کوئی پرچہ نکالتا ہے تو وہ سب سے پہلے خود کو پراجیکٹ کرے گا۔ پھر اس کے گرد جو دوست یا حواری اکٹھے ہوتے ہیں ان کی پروجیکشن کرے گا یعنی ہمارے ہاں اکثریت ایسے ادیبوں کی ہے جو آگے بڑھنے کے لیے جینوئن طریقوں یا تخلیقی صلاحیتوں کی بجائے بے ساکھیوں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ ادبی گروہ بندیاں نظریات کی بجائے مفادات اور شخصی اختلافات کی بنیاد پر قائم ہیں اور ان کا مقصد ایک دوسرے کو اُبھارنا اور مخالفین کو نیچا دکھانا ہے۔ ایسے ماحول میں غیر جانب دار ادیب کے لیے آگے بڑھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

ارژنگ: سوال یہ ہے کہ عوامی سطح پر ہمارے ادیب کو وہ عزت اور مقبولیت کیوں نہیں مل سکی

جس کا کہ ابھی آپ نے امریکہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے؟

جاوید شاہین: ہمارے ہاں بھی ہے۔فیض ہیں، احمد ندیم قاسمی، جاوید شاہین، منیر نیازی، پروین شاکر، ظفر اقبال، کشور ناہید وغیرہ۔ ان کو عوامی سطح پر بھی ایک پذیرائی ملی۔ فیض صاحب کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی اہمیت، عزت اور شہرت ملی۔ ایک دفعہ فیض صاحب کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ان کے جہاز کو کلکتہ میں تین گھنٹے رُکنا تھا۔ وہاں کے وزیرِاعلیٰ کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہاں خود گیا اور بصد اصرار اور پورے عزت واحترام سے فیض صاحب کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

ارژنگ: غالباً ایک دہائی پہلے شاعر فلم، افسانے کا ہیرو تھا۔لوگ اس سے آٹوگراف لیتے تھے۔مگر فی زمانہ یہ رویہ دیکھنے میں نہیں آ رہا؟

جاوید شاہین: اس میں یہ ہوا کہ 90ء کی دہائی میں جو سیاست تھی وہ آپ پر حاوی رہی، لوگوں کی ترجیحات بدل رہی ہیں۔فکرِ معاش سب اعصاب پر سوار ہے۔ ہمارے زمانے میں یہ فکریں نہیں تھیں جیسی اب ہیں۔ اس سے ایک فرسٹریشن پیدا ہوگئی ہے۔لوگوں کی توجہ فنونِ لطیفہ سے ہٹ کر اپنے مسائل پر مرکوز ہوگئی ہے۔ خاص طور پر فکرِ معاش پر 70،80 کی دہائی میں جب ہم لوگ غزل لکھتے تو لوگوں کو سنانے کے لیے باقاعدہ ٹی ہاؤس میں انتظار کرتے تھے۔

ارژنگ: آپ اکثر اپنی گفتگو میں فیض کا تذکرہ بڑے شعراء کے ساتھ کرتے ہیں۔نئی صدی میں فیض کا بڑا چرچا ہے۔ پچھلے دنوں عطاء الحق قاسمی کے پرچے ''معاصر'' میں احمد ندیم قاسمی صاحب کا فیض کے حوالے سے مضمون چھپا۔اس بارے میں کیا کہیں گے؟

جاوید شاہین: میرے خیال میں احمد ندیم قاسمی بطور انسان بہت اچھے آدمی ہیں۔ جو انہوں نے فیض صاحب کے حوالے سے مضمون لکھا ہے مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس کے پیچھے کیا عوامل تھے کہ ایک خواہ مخواہ کا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ جس سے قاسمی صاحب کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرے خیال میں قاسمی صاحب کو اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے تھا۔ جو آدمی موجود ہی نہیں اس کے متعلق کچھ لکھنا جب کہ وہ جواب نہ دے سکے اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں قاسمی

صاحب نے خود Damage کیا ہے۔

ارژنگ: آپ کے خیال میں قاسمی صاحب نے اپنے مضمون میں کون سی قابل اعتراض بات لکھی ہے؟

جاوید شاہین: یہی کہ چائنا میں محض ایک صحافی کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا گیا۔ جبکہ بطور شاعر اور افسانہ نگار میری حیثیت مسلمہ تھی۔ اب جبکہ یہ وفد وہاں گیا ہی صحافیانہ حیثیت سے تھا تو وہاں ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کا ذکر تو فضول بات تھی۔

ارژنگ: جبکہ اسی وفد میں شامل ایک اور صاحب جن کا اس وقت میرے ذہن میں نام نہیں فیض صاحب نے ان کی دیگر حیثیتوں کا تعارف بڑے اچھے لفظوں میں کروایا۔

جاوید شاہین: یہ فیض صاحب اور ان کا مسئلہ ہے۔ اب فیض صاحب نے قاسمی صاحب کا بطور شاعر ذکر کیوں نہیں کیا۔ وہ جانتے ہیں یہ تنازعہ اب اُٹھا ہے اور قاسمی صاحب نے اُٹھایا ہے۔ اگر قاسمی صاحب اس کو نہ ہی چھیڑتے تو بہتر تھا۔

ارژنگ: اور یہ جو حمید اختر اور چند دیگر احباب نے قاسمی صاحب کے مضمون کے جواب میں لکھا ہے اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

جاوید شاہین: یہ لوگ فیض صاحب کے کافی قریب رہے ہیں مثلاً حمید اختر وغیرہ۔ تو یہ جو انہوں نے جوابی مضامین لکھے ہیں یہ ان کا فطری ردعمل تھا۔

ارژنگ: موجودہ دور میں کون سا شاعر ہے جس سے اس عہد کو منسوب کیا جا سکتا ہے؟

جاوید شاہین: پہلے غالب کا عہد آتا ہے۔ پھر اس کے بعد اقبال کا عہد ہے۔ ابھی اقبال کا عہد ختم نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ پروگریسو حوالے سے اسے فیض کا عہد بھی کہہ سکتے ہیں۔ جس طرح پہلے غالب اور پھر اس کے بعد اقبال نے شاعری میں بالکل نیا ٹرینڈ دیا اسی طرح فیض نے بھی ایک نئی ٹائپ کو لے کے غم دوراں کی اور عوام کی بات کی۔ اقبال کے بعد اگر کسی کا دور ہے تو وہ فیض کا دور ہے۔ حالانکہ فیض ایک مشکل پسند شاعر تھا۔ اس کی ڈکشن عربی اور فارسی ترکیبوں پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود فیض نے ایک نیا سبجیکٹ دیا۔ فیض کے اسلوب میں نغمگی اور رومانیت ہے۔ اس کے ہاں عوام کی بات کرنے کے ساتھ جو

رومانیت ہے وہ اسے بڑا شاعر بناتی ہے۔ مثلاً ''تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے''
ارژنگ: فیض کی ڈکشن کے حوالے سے آپ نے جن خوبیوں کا ذکر کیا ہے یہ تو فیض سے پہلے بھی ہمیں چند شعراء کے ہاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً عربی اور فارسی ترکیبوں کا استعمال اور غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی بات۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ فیض کی اپنی شخصیت اور ایک مخصوص نظریے سے ان کی وابستگی تھی۔ اس کی بنیاد پر فیض کو بڑا شاعر بنا دیا گیا؟
جاوید شاہین: دیکھئے جب آپ نظریاتی شاعری کرتے ہیں تو ایک خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں نعرہ بن جائے جیسے علی سردار جعفری اور بہت سے دیگر شاعر اس لپیٹ میں آ گئے۔ فیض کی شاعری کی خوبی یہی ہے کہ یہ ایک نظریاتی شاعری ہے لیکن انہوں نے اس کو نعرہ نہیں بننے دیا۔ ان کے ہاں محبت کی ایک مٹھاس اور ہلکے غم کی چاشنی ہے جو شاعری کا جزو سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے فیض کے بارے میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک سوڈو رومینٹک شاعر ہیں لیکن فیض کے ہاں قنوطیت کی ایک لہر چلتی ہے جو ہمارے مزاج کے مطابق لوگوں کو پسند آتی ہے۔ ایسی شاعری جس میں یاس اور رومانیت کی چاشنی ہو لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔ جوش بہت بڑا شاعر تھا لیکن ہمارے ہاں وہ اس لیے نہ چل سکا کہ اس کے ہاں دبدبہ، گھن گرج نظر آتا ہے۔ کیونکہ ہمارے لوگ بنیادی طور پر رومان پسند ہیں۔ فیض صاحب ویسے بھی خوش قسمت تھے۔ انہیں اچھے دوست مل گئے۔ تاثیر تھے جنہوں نے فیض کی پروجیکشن میں بڑا کردار ادا کیا۔ خود فیض صاحب پڑھے لکھے تھے۔ شخصیت میں دھیما پن تھا جس سے بات کرتے تھے گرویدہ بنا لیتے تھے۔ پھر جس مراعات یافتہ طبقہ سے ان کا تعلق تھا اس کا بھی انہیں ایڈوانٹیج ملا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ٹیلنٹ ضروری چیز ہے۔ مرے ہوئے گھوڑے کو آپ جتنے مرضی چابک ماریں وہ آگے نہیں بڑھے گا۔
ارژنگ: موجودہ دور میں اگر فیض ہوتے کیا انہیں یہی مقام ملتا؟
جاوید شاہین: میں اس صورت حال پر جس میں فیض صاحب موجود نہیں ہیں، بات کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ جہاں تک روس کی ٹوٹ پھوٹ کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ روس میں سوشلزم ناکام نہیں ہوا۔ سٹالن اور بیوروکریسی ناکام ہوئے ہیں ورنہ روس کی ان ریاستوں

میں جہاں لٹیرے تھے، جاہلیت تھی، وہاں کپاس، تیل اور دیگر ضروریات زندگی کی فراوانی اور لٹریسی ریٹ 100% تک پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔

ارژنگ: جب آپ نے لکھنا شروع کیا تو آپ کس سے متاثر تھے؟

جاوید شاہین: شروع میں فراق گورکھپوری چوتھی دہائی 48، 49 اور 50 میں ان کا بہت ڈنکا تھا۔ پھر فیض تھے، راشد تھے، جگر مرادآبادی اور سیماب اکبرآبادی تھے۔ یہ لوگ اس وقت شاعری کے اُفق پر چھائے تھے۔ جگر مرادآبادی کی ایک غزل چالیس چالیس اخباروں میں چھپتی تھی۔ فیض کی غزل ''وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے'' کی دھوم تھی۔ ہم نے انہی لوگوں کو پڑھا، ہمارے سینئر بھی انہی لوگوں کے قائل تھے۔ فیض صاحب کی نقش فریادی اور راشد کی ''ماورا'' کی ان دنوں بڑی دُھوم تھی۔

ارژنگ: آج کی شعری فضا اور اس زمانے کی شعری فضا میں کیا بنیادی فرق محسوس کرتے ہیں؟

جاوید شاہین: اس زمانے کی شعری حسیات اور موجودہ دور کی شعری حسیات میں بہت فرق پیدا ہو چکا ہے۔ اس فرق کو سب سے پہلے ناصر کاظمی نے واضح کیا۔ ان کی شاعری بالکل نئے طرزِ احساس کی شاعری تھی۔ پھر مجید امجد اور منیر نیازی ہیں جن کی شاعری میں اس زمانے کے مضامین اور موجودہ زمانے کے مضامین ہیں جن میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ عدم، اختر مجاز بڑے شاعر تھے لیکن آج کے زمانے میں ان کا کوئی حوالہ نظر نہیں آتا۔ آج کا شاعر لفظوں اور اصلاحات کا استعمال نئے طریقے سے کرتا ہے بجائے اس کے کہ وہ پرانی زبان اور اصلاحات میں اُلجھا رہے۔ اس نے ایک نئی شعری زبان تخلیق کر لی ہے۔

اژنگ: شعری ضروریات کے تحت زبان میں اس تبدیلی کے حوالے سے آپ ظفر اقبال کو کہاں رکھیں گے؟

جاوید شاہین: ظفر اقبال ایک کمال کا شاعر تھا۔ اس کی پہلی کتاب ''آبِ رواں'' ہے۔ اس میں اس کی شعری اسلوب، طرزِ احساس اور بات کا طریقہ اس میں ایک تازگی تھی۔ اس کے بعد ''گلفتاب'' آئی جس میں نہ جانے افتخار، جالب اور یہ جو گروپ ہے۔ جو زبان کو خواہ مخواہ توڑنے پر کمربستہ ہیں۔ یہ جو ایک نئی لسانیات تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ ظفر اقبال ان

کے ہتھے چڑھ گئے اور کتاب گلفتاب لکھ ماری۔ حالانکہ ''گل آفتاب'' آپ سیدھا لکھ دیں۔ جب ان کا شعری مجموعہ آیا تو صاف نظر آتا تھا کہ یہ سب کچھ انہوں نے شعری ضروریات کے تحت نہیں بلکہ دانستہ زبان کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کی ہے۔اب انہوں نے اسی کتاب کو سیدھی زبان میں لکھ کر چھپوا لیا ہے۔اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ انہوں نے ایک مصنوعی تجربہ کیا تھا جس میں سراسر ناکام رہے۔

ارژنگ: آپ کے بعد نظم اور غزل میں ایک دو نسلیں منظرعام پر آئی ہیں۔آپ کے بعد کون سے ایسے لوگ ہیں جن سے آپ اچھی توقعات رکھتے ہیں، خاص طور پر غزل کے حوالے سے؟

جاوید شاہین: ہمارے بعد کی نسل میں بعض لوگ بڑا اچھا لکھ رہے ہیں۔جیسے جلیل عالی، حلیم قریشی، علی محمد فرشی، عباس تابش، جواز جعفری، اختر شمار، مقصود وفا، اشرف یوسفی، عذرا عباس اور کچھ کے نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔یہ ایسے لوگ ہیں جن کی غزل میں واقعی جان ہے۔

ارژنگ: اور یہ جو شاہد آفریدی ٹائپ دھڑ ادھڑ کھیلنے والے ''ہارڈ ہٹر'' قسم کے شاعر ہیں؟

جاوید شاہین: نہیں۔یہ میری لسٹ میں شامل نہیں ہیں۔یہ شوبز کے لوگ ہیں۔جو آدمی صرف شہرت کے لیے کام کرتا ہے اس کی زندگی بڑی تھوڑی ہوتی ہے۔اس کی مثال ایک سراب کی سی ہے جس سے کسی کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ مجھے لکھتے ہوئے تقریباً پچاس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔یہ میری لگن ہے۔میں صرف اپنے لیے لکھتا ہوں۔یہ نہیں کہ کاتا اور لے دوڑی غزل لکھ کے جب تک دس آدمیوں کو سنا نہ لوں میری تسلی نہیں ہوتی۔

ارژنگ: ''میرے ماہ وسال'' آپ کی یادداشتیں ہیں۔اس حوالے سے ادبی حلقوں میں بڑی ہلچل رہی۔بہت ردعمل سامنے آئے۔ایک طبقے نے کہا یہ چونکانے کی کوشش کے علاوہ کچھ نہیں۔آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

جاوید شاہین: یہی میری طبیعت میں ہی نہیں ہے کہ صرف چونکانے کے لیے لکھوں۔بنیادی طور پر میں ایک تنہائی پسند انسان ہوں۔میرے پاس کچھ باتیں کہنے کی تھیں جو مجھے ترغیب دیتی تھیں کہ میں ان کو ریکارڈ پر لاؤں۔میری زندگی میں میرے دوستوں کے حوالے سے

کچھ واقعات تھے۔ پھر اپنے دوستوں اور خاندان جن سے میرا قریبی تعلق تھا، میں ان کے بارے میں لکھنا چاہتا تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ یادداشتیں میرے ساتھ ہی دفن ہو جائیں۔ جب آپ لکھتے ہیں تو اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہوتا کہ آپ اپنی زندگی کو نمایاں کریں۔ ہر آدمی کی زندگی میں اچھے برے واقعات ہوتے ہیں۔ آدمی فرشتہ تو نہیں کہ اس سے غلطی نہ ہو۔ میں نے ان باتوں کو ایمانداری سے بیان کیا ہے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اس نے اپنے ماں باپ، دوستوں اور بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ بھئی! بندہ تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کرے اور خامیاں چھوڑ دے تو پھر بھلا کیا بات ہوئی۔ سچ تو دونوں پہلو سامنے رکھ کر ہی بیان کیا جاسکتا ہے جو میرے نزدیک سچ ہے میں نے بیان کر دیا۔ اب تک میرے بیان کردہ واقعات کو کسی نے جھٹلایا تو نہیں بس وہ یہ کہتے ہیں کہ بعض باتوں کو چھپانا ہی بہتر ہے۔

ارژنگ: کون کون سے لوگ آپ سے ناراض ہوئے؟

جاوید شاہین: زاہد ڈار، منیر نیازی اور کشور ناہید خاص طور پر مجھ سے ناراض ہوئے۔

ارژنگ: انتظار حسین کے بارے میں بھی آپ نے کچھ لکھا؟

جاوید شاہین: انتظار اپنے بارے میں کچھ بتاتا ہی نہیں۔ وہ ایک بند شخصیت ہے۔ وہ بڑا محتاط انسان ہے۔ وہ دوستوں کے متعلق رائے دینے سے بھی گریز کرتا ہے۔

ارژنگ: منیر نیازی کے بارے میں آپ نے کیا لکھا؟

جاوید شاہین: ان سے میرے تعلقات بڑی مشکل سے ٹھیک ہوئے۔ آپ کیوں دوبارہ ہماری لڑائی کروانا چاہتے ہیں۔

ارژنگ: آپ یہ محتاط تبصرہ اس لیے کر رہے ہیں غالباً اب آپ نے تنہائی سے بڑا کچھ سیکھا ہے۔

جاوید شاہین: آپ کہہ سکتے ہیں۔ دراصل میں نے اپنی یادداشتیں یورپ کی طرز پر لکھی تھیں جیسے یورپ میں لوگ آٹو بائیوگرافی لکھتے ہیں۔ وہاں اگر آٹو بائیوگرافی میں سات آٹھ فی صد جھوٹ بھی بول دیا جائے تو جائز ہے۔ ہمارے ہاں یہ روایت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کچھ اخلاقی قدروں کی پابندی ہے۔ ہمارے ہاں پردہ ڈالنے کی پابندی ہے جس کا میں نے کچھ لحاظ نہیں کیا۔ اس وجہ سے ناراضگیاں ہوئیں تو یہ ایک فطری ردعمل ہے۔

ارژنگ: سنا ہے کشور ناہید صاحبہ سے آپ کی صلح ہو گئی ہے۔غالباً آپ کے اور ان کے درمیان کچھ معاملات طے پا گئے ہیں؟

جاوید شاہین: ہاں اب مجھے احساس ہوا ہے کہ مجھے کچھ باتیں نہیں لکھنا چاہئیں تھیں۔ شاید میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی لکھ گیا تھا۔مگر چونکہ ہماری دوستی پرانی ہے یہ ایسے تو ختم نہیں ہو سکتی۔اب ہمارے تعلقات معمول پر آ گئے ہیں۔جو ''ماہ وسال'' کی اشاعت سے پہلے تھے۔

ارژنگ: کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ نے اپنا مؤقف تبدیل کر دیا ہو؟

جاوید شاہین: ہرگز نہیں۔یہ ساری باتیں تو ریکارڈ پر ہیں اور میں اب بھی اس مؤقف پر قائم ہوں کہ وہ ساری باتیں ٹھیک ہیں۔اس میں سے کسی نے کوئی غلط یا جھوٹ کو پوائنٹ آؤٹ نہیں کیا۔بس ان کو اعتراض تھا کہ بعض باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔

جواز جعفری

○ میرے نظامِ فکر میں کاسموس ایک بنیادی سوال ہے۔
○ ادبی ہیجڑے جنہیں غزل نے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا نثری نظم تو اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔
○ آج کے غزل گو شعراء کے ہاں مطالعے کا شدید فقدان ہے۔

جواز جعفری اردو غزل اور نظم کے ممتاز شاعر ہیں شاعری کے علاوہ کالم اور ڈرامہ بھی ان کا حوالہ ہے ان کے کئی سیریلز پی ٹی وی اور پرائیویٹ چینلز سے آن ائیر جا چکے ہیں ۔ان کے دو شعری مجموعے ''دہلیز پر آنکھیں'' اور ''مٹھی میں تیرا وعدہ'' چھپ کر نقادانِ فن سے تحسین حاصل کر چکے ہیں ۔خاص طور پر دوسرے شعری مجموعے کو ظفر اقبال جیسے شاعر نے نئی شاعری کا سمت نما قرار دیا ہے۔ جواز جعفری روایتی اور فرسودہ نظریہء شعر پر کاری ضربیں لگاتے ہیں انہوں نے اپنی شاعری میں انسان اا ور کائنات کے حوالے سے اہم تین سوالوں کو موضوع بنایا ہے۔ان کے خطوط کا مجموعہ ''اِک ہجر جو ہم کو لاحق ہے'' کو بے حد پذیرائی ملی اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔غزل کے بعد جواز جعفری نثری نظم کی طرف آئے تو اسے نئے ذائقوں اور جہتوں سے آشنا کیا، آجکل جنگ کے خلاف ان کی نظموں کا بڑا چرچا ہے۔۔۔ ''موت کا ہاتھ کلائی پر ہے'' ان کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں اردو شاعری میں پہلی بار کسی شاعر نے جنگ کو اتنے بڑے سکیل پر شاعری کا موضو

ع بنایا ہے اردو شاعری میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے۔ ان کا ایک اور حوالہ تنقید اور تحقیق ہے اقبال ساجد کا پہلا مجموعہ ''اثاثہ'' اور بعدازاں کلیات اقبال ساجد مرتب کئے ہیں اور ادب میں نئے مباحث کو جنم دیا۔ جواز جعفری لبرل، آزادی پسند اور صاف گو شاعر ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے استاد ہیں اور ایم اے او کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ ان دنوں اردو ادب یورپ اور امریکہ میں کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔

ارژنگ: آجکل جنگ کے خلاف آپ کی نظموں کا بڑا چرچا ہے یہ خیال کیسے آیا کیا پرویز مشرف اور واجپائی ملاقات سے تحریک ملی؟

جواز جعفری: جنگ کا تعلق کسی ایک ملک یا معاشرے سے نہیں دنیا کا شاید ہی کوئی خوش قسمت ملک ایسا ہے جو اندرونی اور بیرونی تشدد کی لپیٹ میں نہ ہو؟ جنگ ہمیشہ سے انسان کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔ انسان کی مذہبی اور سیاسی تاریخ خون کے چھینٹوں سے لبریز ہے۔ ابھی پچھلی صدی میں دو عالمی جنگوں کے علاوہ خلیج کی جنگ ہمارے سامنے ہے۔ علاوہ ازیں افریقہ، ایشیا حتیٰ کہ یورپ میں بھی انسان جنگ سے محفوظ نہیں۔ اگر ہم اپنے خطے پر نظر ڈالیں تو اس وقت جنوبی ایشیا بھی بارود کے ڈھیر پر کھڑا ہے، جنگ کی معمولی سی چنگاری روایتی جنگ کو ایٹمی جنگ میں بدل سکتی ہے اور پلک جھپکنے میں انسانوں کیا صدیوں کی تہذیبی کاوشیں اور حاصلات راکھ کے ڈھیر میں بدل جائیں گے۔ یہی وہ مقامی اور عالمی منظر نامہ ہے جس نے مجھے بڑی شدت سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے گذشتہ چھ سات سالوں کے دوران صرف جنگ کے خلاف لکھا ہے کیونکہ میرے خیال میں جنگ کی تباہ کاریوں پر لکھنے کے بجائے ادیب کو جنگ کے خلاف لکھنا چاہیے۔ میں ہر طرح کی روایتی اور غیر روایتی جنگ کے خلاف ہوں بے شک میری فتح ہی کیوں نہ ہو؟

ارژنگ: کیا آپ کے علاوہ بھی لکھنے والوں نے اس موضوع کی طرف توجہ دی ہے؟

جواز جعفری: دنیا بھر میں تخلیقی آدمی روایتی طور پر جنگ کا مخالف اور امن کا حلیف تصور کیا جاتا ہے اور عالمی لٹریچر میں جنگ کے خلاف اعلیٰ پائے کا ادب موجود ہے۔ جہاں تک اردو اد

ب کا تعلق ہے ہمارے ہاں بھی بعض اہل قلم نے اس کی طرف توجہ دی ہے مگر جنگ کا سوال جس قدر اہم اور بھیانک ہے اسے اتنی شدت اور ذمہ داری سے ہمارے ادب میں جگہ نہیں دی گئی۔ لکھنے والوں کی اکثریت کو تو اس سوال نے سرے سے اپنی طرف متوجہ ہی نہیں کیا۔ وہ غیر اہم اور غیر متعلق موضوعات پر پچاس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ایسے پاپولر لکھنے والوں نے قارئین کو مایوسی، تنہائی اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں دیا، جب موت اربوں انسانوں کی شہ رگ کے قریب چہل قدمی کر رہی ہو تو ایسے میں لب و رخسار کی بات کیسے ہو سکتی ہے؟ ہمارے بیشتر اہل قلم کسی اور عہد میں زندہ ہیں انہیں اپنے آس پاس ہونے والی جغرافیائی، سماجی، معاشی سیاسی اور کلچرل تبدیلیوں کا سرے سے شعور ہی نہیں ہے۔ یا پھر شاید ہمارا لکھنے والا موت اور اسلحہ فروشوں کے ساتھ ساز باز کر چکا ہے؟ وہ بیچارہ خود حالت جنگ میں ہے اور یہ جنگ اپنے اپنے مفادات کی ہے اکثر ادیبوں نے اپنی توپوں کے رخ ایک دوسرے کی ماؤں بہنوں کی طرف کر رکھے ہیں، ادیبوں کی باہم لڑائیوں کے نتیجے میں ادیب کی ماں بہن ہونا خطرے سے خالی نہیں رہا۔ بہر حال بات ذرا اور طرف چلی گئی بطور ادیب ہمارا فرض ہے کہ ہم جنگ کو ٹالنے اور امن کے قیام کے لیے جدوجہد کریں اور لوگوں کے اندر جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کے حوالے سے شعور پیدا کریں۔ جنگ کے خلاف میری نظموں کا مجموعہ ''موت کا ہاتھ کلائی پر ہے'' عنقریب منظر عام پر آرہا ہے جو کم از کم ہمارے ادب میں پہلا شعری تجربہ ہے۔ میں نے ڈوبتے ہوئے جزیرے پر اپنے حصے کی مٹی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

ارژنگ: آپ نے اپنی شاعری میں کن سوالوں کو زیادہ اہمیت دی ہے؟

جواز جعفری: میرا تعلق ادیبوں کے اس گروہ سے نہیں ہے جو قافیے کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں جن کے مضامین کا تعین قافیہ کرتا ہے یہ بات دراصل کسی بھی شخص کے کمزور شاعر ہونے کی دلیل ہے، قادر الکلام شاعر کی راہ میں قافیہ کبھی رکاوٹ نہیں بنتا۔ میں ذاتی طور پر غزل کی تنگ دامانی کا گلہ بھی نہیں کرتا۔ اور بطور شاعر مجھے اچھی طرح علم ہے کہ مجھے کیا کہنا ہے یا مجھے کیا کہنا چاہیے؟ حیات و کائنات کے حوالے سے بکھرے ہوئے لاکھوں

سوالوں میں سے میں اپنے طور پر اہم ترین سوالوں کو منتخب کرتا ہوں اور اپنی شاعری میں انہی سوالوں کو اٹھاتا ہوں۔ ان سوالوں میں دلچسپی ہی میرے نظریہ فن کا تعین کرتی ہے میرے دوست اور پسندیدہ شاعر ظفر اقبال غزل کو محض مصرعہ سازی قرار دیتے ہیں مگر یہ تو محض کرافٹ مین شپ ہے اصل چیز تو آپ کے وہ خیالات یا نظام فکر ہے جو آپ زبان کے ذریعے یا مصرعوں کی مدد سے دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس اعلیٰ خیالات ہی نہیں ہیں تو آپ محض اعلیٰ درجے کی مصرعہ سازی کر کے کیا تیر ماریں گے؟ جہاں تک میرے موضوعات کا تعلق ہے میں نے کائنات کی تخلیق، اسکے کام کرنے کے طریق کار، کہکشاؤں کی تشکیل، زمین پر زندگی کا آغاز اور کائنات کے انجام جیسے اہم ترین سوالوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ علاوہ ازیں دنیا کے گلوبل ولیج بن جانے کے بعد اب شاعر کا مخاطب کسی ایک زبان کے خطے کے لوگ نہیں رہے اس لیے اب اس کا مقابلہ بھی دنیا بھر کی زبانوں کے لٹریچر سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایسے مسائل سے دلچسپی کا اظہار کیا ہے جو دنیا بھر کے انسانوں کو یکساں طور پر درپیش ہیں جیسے جنگ، بھوک، بیماری، ہجرت، بے روزگاری، آلودگی، جہالت، بے گھری اور اس قسم کے دوسرے مسائل کے بارے میں بڑے تواتر کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔

ارژنگ: جواز صاحب آپ کی شاعری میں خصوصاً ''مٹھی میں تیرا وعدہ'' کی شاعری میں ایک بدلا ہوا تصور کائنات نظر آتا ہے، اس حوالے سے کچھ بتائیں۔

جواز جعفری: کائنات سے آخر اس کا کیا رشتہ ہے؟ کائنات کے ساتھ اپنی ذات کی تطبیق اور تفہیم کے پس منظر میں ہی دیومالا اور مذہب نے جنم لیا۔ ستارے تب بھی کروڑوں نوری سال کے فاصلے پر ہونے کے باوجود اس کی ذات اور سرگرمیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے تھے۔ سورج برفانی عہد میں اسے اپنی حدت سے زندگی بخشتا تھا فصلوں کے پکنے میں مدد دیتا تھا اور آگ کی دریافت سے قبل اندھیرے کی عفریت سے نجات دلاتا تھا اس لیے سورج کو مرکزی دیوتا مان کر اس کے اردگرد اک پورا نظام تشکیل دیا گیا اور یوں صابئیت یعنی ستارہ پرستی کے عظیم مذہب کا آغاز ہوا۔ اسی طرح برفانی عہد میں آگ کی دریافت بھی ایک عظیم

نعمت سے کم نہیں تھی لہٰذا آگ کو مرکزی دیوتا بنا کر اس کے گرد بھی ماضی کے ایک عظیم مذہب کے تانے بانے بنے گئے۔ یہ محض ماضی کے انسانوں کی ضعیف الاعتقادی کے قصے نہیں ہیں بلکہ یہ وہ کاوشیں ہیں جو اس کمزور انسان نے اس عظیم کائنات کو سمجھنے کے عمل کے دوران کیں، جس کے روبرو اسے اچانک لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ یہ تو ماضی کی باتیں ہیں مگر آج کا انسان بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح کائنات اور اس کے مظاہر میں مسلسل دلچسپی کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ کائنات کے قفل کو کھولنا چاہتا ہے چاند اور سورج جو کل تک دیوتا تھے۔ آج کا انسان ان دیوتاؤں کے جاہ و جلال کو چیلنج کر رہا ہے، چاند کا راز اس نے فاش کر دیا ہے جبکہ سورج دیوتا کے اسرار جاننے کے لئے کئی مشن بھیجے جا چکے ہیں، انسان ستاروں کے اندر جھانک رہا ہے وہ ان کی پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپے اور موت تک کے عمل کی تشریح کرنے کے قابل ہو گیا تھا، وہ دور پار کے سیاروں پر زندگی شفٹ کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے، وہ اپنی ملکی وے کہکشاں کے علاوہ زمین پر رکھی دوربین سے ایک کھرب کہکشائیں دریافت کر چکا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایک کہکشاں میں ایک ارب سے لے کر پانچ کھرب تک ستارے اور سیارے ہوتے ہیں۔ سائنس نے آج کے شاعر کے سامنے کائنات کے کئی ورق الٹ دیئے ہیں، اب زمین اس کے لئے سودا کی طرح کسی بیل کے سینگ پر رکھی شئے نہیں اور نہ ہی غالب اور اس پیشروؤں کی مانند وہ سات آسمانوں والے نظریے کا قائل ہے۔ وہ پوری حقیقت پسندی کے ساتھ کائنات کا سامنا کر رہا ہے۔ میرے نظام فکر میں کاسموس ایک بنیادی سوال ہے اسی لئے آپ کو میری شاعری میں ایک نیا اور بدلا ہوا تصور کائنات دیکھنے کو ملتا ہے۔

ارژنگ: آپ کا شمار ۱۹۸۰ء کی دہائی کے چند اہم غزل گو نوجوان شعراء میں ہوتا ہے، اتنی اچھی غزل کہتے کہتے اچانک نثری نظم کی طرف کیوں چلے آئے؟

جواز جعفری: آپ کا سوال نہایت اہم ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کے اس سوال کا جواب میری بجائے میری نظم کو دینا چاہیے۔ میں لٹریچر میں لبرل ازم اور آزادی کا قائل ہوں اور ادب میں ہیئت اور موضوعاتی تجربوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میرے سلسلے میں اس بات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں کہ میں نثری نظم کی طرف کیوں آیا؟ بلکہ اصل اہمیت تو

اس بات کی ہونی چاہئے کہ میں نے کیسی نظم لکھی ہے؟ جہاں تک میرے نثری نظم کی طرف آنے کا تعلق ہے میرے نزدیک نظم اور غزل کے مقابلے میں نثری نظم کا مستقبل بہت تابناک ہے یہ ہر طرح کے خیالات کو ویلکم کہتی اور بدلے ہوئے شعری مذاق کی نمائندہ بھی۔ میرے نزدیک ایک فکری اور تخلیقی توانائی سے بھر پور شاعر ہی نثری نظم کے معیار پر اُتر سکتا ہے۔ کمزور اور روایتی ذہن والے شاعر کے لئے نثری نظم اپنی آغوش وانہیں کرتی۔ نثری نظم کہنا ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں اور شاعری میں نثری نظم کے دروازے سے داخل ہونے والے غیر شاعر حضرات بھی غلطی پر ہیں۔ نثری نظم صرف پورا شاعر لکھ سکتا ہے ادبی ہیجڑے جنہیں غزل نے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا نثری نظم تو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ نثری نظم کا ایک اپنا تخلیقی نظام ہے۔ یہاں ردیف قافیے کی پابندی ختم ہوتی ہے تو کئی دوسری پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے غزل کئی کمزور خیال اور زبان کو قبول کر لیتی ہے مگر نثری نظم کا مزاج سمندر جیسا ہے یہ مردہ خیال اور لفظ کو باہر اگل دیتی ہے۔ میرے نثری نظم کی طرف آنے کی ایک وجہ دنیا بھر میں اس کی پذیرائی بھی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اب دنیا سمٹ رہی ہے ثقافتی اور جغرافیائی بیریئر ٹوٹ رہے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے دنیا کو آپ کی ہتھیلی پر لا رکھا ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے اور قریب آنے کی خواہش زور پکڑ رہی ہے۔ ایک دوسرے کو جاننے کے لئے ادب سے زیادہ کیا چیز مفید ہو سکتی ہو؟ اس ضرورت کے تحت ہر زبان ادب کے تراجم ہو رہے ہیں چونکہ نثری نظم کا شاعر مکمل طور پر اپنی فکری اور تخلیقی توانائی پر بھروسہ کرتا ہے اس لیے ترجمہ کرتے ہوئے نثری نظم کے ردیف قافیے آڑے نہیں آتے جبکہ غزل کا سب سے بڑا پرابلم ہی یہی ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے اس کا خوبصورت ہیتی نظام پوری طرح دوسری زبان میں منتقل نہیں ہو پاتا۔ صرف خیال کو ہی منتقل کیا جا سکتا ہے مگر بیشتر غزلوں میں خیال نام کی چیز ہوتی کہاں ہے؟

ارژنگ: آپ کے پسندیدہ شاعر؟

جواز جعفری: غالب، ظفر اقبال اور جاوید شاہین، جاوید شاہین اس لئے بھی مجھے پسند ہے کہ وہ عمر کے اس حصے میں بھی فکری و تخلیقی سطح پر تروتازہ ہے جبکہ اس کے ہمعصروں میں بیشتر لو

گ کب کے تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں بہت سے خود کو دہرا رہے ہیں یا پھر اپنی ہی اردو شاعری کو پنجابی اور انگریزی میں خود ہی منتقل کر کے کتابوں کی تعداد بڑھانے میں مصروف ہیں۔ مگر جاوید شاہین کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہے وہ اس عمر میں بھی میرے ساتھ باقاعدہ واک کرتا ہے روزانہ تازہ شعر کہتا ہے مجھے افسوس ہے کہ گروپ بندی کے شکار ہمارے نقادوں نے اس کی شاعری کی طرف وہ توجہ نہیں دی جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

ارژنگ: آپ کے معاصروں میں کون کون سے شاعر آپ کو اچھے لگتے ہیں؟

جواز جعفری: میرے تمام ہمعصر تخلیقی طور پر توانا ہیں مگر اچھا شعر یا نظم کہنا ان میں سے اکثر کا مسئلہ نہیں رہا۔ اختر شمار ادبی صحافت کی نذر ہو رہا ہے مجھے اس بات کا دکھ ہے، میری خواہش ہے کہ وہ پہلے کی طرح محض خوبصورت شاعری پر توجہ دے۔ اسی طرح عباس تابش کو پبلشنگ نگل رہی ہے۔ حالانکہ وہ زبردست تخلیقی قوت کا مالک ہے میں نے حال ہی میں اس کی تازہ غزلیں سنی ہیں جن سے مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ قمر رضا شہزاد مجھے بہت پسند ہے مگر پتہ نہیں کیوں اس کے دونوں مصرعوں کے درمیان شعری تلازمہ اسرار ہی بنا رہتا ہے۔ اسی طرح اطہر ناسک بھی میرا پسندیدہ شاعر ہے مگر وہ آجکل منظر سے غائب ہے۔ اور گھر سے اردو بازار کے درمیانی سفر میں روزمرہ کی معمولی چیزوں کی نذر ہو رہا ہے۔ مقصود وفا اور بھارت جا بسنے والا آفتاب حسین بھی خوبصورت شعر کہتا ہے، ان کے علاوہ مجھے سعود عثمانی بھی اچھا لگتا ہے میں کبھی کبھار اس کے ہاں اس کی شاعری سننے جاتا ہوں۔ میرے سمیت آج کے غزل گو شعراء کے ہاں مطالعے کا شدید فقدان ہے وہ معلوم سے آگے دیکھنے کے بجائے پہلے سے دریافت شدہ دنیا کو نئے سرے سے دریافت کرنے میں مصروف ہیں۔ کوئی ایک بھی نہیں جو سورج میں دروازہ لگائے یا اس کائنات کے کسی نامعلوم گوشے سے کسی نئی کائنات تک جانے والے راستے کی کھوج لگائے۔

جمشید مسرور

- شاعری دُنیا کا نازک ترین کام ہے۔
- ادب میں زندہ صرف وہی رہتا ہے جس نے کوئی زندہ مصرع کہا ہو۔
- میں نے قصداً شاعری نہیں کی ہے۔

جمشید مسرور کا نام اُردو ادب کے قارئین کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ ان چند پاکستانی شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اُردو کے علاوہ کسی عالمی زبان میں شاعری کی ہو اور وہ شائع بھی یورپ میں ناروے جیسی جگہ سے ہوئی ہو۔ نارویجن سے اُردو میں دولسانی شعری مجموعوں کے علاوہ بھی آپ کی پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ''شاخِ منظر'' اور ''میری خوشبوئیں میرے پھول'' شعری مجموعے ہیں جبکہ دو کتابیں لارس سوبیے اور ارلنگ کٹرسن کے تراجم پر مشتمل ہیں۔ بے شمار عالمی اعزازات حاصل کرنے والے شاعر اور ادیب سے ہونے والی گفتگو بغیر کسی لمبی تمہید کے قارئین کی نذر ہے۔

ارژنگ: آپ ایک طویل عرصے سے ناروے میں اُردو ادب کی ترویج و ترقی کے لے کام کر رہے ہیں۔ ناروے کب اور کیسے پہنچے؟

جمشید مسرور: یہ قصہ تب کا ہے جب آتش جوان تھا۔ جوانی کی اُمنگ تھی۔ بار بار کے مارشل لاز سے تنگ آ گیا تھا۔ مغرب میں صرف مادی اور ٹیکنالوجی ہی نہیں وہاں پر جمہوریت بھی ہے جو کہ میرے نزدیک ایک نعمت ہی نہیں بنیادی انسانی حق بھی ہے۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء نے میرا دل پاکستان سے اُچاٹ کر دیا تھا۔ میں ان دنوں سٹیٹ بنک لاہور

میں کام کرتا تھا۔ میرے بعض دوست ان دنوں باہر چلے گئے تھے اور کچھ جا رہے تھے۔ انہی میں سے ایک دوست جو کوپن ہیگن میں مقیم تھا واپس آیا اور اپنے ساتھ مرسیڈیز گاڑی اور نئی نویلی دُلہن لے کر آ گیا۔ وہی دوست میرے ملک چھوڑنے کا سبب بنا۔ جب وہ واپس کوپن ہیگن جانے لگا تو مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ کچھ دیر میں اُسی دوست کے ہاں ٹھہرا۔ پھر وہاں سے ناروے چلا گیا۔ ناروے میں مجھے ایک بڑی اچھی فیملی کے ساتھ رابطے کا موقع ملا جس نے میری بے انتہا مدد کی اور مجھ سے کہا کہ ناروے میں ہی رُک جاؤں اور میں ٹھہر گیا گو کہ اُس کے بعد بھی پاکستان گیا مگر واپس آ گیا۔ بس تب سے یہیں پر ہوں۔

ارژنگ: شعر کہنا کب شروع کیا؟

جمشید مسرور: بڑی آسانی سے کہہ سکتا ہوں کہ شعر میرے خون میں ہے۔ میرے دادا مولوی پروفیسر مسرور کپورتھلوی بڑے اچھے شاعر تھے۔ آپ صاحب دیوان تھے۔ 1926ء میں آپ کا دیوان ''نوائے رنجور'' کے نام سے شائع ہوا۔ میں آپ کو انکا ایک شعر سناتا ہوں:

نقش اس کا کہیں نہ مٹ جائے
میں رگڑتا نہیں جبین نیاز

والد محترم ڈاکٹر مسرور کپورتھلوی اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر جیسے لوگ ان کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے۔ ان کا دیوان میرے پاس پڑا ہوا ہے مگر ابھی تک چھپوا نہیں سکا۔ انشاء اللہ جیسے ہی فرصت ملتی ہے ضرور چھپواؤں گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے بہت ہی بچپن سے میرا جھکاؤ شاعری کی طرف تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں میں نے پہلا شعر کہا تھا جس پر میرے بہن بھائیوں نے میرا مذاق بھی اُڑایا۔ شعر تو وہ بس ایسے ہی تھا لیکن شعر کے تمام فنی تقاضوں پر پورا اُترتا تھا۔ بہر حال یہ میری شاعرانہ زندگی کی ابتداء تھی۔

ارژنگ: آپ کی اب تک کتنی اور کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں؟

جمشید مسرور: پنجابی شعری مجموعہ تیار ہے۔ مگر ابھی شائع نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ تقریباً

سات کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ زیادہ تر شاعری کی کتب ہیں اور دو منظوم تراجم ہیں جو میں نے نارویجن شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کے اُردو زبان میں کیے ہیں۔ ''لمحوں کے سمندر'' اور ''پچھلے برس کی دھوپ'' کے نام سے میری ذولسانی شاعری کی کتابیں بھی یہاں اوسلو سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ گو کہ شاعری کا آغاز تو بچپن سے ہی کر دیا تھا مگر میری پہلی کتاب چالیس برس کی عمر میں شائع ہوئی۔ یہاں میں بتا تا چلوں کہ ناروے میں کتاب چھپوانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہاں پر پبلشرز مصنف کو سوئی کے ناکے سے گزارتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ جب میری پہلی ذولسانی کتاب شائع ہوئی نارویجن اور اردو زبان میں بیک وقت چھپنے والی میری دوسری کتاب کی اشاعت کے دوران مجھے خیر ''سوئی کے ناکے'' سے انہوں نے نہیں گزارا۔ اس کے علاوہ لارس سوبے اور کرسٹن اور ارلنگ کٹرسن کے تراجم کو بھی لوگوں نے بہت سراہا ہے۔ میں نے حال ہی میں تیرہ نارویجن شعراء کے تراجم کیے ہیں جو کہ جلد ہی کتابی شکل میں شائع ہونے والے ہیں۔

ارژنگ: اس سوال کا جواب کیا دیں گے۔ اگر پوچھا جائے کہ لکھتے کیوں ہیں؟

جمشید مسرور: چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔ مگر خدائی اشارہ تھا۔ میرے اندر سے کوئی چیز آتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی قصداً شاعری نہیں کی ہے۔ جب جب اندر سے آواز آئی ہے۔ تب تب لکھا ہے کچھ ایسی نظمیں ہیں جنہوں نے جگا کر مجھے نصف شب کو خود کو مجھ سے لکھوایا ہے۔ میں نے کبھی خود کو مجبور کر کے شاعری نہیں کی ہے۔

ارژنگ: آپ کی بیگم مرحومہ جو کہ پاکستانی نژاد تھیں، ان کے نام پر اوسلو میں ایک سڑک کا نام رکھا گیا ہے ان کے متعلق کچھ بتائیں گے؟

جمشید مسرور: ان کا نام روبینہ تھا۔ مجھ سے شادی کے بعد روبینہ رانا ہو گئیں۔ وہ بہت ہی ذہین خاتون تھیں۔ بڑے علمی گھرانے میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ ان کے والد اسکواڈرن لیڈر رہتے۔ شادی کے بعد جب وہ میرے پاس آئیں تو سب سے پہلے انہوں نے بڑی سرعت کے ساتھ نارویجن زبان پر عبور حاصل کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے اتنی عمدہ زبان بولنا شروع کر دی کہ سب کو حیران کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے

لیبر پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ پارٹی میں بھی انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں بہت ترقی کی۔ ٹی وی مذاکروں، مباحثوں میں شرکت کی وجہ سے پورے ناروے میں بہت مقبول ہوگئیں۔ آئے دن اخبارات میں ان کے انٹرویو چھپتے تھے۔ روبینہ نے الیگرنٹ وومن کے متعلق ناروے میں پائے جانے والے اس امپریشن کو توڑ ڈالا کہ یہ عورتیں لوکیس گائے بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ وہ بڑے مختصر عرصے میں ناروے کی مقبول ترین رہنما بن گئی تھی۔ انہیں قومی دن کے موقع پر قومی جلوس کی قیادت کے لیے چنا گیا۔ میں بتاتا چلوں کہ یہ دن اور یہ جلوس ناروے میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جلوس کے سربراہ نے قومی اسمبلی کو بھی خطاب کرنا ہوتا ہے اور بادشاہ معظم کو بھی مبارک باد پیش کرنا ہوتی ہے۔

انہی دنوں اوسلو شہر کی ہزارویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر یہاں کا روایتی لباس خصوصی طور پر تیار کروایا گیا تھا۔ اس لباس کو شہر کے سٹی ہال میں پیش کیا جاتا تھا۔ یہ اعزاز بھی روبینہ کو حاصل ہوا کہ اسے اس لباس کو پہننے کے لیے چنا گیا۔ جسے پہن کر نہ صرف وہ سٹی ہال میں گئیں بلکہ ٹی وی پر بھی اس کی لائیو کوریج کی گئی۔ مگر افسوس! جیسا انگریزی میں کہتے ہیں کہ ''جو لوگ خدا کو زیادہ محبوب ہوتے ہیں وہ جوانی میں ہی مر جایا کرتے ہیں'' بچے ابھی بہت چھوٹے تھے میری بیٹی اُس وقت بارہ سال کی تھی جب روبینہ کا انتقال ہوا۔ انہیں جتنی محبت ناروے کے معاشرے سے تھی اس سوسائٹی نے بھی اسی محبت سے ان کی محبت کا جواب دیا۔

اُن کے جنازے میں ملک کی بڑی شخصیات موجود تھیں جن میں ناروے کے موجودہ وزیراعظم بھی شامل ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ایک متفقہ قرارداد کے ذریعے ناروے کی حکومت نے اوسلو کے بالکل مرکز میں ایک سٹریٹ کا نام ''روبینہ رانا سٹریٹ'' رکھ دیا۔ یہ کسی بھی غیر ملکی کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ جب بھی کوئی پاکستانی مہمان آتا ہے تو میزبان انہیں یہ سٹریٹ دکھانے کے لے ضرور لے کر آتے ہیں۔

ارژنگ: ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

جمشید مسرور: میں خوش قسمت آدمی تھا جو بہت اچھا جیون ساتھی ملا۔ انہوں نے کبھی میرے شوقِ سخن میں رُکاوٹ نہیں ڈالی۔ عموماً بیویاں شاعروں کا ناطقہ بند کر دیتی ہیں مگر میری بیوی تو بہت مددگار تھی۔ میں بیس سال تک ''بازگشت'' کے نام سے ادبی پرچہ نکالتا رہا ہوں۔ اس کی تیاری میں بھی وہ میری بہت مدد کیا کرتی تھیں۔ میں مشاعروں کے لیے دوسرے ملکوں میں بھی اکثر جاتا رہتا تھا مگر انہوں نے کبھی نہیں روکا کہ مت جائیں۔ بلکہ کئی دفعہ تو میرے ساتھ ہی شریک سفر ہو گئیں۔

ارژ نگ: شعر و ادب کی خدمت کے علاوہ آپ یہاں سرکاری ملازمت بھی کرتے ہیں؟ اپنے اس کام کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جمشید مسرور: میں یہاں رائل ریسرچ کونسل آف ناروے میں بحیثیت ایگزیکٹو آفیسر کام کر رہا ہوں۔

ارژ نگ: آپ کا یہ ادارہ کیا کام کرتا ہے؟

جمشید مسرور: یہاں پہلے چار پانچ الگ الگ ریسرچ کونسلیں تھیں۔ سائنس، آرٹس، ایگری کلچر وغیرہ جن کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ساری ریسرچ کونسلیں ایک بڑی اور مرکزی ریسرچ کونسل کے بینر تلے جمع ہو چکی ہیں جسے رائل ریسرچ کونسل آف ناروے کہا جاتا ہے۔ ناروے میں جو بھی ریسرچ ہوتی ہے چاہے میڈکل، آرٹ، کلچر یا پھر کسی شعبے سے وابستہ ہو ہمارا دفتر اُسے فنانس کرتا ہے۔

ارژ نگ: ادبی دُنیا میں پائی جانے والی گروہ بندیوں اور دھڑے بندیوں کو آپ کس انداز میں دیکھتے ہیں؟

جمشید مسرور: جب میں لاہور رہتا تھا تو ان گروپ بندیوں سے بڑا تنگ تھا۔ خیر اب مجھے یہ گروہ بندیاں تنگ کرتی ہیں۔ کوئی گروپ ادھر کوئی گروہ ادھر۔ میں تو سب سے ملتا تھا۔ اگر کوئی نہیں ملنا چاہتا تھا تو اس کی اپنی مرضی۔ گروہ بندیوں کا نقصان یہ ہے کہ جب آدمی کسی گروپ میں چلا جاتا ہے تو اس کے ساتھی اسے بڑھاوا دیتے ہیں۔ خواہ وہ اچھا شاعر ہو یا نہ ہو۔ مگر آخر کار ادب میں زندہ وہی رہتا ہے جس نے کوئی زندہ مصرع کہا ہو۔ شاعری کوئی

اداکاری تو ہے نہیں۔ اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ دوست میرے مختلف گروپس اور دھڑوں میں ضرور ہیں مگر میں کسی گروہ میں نہیں ہوں۔ اصل بات تو آپ کا اپنا کام اور تخلیق ہے۔

ارژنگ: آپ کو بے شمار اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جمشید مسرور: پاکستان اور ہندوستان کی کئی غیر سرکاری ادبی تنظیموں کی طرف سے مجھے بہت سارے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ان کی تفصیل میں تو میں نہیں جاتا۔ ہاں! مجھے یہاں ناروے میں حکومت کی طرف سے آرٹس ایوارڈ دیا گیا ہے جو ناروے کا دوسرا سب سے بڑا سرکاری ایوارڈ ہے۔ انگریزی فلم "Identity of soul" میں Henry Ibson کی ایک نظم کو میں نے انگلش میں ترجمہ کیا ہے۔ میرے لیے تو یہ بھی اعزاز ہی ہے۔

ارژنگ: نئے لکھاریوں کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

جمشید مسرور: سب سے پہلے تو نئے لکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر دیکھیں کہ میں شاعر ہوں بھی کہ نہیں۔ کیونکہ شاعری ورزشیں کر کے نہیں ہوتی۔ یہ عطائے خداوندی ہے۔ اگر اندر سے آواز آئے کہ ہاں تو پھر شاعری کے شعبے کو اپنا لیں۔ شاعری کے بھی لوازمات ہوتے ہیں جیسے موسیقی میں دیکھتے ہیں کہ گلوکار سر میں ہے کہ نہیں۔ مصوری میں دیکھتے ہیں کہ پینٹر رنگ کیسے لگاتا ہے۔ شاعری دُنیا کا نازک ترین کام ہے۔ ایک کاغذ اور قلم سے لفظوں کے ذریعے شاعر نے سب کچھ دکھانا ہوتا ہے۔ زمین، آسمان، سائے، منظر۔ اس کے لیے زبان پر مہارت اور پھر مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جہاں تک شاعرات کا تعلق ہے تو وہ آپ بھی جانتے ہیں کہ اکثر بزرگوں کی مہربانی سے ہوتی ہیں۔

حسن عباسی

○ جب شاعری بوڑھی ہو جاتی ہے تو نثر میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔
○ ادب تو مرکز سے دُور دریا کے کنارے بیٹھا کوئی شاعر تخلیق کر رہا ہے۔
○ آج کی غزل میں موضوعات کی بہت یکسانیت ہے۔

س: شعروادب کی طرف رجحان کیسے پیدا ہوا؟ یہ خیال کیسے آیا کہ لکھنا چاہیے۔
ج: بچپن سے ہی تصویریں آنکھوں کے سامنے بنتی بگڑتی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مجھے منظر اپنی طرف بلاتے ہیں۔ درختوں اور پرندوں سے باتیں کیا کرتا تھا۔ رَیت پر ایک نام لکھا کرتا تھا۔ وہ نام بیل بنا اُس پر پھول آئے اور میں شاعر بن گیا۔

لکھا جو تیرا نام کوئی بیل بن گئی
آ جائیں اُس پہ پھول دُعا کر رہا ہوں میں

میری یہ دعا بچپن میں ہی قبول ہوگئی۔

س: آپ کا تعارف ادبی حلقوں میں بطور شاعر رہا ہے۔ شاعری کے حوالے سے آپ اُن چند خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جنہیں نہ صرف عوامی پذیرائی حاصل ہوئی بلکہ جن کی کتابیں بھی بکتی ہیں۔ سفر نامہ نگاری کی طرف کیسے آ گئے؟
ج: کہتے ہیں جب شاعری بوڑھی ہوتی ہے تو نثر میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ مگر میرے ساتھ معاملہ اُلٹ رہا۔ جب شاعری جوبن پہ آئی اور لوگ سراہنے لگے اُس وقت مجھے نثر لکھنے کا خیال آیا۔ سیاحت کا شوق بچپن سے تھا۔ سندباد جہازی کے سفرنامے بستے میں رہتے تھے۔ شاعری اسفار کا وسیلہ بنی اور اسفار سفرناموں کا وسیلہ ٹھہرے۔

س: مکمل مزاحیہ مشاعرے بھی خوب ہو رہے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: نہ تو مزاحیہ شاعری پر میرے تحفظات ہیں اور نہ ہی مزاحیہ مشاعرے کے حوالے سے موجودہ دور میں کوئی بھی مثبت سرگرمی ہو قابل تحسین ہے۔ البتہ مجھے مزاحیہ شاعروں سے ایک گلہ ہے کہ وہ مشاعرے میں اپنا مکمل کلام سنا کے جاتے ہیں اور انہوں نے خود ہی فرض کر لیا ہے کہ جیسے اُن کا اب تک کا سارا کلام سننے کے لیے لوگ آئے ہوئے ہیں ایسی بات نہیں ہے۔

س: ادب کی ترویج کے لیے قائم اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج: ادب کی ترویج کے لیے قائم اداروں کا حال بھی پاکستان کے دیگر اداروں جیسا ہے۔ ادب کو اور ادیب کو ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ ادب تو مرکز سے دور دریا کے کنارے بیٹھا کوئی شاعر تخلیق کر رہا ہے یا پھر کسی ٹیلے پر بیٹھا یا پہاڑی علاقے میں کسی پتھر پہ بیٹھا ادیب تخلیق کر رہا ہے۔ سرکاری اداروں کے تمام مفادات منظورِ نظر لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

س: آج کل آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ کیا کوئی نئی کتاب آنے والی ہے؟

ج: لکھنے کا سلسلہ تو چلتا رہتا ہے۔ ابھی میرا تازہ سفرنامہ جو کہ یو-اے-ای اور دوحہ کی سیاحت پر مشتمل ہے "ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا" کے نام سے شائع ہوا ہے اور آج کل یورپ کا سفرنامہ "تتلیاں ستاتی ہیں" لکھ رہا ہوں۔

س: کیا ادیب کو نظریاتی ہونا چاہیے؟ ادب میں دائیں اور بائیں بازو کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

ج: ادیب تو ہوتا ہی نظریاتی ہے۔ تخلیق کار کا کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور ہوتا ہے۔ بغیر نظریے کے تو تخلیق ممکن نہیں۔ وہ نظریہ محبت کا ہو یا انقلاب کا۔ دائیں اور بائیں بازو کے نظریات ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب تو ایک ہی بازو ہے اور وہ ہے ارفع تخلیق کا۔

جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

س: اپنے ہم عصروں میں سے بھی کسی سے متاثر ہیں؟

ج: ہم عصر ہوں، بہتر ہوں یا جونیئر اچھا شعر یا اچھی تخلیق سے ضرور متاثر ہوتا ہوں۔ اچھی

تخلیق کو پرکھنے کا پیمانہ ہر شخص کا جدا ہے۔ اس میں انسان کے فطری مزاج کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک نقاد کے نزدیک بہت ارفع و اعلیٰ تخلیق دوسرے نقاد کی نظر میں غیر معیاری ہوتی ہے۔ یہ بڑی لمبی بحث ہے۔

س: پسندیدہ شاعر کون ہے؟ آپ نثر بھی لکھتے ہیں اور صاحب مطالعہ بھی ہیں۔ نثر کس ادیب کی زیادہ پسند ہے؟

ج: پسندیدہ شاعر والا سوال بھی کسی پہیلی سے کم نہیں۔ جیسے جیسے آپ کا ذوق، مزاج اور زمانہ بدلتا ہے پسندیدہ شاعر بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ آج کل کوئی نہیں۔ جزوی طور پر چند شعراء کی شاعری پسند ہے۔ مکمل کلام کسی ایک شاعر کا کبھی پسند نہیں آیا۔ یہی معاملہ نثر کا ہے۔ کسی دور میں مستنصر حسین تارڑ کی تحریریں بہت پسند تھیں۔ بعد میں منظہر الاسلام اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب اور منٹو وغیرہ کو پڑھا تو پسند کا معیار بھی بدل گیا۔ مزاح میں مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء، عطاء الحق قاسمی پسند ہیں۔

س: بحیثیت پبلشر آپ کتاب کا کیا مستقبل دیکھ رہے ہیں؟

ج: پاکستان میں کتابوں کی صورت حال کبھی بھی حوصلہ افزا نہیں رہی۔ قاری اور کتاب کے درمیان فاصلہ ہے جو کہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ لوگ کتاب پڑھنا چاہتے ہیں مگر مڈل مین (دکاندار) جس کا کام قاری تک کتاب کی ترسیل ممکن بنانا ہے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ کتاب کی تخلیق سے اشاعت تک کے مراحل میں اُس کا کوئی کردار نہیں ہوتا مگر وہ اپنی من پسند کتب جن پر کمیشن زیادہ سے زیادہ ہو دکان میں رکھتا ہے اور اس طرح سب سے زیادہ فائدے میں وہی رہ جاتا ہے۔ بڑھتی ہوئی کتابوں کی قیمتوں کا ذمہ دار حکومت کی طرح وہ بھی ہے۔

س: آپ کی بیشتر کتابوں کے ناموں میں محبت کا لفظ ضرور آتا ہے۔ اس کی کوئی وجہ ہے؟

ج: محبت کا لفظ میرے نزدیک نہایت وسیع معنوں میں ہے جو کہ ذرّے سے لے کر پوری کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔ زندگی سے محبت کو منہا کر دیں تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ گھر سے لے کر عالمی سطح کے مسائل محبت سے حل کیے جا سکتے ہیں۔ آج ہمیں اپنے اردگرد جو خلفشار نظر آتا ہے یہ محبت کے نہ ہونے سے ہے۔ محبت منزل نہیں راستہ ہے جس پہ عمر بھر

پھول کھلانے ہوتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ہر شخص محبت کرنا چاہتا ہے مگر دوسرے کو یہ حق دینے کو تیار نہیں۔

س: کیا آپ آج کی شاعری سے مطمئن ہیں؟

ج: اگر آپ کا سوال یہ ہے کہ کیا میں آج کی اُردو شاعری سے مطمئن ہوں؟ تو میرا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں۔ اگرچہ میں خود غزل گو شاعر ہوں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُردو شاعری کو سب سے زیادہ نقصان غزل نے پہنچایا ہے۔ اُسے جوان نہیں ہونے دیا۔ زندگی سے متعلق بہت سے موضوعات ہیں جو اُردو شاعری کا اُس طرح حصہ نہیں بن سکے۔ یہ بہت ہی افسوس ناک صورت حال ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں نظم کو بھی مقبولیت ملی ہے۔ اس سے ہوسکتا ہے مستقبل میں صورتِ حال تبدیل ہو جائے۔ البتہ غزل خاص کر آج کی غزل میں موضوعات کی بہت یکسانیت ہے۔

س: آپ کو حال ہی میں ''عکس خوشبو ایوارڈ'' ملا ہے۔ اس سے متعلق آپ اپنے جذبات کس طرح قارئین سے شیئر کریں گے۔

ج: شاعرو، ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے داد و تحسین کا عمل نہایت اہم ہے۔ اُس کی ایک صورت ایوارڈ بھی ہے۔ سرکاری و غیر سرکاری سطح پر بہت سے ایوارڈ دیے جاتے ہیں لیکن کوئی بھی ایوارڈ اپنی کریڈیبلٹی کے حوالے سے اہم ہوا کرتا ہے۔ مختلف تنظیموں کی طرف سے مجھے ملک اور بیرونِ ملک میں کافی اعزازات اور اسناد مل چکی ہیں مگر دو وجوہ کی بنا پر مجھے ''عکس خوشبو ایوارڈ'' کی خوشی اُن سب سے زیادہ ہے۔ پہلی تو یہ کہ یہ ایوارڈ ابتداء سے ہی جینوئن شعراء کو دیا گیا اور دوسری یہ کہ اس کے ساتھ اُردو زبان کی نہایت معتبر اور مقبول شاعرہ پروین شاکر کی نسبت ہے۔

س: آپ کی کتابوں کے ناموں میں ''محبت'' کا لفظ ہوتا ہے۔ ایسا شعوری طور پر ہے یا لاشعوری طور پر۔ اگر شعوری طور پر ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

ج: مجھے ''محبت'' کا لفظ اچھا لگتا ہے۔ یہ مجھے اپنا نام لگتا ہے۔ یہ مجھے اُس کا نام لگتا ہے جس کے سپنے بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ یہ لفظ مجھے اپنی زندگی کی آپ بیتی لگتا ہے۔ محبت میں مجھے پوری دُنیا کے مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ محبت کا لفظ میرے ہاں بہت وسیع معانی اور

مفہوم لیے ہوئے ہے۔میرے نزدیک بقول اقبال محبت فاتح عالم ہے۔

س: آپ بیرونِ ملک بھی مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ وہاں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: بھارت میں تو اُردو زبان کے حوالے سے بہت کام ہو رہا ہے۔ روزمرہ بول چال میں جو زبان بولی جاتی ہے اُسے آپ لاکھ ہندی کہہ لیں ہے تو وہ اُردو ہی۔ اُڑیسہ میں جو سارک کے پلیٹ فارم سے یوتھ پوئٹری فیسٹول ہوا تھا اُس میں بھارت کے تمام صوبوں کے علاوہ سارک ممالک سے نوجوان شعراء آئے ہوئے تھے۔ آپ حیران ہوں گے سبھی اُردو اچھی طرح سمجھتے تھے اور کافی حد تک بول بھی لیتے تھے۔ نیپال کے شعراء نے احمد فراز، منیر نیازی اور پروین شاکر کو ہم سے زیادہ پڑھ رکھا تھا۔ البتہ رسم الخط ہندی ہے۔ یو۔اے۔ای اور دوحہ میں بہت سی ادبی تنظیمیں باقاعدگی سے مشاعرے کراتی ہیں۔ سیمینار بھی منعقد ہوتے ہیں۔ وہاں کثیر تعداد میں پاکستانی آباد ہیں اس لیے وہاں بھی اُردو کے حوالے سے نہایت حوصلہ افزاء صورت حال ہے۔ ماضی قریب میں سلیم جعفری مرحوم اور ملک مصیب الرحمٰن نے جو علم وادب کی شمعیں وہاں جلائی ہیں اُن کی روشنی تادیر قائم رہے گی۔ البتہ یورپ میں اُردو کی صورت حال نہایت مایوس کن ہے۔ نوجوان نسل تو بالکل اس سے بے بہرہ ہے۔ آج سے تین یا دو دہائی قبل جو علم وادب سے شغف رکھنے والے لوگ اور شاعر ادیب وہاں جا کر بس گئے تھے انھوں نے اپنے تئیں اُردو علم وادب کی سانسیں بحال رکھی ہوئی ہیں اور اُن کے بچے بھی تھوڑی بہت شدھ بدھ رکھتے ہیں۔ وگرنہ سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں۔ البتہ فرانس میں ابھی بھی باقی یورپی ممالک کی نسبت مشرقی تہذیب اور اُردو زبان نوجوان نسل تک منتقل ہو رہی ہے اور وہاں صورت حال قدرے مختلف ہے۔

س: نئے لکھنے والوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: نئے لکھنے والے کے لیے یہی پیغام ہے کہ تخلیق کی فضا میں رہیں۔ اپنے اندر ٹھہراؤ پیدا کریں۔ جلدی نہ کریں۔ کلاسیکی ادب کا مطالعہ کریں۔ عصری ادب پر نظر رکھیں اور بھیڑ میں اپنے لیے الگ راستہ بنانے کی کوشش کریں۔

خالد علیم

○ اقبال کے بعد کسی شاعر کو بڑے شاعر کے طور پر منوانا آسان نہیں۔

○ کوئی بھی صنف ادب اگر اُس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے دم نہیں توڑتی۔

○ آج کے دور میں زیادہ تر مشاعرہ برائے مشاعرہ کا عمل کارفرما ہے۔

چٹان: شاعری کس سے متاثر ہو کر شروع کی؟

خالد علیم: شاعری تو ایک فطری عمل ہے اور میرے خیال میں اس کا آغاز براہ راست کسی سے متاثر ہو کر نہیں ہوتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ماحول کے اثرات کا تعلق ضرور ہے۔ میری شعری تربیت لاشعوری طور پر گھر کے ماحول سے ہوئی۔ والد محترم علیم ناصری صاحب نے غالباً مجھے چوتھی یا پانچویں کلاس میں اپنی لکھی ہوئی کچھ بچوں کی نظمیں یاد کرنے کے لئے دیں۔ سکول میں بزم ادب کا اہتمام ہوتا تھا تو میں وہ نظمیں سنایا کرتا تھا۔ اس طرح مجھے شاعری سے وابستگی پیدا ہوئی اور کچھ تک بندی بھی کرنے لگا۔ مڈل تک آتے آتے والد صاحب کی شاعری پڑھنے سے بحور و اوزان میں کچھ سدھ بدھ پیدا ہوئی۔ گھر میں والد صاحب کے ذخیرہ کتب میں دیوان غالب اور کلام اقبال موجود تھا۔ غالب تو خیر اس زمانے میں کیا سمجھ میں آتا، کلام اقبال کی تھوڑی بہت تفہیم ہوتی رہی اور مجھ میں شعری شعور پیدا ہونے لگا۔ اس طرح پہلی نظم میٹرک میں ایک حادثے کے تاثر میں لکھی۔ ہر چند تخلیقی سطح پر یہ

نظم نہایت کمزور تھی، اس لئے با قاعدہ شاعری کا آغاز قدرے بعد میں ہوا، اس اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں لاشعوری طور پر ابتداء میں والد محترم ہی سے متاثر ہوا۔

چٹان: با قاعدہ شاعری کب شروع کی؟

خالد علیم: ۱۹۷۴ء سے۔ ان ایام میں نعتیہ شاعری کی طرف مائل ہوا اور نعتیہ مشاعروں میں با قاعدہ حصہ لیتا رہا۔

چٹان: یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟

خالد علیم: چار پانچ سال تک تسلسل سے نعتیں لکھیں بعد میں نعتیہ قصائد اور نعتیہ رباعیات بھی لکھیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۸۰ء تک جاری رہا۔ افسوس کہ بعد میں نعت لکھنے کا وہ تسلسل نہ رہا جو ان ایام میں تھا۔

چٹان: غزل کی طرف کب مائل ہوئے؟

خالد علیم: غزل اگر چہ شروع ہی سے لکھتا رہا۔ مگر بہت ہی کم۔ بعد میں صنف غزل نے کچھ زیادہ اسیر کر لیا۔

چٹان: غزل اور نظم میں سے اظہار کا بہتر ذریعہ کس کو سمجھتے ہیں؟

خالد علیم: اظہار کا بہترین ذریعہ تو میرے نزدیک غزل ہی ہے۔ اس لئے کہ غزل میں اپنے تجربات واحساسات کا اظہار آسان ہے۔ جو بات کھل کر نہیں کی جا سکتی، وہ غزل میں ایما ئیت اور علامت کے انداز میں کہہ دی جاتی ہے اور پڑھنے سننے والے پر شاعر کا مافی الضمیر بھی روشن ہو جاتا ہے جبکہ نظم میں ایسا ممکن نہیں، تاہم علامتی انداز میں لکھی گئی نظمیں اس سے مستثنیٰ ہیں گو کہ بعض شعراء کی ایسی نظمیں بھی موجود ہیں جن کی علامتیں اہل ادب پر بھی مشکل ہی سے کھلتی ہیں، اور اس سے ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ شاعر ارادی طور پر کسی صنف سخن کا انتخاب نہیں کرتا۔ اس کا فطری اظہار اور موضوع سخن کسی وقت کسی بھی صنف سخن میں ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے نظم ،غزل رباعی وغیرہ کی قید نہیں ہے۔

چٹان: ایک عہد کے دو بڑے شاعروں کا آپس میں تقابل کس حد تک درست ہے۔ کیا فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کا موازنہ کیا جا سکتا ہے اور اس موازنے میں آپ منیر نیازی

کو کہاں رکھیں گے؟

خالد علیم: جہاں تک منیر نیازی کا تعلق ہے، یقیناً منیر نیازی اس عہد کے ایک اہم اور جہت ساز شاعر ہیں۔ اور ان کے شاعرانہ مقام و مرتبہ سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ ان کا شعری اسلوب اور فکری فضا اپنے پیشرو شعراء سے یکسر مختلف ہے۔ انہوں نے اپنا الگ اور ایک نیا راستہ نکالا ہے اور ایک دور میں تو نوجوان نسل کے شعراء ان سے متاثر بھی ہوئے اور ان کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی مگر منیر نیازی کے رنگ و آہنگ میں شعر کہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پاکستان ہی نہیں ہندوستان میں بھی اس کے شعری اثرات موجود ہیں۔ منیر نیازی آج بھی اپنی آواز میں منفرد ہیں۔ جہاں تک ایک بہت بڑے Contribution کا تعلق ہے تو منیر نیازی کی شاعری اپنے عہد کی ایک نمایاں Contribution ضرور ہے مگر احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کے ساتھ ان کا موازنہ کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔ ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' اقبال کے بعد کسی شاعر کو اپنے لیے ایک بڑے شاعر کے طور پر منوانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شاعر کے سامنے نئے موضوعات ہوں اور وہ ایک بہت بڑے تجربے کے عمل سے گزر رہا ہو۔ فیض نے یہ کام آسان کر دکھایا۔ اقبال کے بعد اردو شعری کائنات میں فیض نے اپنے طرز اظہار اور موضوعاتی تنوع سے ایک نئی لے پیدا کی اور پھر یہ لے شش جہت میں پھیل گئی۔ احمد ندیم قاسمی کا ''تصور انسان'' ان کی شاعرانہ فکر کا وہ بنیادی موضوع ہے جس نے ان کے شاعرانہ رویئے کو تضاد سے بچا کر ایک فکری اکائی فراہم کی اور زندگی کے پیچ در پیچ مسائل پر لکھتے ہوئے انہوں نے اپنی بلند آہنگ شاعری کی بنیاد رکھی۔ اور یوں ان کی شاعری عہد بہ عہد ایک آفاقی درجہ اختیار کر گئی۔ قاسمی صاحب نے رم جھم قطعات و رباعیات سے لے کر ''جلال و جمال کی نظم و غزل تک'' اور پھر ''جلال و جمال'' سے ''بسیط'' تک جتنا شعری سفر طے کیا اور زندگی کے ان گنت موضوعات پر جس قدر توانا لہجے اور پوری شاعرانہ گرفت سے لکھا اس لحاظ سے کوئی دوسرا ان کے مقابل نہیں ٹھہرتا۔ وہ یقیناً اپنے عہد کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں، اپنے عہد کے ان دو بڑے شاعروں کا آپس میں تقابل میرے نزدیک منا

سب نہیں اس لئے کہ فیض کا اپنا ایک مقام و مرتبہ ہے۔ان کی اپنی ایک لے ہے جس کا کوئی حریف نہیں جبکہ قاسمی صاحب کے اپنے موضوعات اور منفرد طرز اظہار ہے۔ان کی شاعری نصف صدی سے بھی زیادہ طویل عرصہ پر محیط ہے اور اپنے آغاز سفر سے آج تک ان کی لے کہیں بھی مدھم نہیں پڑتی۔

چٹان: آپ اپنے ہم عصروں میں سے کس سے متاثر ہیں؟

خالد علیم: براہ راست کسی سے بھی نہیں۔تاہم سب کا اپنے اپنے شعری مرتبے کے لحاظ سے قدردان ہوں۔میں ادبی گروہ بندی اور تعصب کا قائل نہیں ہوں۔

چٹان شاعری میں اصلاح کے کس حد تک قائل ہیں۔آیا اپنے والد محترم علیم ناصری صاحب جو کہ خود بہت اہم اور قادرالکلام شاعر ہیں،ان سے کبھی اصلاح لی؟

خالد علیم: جی ہاں: ابتداء میں انہی سے اصلاح لی اور فنی اور شعری رموز سے آشنائی ہوئی۔ شاعری میں اصلاح کو ضروری سمجھتا ہوں لیکن اس حد تک کہ اصلاح سے فنی ارتقا پیدا ہو جائے ،خیال کی تبدیلی اور شعری احساسات ونظریات کو بدلنا میرے نزدیک گمراہی ہے جس سے لکھنے والے کی رہنمائی نہیں ہوتی بلکہ اس کی فکری وتخلیقی نشو ونما ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔اصل اصلاح وہ ہے جس سے لکھنے والے میں تخلیقی وفنی اعتماد پیدا ہو اور وہ آگے چل کر معیارات کے مطابق خود اپنے کلام کی اصلاح کرنے اور فن کے بلند معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے شعر کہنے پر قادر ہو۔

چٹان: ہمارے ہاں ناقدین ادب عدل سے کام لیتے ہیں یا تعصب سے؟

خالد علیم: دونوں طرح کے ناقدین موجود ہیں۔عدل کے پیمانے اگرچہ تعصبات اور گروہ بندی سے ٹوٹ جاتے ہیں تاہم ہمارے ہاں ادب میں معیار عدل کی روایت آٹے میں نمک کے برابر ہی سہی،ابھی موجود ہے اور انشاءاللہ ہر دور میں زندہ رہے گی۔

چٹان: انسانی مصروفیت اور روز بروز بڑھتی ہوئی مادہ پرستی کے اس دور میں کتاب کا کیا مستقبل ہے؟

خالد علیم: بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مادہ پرستی کے اس دور میں کتاب کا مستقبل غیر محفوظ ہو

گیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ماضی میں بھی کتاب سے ربط رکھنے والوں کی شرح کم ہی رہی ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ لاکھوں کی آبادی میں کتاب کا ایک ایڈیشن عموماً ایک ہزار ہی کی تعداد میں نکلتا تھا، شاید اس سے بھی کم۔ لیکن کتابیں پڑھنے والے اس وقت بھی موجود تھے اور لگ بھگ آج بھی موجود ہیں۔ ہزار یا پانچ سو کی تعداد میں کتاب چھپنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پڑھنے والوں کی تعداد اتنی رہی ہے یا اس وقت ہے۔ کتاب سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد آج بھی کہیں زیادہ ہے۔ پڑھنے والوں پر دیگر مصروفیات یا مادہ پرستی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ ٹی وی، کمپیوٹر یا دیگر ذرائع نے کتاب کی اہمیت کو کم کر دیا ہے اور قاری کی توجہ چھین لی ہے۔ لیکن ایسا ممکن نہیں، یورپ، امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں ذرائع ہم سے کہیں زیادہ بڑی سطح پر ہیں لیکن کتاب کی اہمیت و افادیت پر کوئی حرف نہیں آیا۔ اور ان ذرائع نے کتاب پڑھنے والوں کی توجہ ہرگز نہیں چھینی۔ اس لئے ہمارے ہاں بھی کتاب پر موجودہ دوروں کی مصروفیات اور مادہ پرستی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ کتاب کی اپنی ایک اہمیت ہے، جو دیگر ذرائع اور مصروفیات کے باوجود باقی رہے گی۔

چٹان: آپ نے نظم اور غزل کے علاوہ رباعی بھی کہی جبکہ ہمارے ہاں فن رباعی کو سمجھنے والے اور رباعی کہنے والے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اگلی صدی میں یہ صنف ادب زندہ رہے گی؟

خالد علیم: کسی بھی فن کو سمجھنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ آج بھی موجود ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ کوئی صنف ادب اگر اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے تو دم نہیں توڑتی کہ یہ تو ایک سلسلہ ہے جو ماضی سے حال اور پھر مستقبل تک چلتا رہے گا۔ آپ دیکھیں کہ قصیدہ جس کی روایت کا آغاز عربی اور پھر فارسی سے ہوا اور بعد میں اردو میں بہت خوبصورت اور اعلیٰ درجے کے قصائد لکھے گئے۔ اور قصیدے کے فن کو عروج حاصل ہوا۔ جبکہ ان قصائد کی تخلیق کا مقصد عام طور پر صلہ و یافت اور بادشاہوں سے نذرانے کا حصول تھا۔ شاہانہ دور ختم ہوا تو امکان تھا کہ قصیدے کا فن بھی ختم ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ قصیدہ مناقب و نعت کی صورت میں آج بھی زندہ ہے۔ بالخصوص اس لئے بھی

کہ فن قصیدہ نگاری ہماری اردو شاعری کی ایک جاندار روایت ہے۔ رباعی اپنے اختصار و جامعیت اور اپنی طبعی لطافت کے اعتبار سے ایک خوبصورت اور موثر ذریعہ اظہار ہے۔ جو لوگ اس کی روانی پر معترض ہوتے ہیں، وہ دراصل اس کے اوزان کے فطری بہاؤ اور غنائیت سے آگاہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ رباعی کو ابتداء میں ترانہ کے نام سے موسوم کیا گیا، یعنی گانے والی چیز۔ اور اس کی بنیاد انہی اوزان پر رکھی گئی جو آج تک مروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے ساتھ ساتھ رباعیات کے مجموعے بھی شائع ہوتے رہے بلکہ بعض شاعروں نے تو فن رباعی کے حوالے سے ہی شہرت پائی۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ غزل نگاروں کے مقابل رباعی نگار شاعروں کی تعداد کم رہی ہے۔ آج بھی یہ تعداد کم ہے مگر فن رباعی کو سمجھنے والے آج بھی موجود ہیں۔ اور جب تک فن شاعری زندہ ہے، اس فن کی اہمیت اپنی طبعی لطافت اور غنائیت اور جامعیت کے اعتبار سے باقی رہے گی۔

چٹان : آپ کا پہلا شعری مجموعہ ''کوئی آنکھ دل سے بھری رہی'' حال ہی میں منظر عام پر آیا جس کے بعد آپ ایک اہم شاعر کے طور پر سامنے آئے۔ شاعری پر اس قدر استادانہ اور پختہ گرفت کے باوجود آپ کا پہلا مجموعہ اس قدر تاخیر سے کیوں آیا جبکہ آپ کے ساتھ اپنے ادبی سفر کا آغاز کرنے والوں میں سے بعض شاعروں کے اب تک بیسیوں شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

خالد علیم : پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا، میرا مجموعہ تاخیر سے شائع ہوا۔ میرے خیال میں اس کے لئے جو وقت تھا، اسکے مطابق یہ اپنے وقت پر ہی شائع ہوا ہے۔ رہی بات بعض ہم سفروں کی تو یوں کہہ لیں کہ ان کو وہ وسائل میسر آ گئے جن کی بنیاد پر ان کے مجموعے ہائے کلام شائع ہوئے۔ دوسرا پہلو یہ ہے اور اس کا اعتراف بھی میرے لئے ضروری ہے کہ میں نے اپنے ساتھ ادبی سفر کا آغاز کرنے والوں کے مقابل بہت کم لکھا اور بہت ہی کم ادبی تقریبات میں شامل ہوا۔ ایک لحاظ سے ایک طویل عرصے تک خالصتاً ذاتی مسائل اور بعض حالات کی بناء پر مشاعروں یا ادبی تقریبات میں شامل ہی نہیں ہوا جس کی وجہ سے میرے لکھنے کا عمل اس رفتار یا انداز سے نہیں رہا جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ اب بھی بہت کم ادبی

تقریبات میں شامل ہوتا ہوں۔تا ہم یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا، اسے سوچ سمجھ کر اور پورے اعتماد اور خلوص سے لکھا، البتہ معیار کا فیصلہ تو ناقدین ادب ہی کا کام ہے۔ عام سطح پر بے دریغ لکھتے چلا جانا میرے لئے ممکن نہ تھا کہ یہ محض مزاج کی بات ہے۔

چٹان: موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار باقی رہ گیا ہے؟

خالد علیم: شعری تربیت میں مشاعروں کا کردار خاصا اہم ہے۔شاعروں کے باہمی روابط اور شعری ابلاغ میں مشاعروں کا کردار ہماری تہذیب ادب کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ مشاعرہ ایک زمانے میں تقریباً ادبی تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔مگر آج کے دور میں زیادہ تر مشاعرہ برائے مشاعرہ کا عمل کارفرما ہے۔تا ہم ادب میں اس کی ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چٹان: سرکاری سطح پر ادیبوں کو ملنے والے ایوارڈ کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے؟

خالد علیم: ایوارڈ دراصل اعتراف فن کی صورت گری ہے۔دیکھنا یہ چاہیے کہ حکومتی سطح پر اعتراف فن شخصیات کے حوالے سے کیا جاتا ہے یا حقیقتاً جس کو ایوارڈ دیا جاتا ہے اس کا فن اس سطح پر ہے بھی یا نہیں۔محض مخالفت برائے مخالفت میں لب کشائی کرنے والے ایوارڈ یافتگان کے تخلیقی معیار کو ان کی شخصیت کے قد کاٹھ اور بڑی سطح پر ان کے تعلقات کے حوالے سے ناپتے ہیں جو درست نہیں۔ایوارڈ حاصل کرنے والے کی تخلیق ان کے سامنے ہوتی ہے جو معیار فن پر اگر پوری اترتی ہے تو اس میں تعصب سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ کھلے دل سے عام سطح پر بھی اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے۔تعلقات کی بنیاد پر تھوڑی بہت گنجائش تو ہمیشہ رہتی ہیں تا ہم ایک سچا ادیب اور شاعر ستائش وصلے کی تمنا نہیں رکھتا اور نہ ہی ان ایوارڈ سے اس کے تخلیقی جوہر میں کوئی اضافہ یا کمی ہوتی ہے البتہ ایک طرح سے میرٹ کی بنیاد پر دیے گئے ایوارڈز سے ان کی حوصلہ افزائی ضرور ہوتی ہے۔

خالد مسعود

○ تحریر کی پسندیدگی مستقل چیز نہیں ہے۔ کسی کتاب سے کمٹ منٹ بھی مستقل نہیں ہوتی۔

○ نیا شعر زیادہ مزہ دیتا ہے اور نیا شاعر ہانٹ کرتا ہے۔ ادب میں خاص پسند ناپسند چلتی رہتی ہے۔

○ جب حکومت مانتی ہی نہیں کہ حالات خراب ہیں تو پھر وہ اسے ٹھیک کیسے کرے گی۔

خالد مسعود خاں کا شمار پاکستان کے مقبول ترین کالم نگاروں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے وہ مشاعروں کی جان اور اپنے منفرد طرزِ تحریر کے سبب قارئین کے بہت وسیع حلقے میں پسند کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے مزاحیہ شاعری کو مختلف زبانوں کی آمیزش سے نیا رنگ عطا کیا ہے۔ جسے عوام میں بہت پسند کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت وہ عالمی سطح پر اُردو کے نہایت مقبول اور معروف شاعر ہیں۔ اُن کے کالم نے بھی نہایت قلیل عرصہ میں صف اوّل کے کالم نگاروں میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ چند دن پیشتر عامر بن علی کی ان سے ہونے والی گفتگو ارژنگ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش ہے۔

ارژنگ: یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہیے؟

خالد مسعود خاں: گھر میں پڑھنے لکھنے کا ماحول تھا۔ میرے دادا شاعر تھے اور والد شاعر ہونے کے علاوہ کالج میں لائبریرین تھے۔ بہت ہی پڑھے لکھے آدمی تھے۔ میرا کتاب سے

تعلق بہت مضبوط اور پرانا ہے۔ کتاب سے تعلق کی بنا پر ہی میں نے زمانہ طالب علمی میں تقاریری مقابلوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ جن دنوں میں کالج میں زیر تعلیم تھا اور تقاریری مقابلوں میں حصہ لیتا تھا انہی دنوں مزاحیہ شاعری شروع کی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ شروع ہو گئی تھی۔

ارژنگ: ویسے تو مزاح کو ہائی سیریسنیس کہتے ہیں لیکن معروف معنوں میں کیا صرف مزاحیہ شاعری ہی کرتے ہیں یا پھر سنجیدہ شاعری بھی فرماتے ہیں؟

خالد مسعود خاں: سنجیدہ شاعری کا گناہ میں نے کبھی نہیں کیا۔ میری بیگم بھی مجھ سے کبھی کبھی پوچھتی ہیں کہ آپ سنجیدہ شاعری کیوں نہیں کرتے؟ میرا مؤقف یہ ہے کہ اُٹھتے ہیں اخبار کھولتے ہیں تو اس میں بڑی بڑی خبریں پریشان کن حالات کا بیان ہوتا ہے۔ کام پر جاتے ہیں تو وہاں بھی ٹینشن کا راج۔ باہر نکلتے ہیں تو وہاں بھی اچھی خبر مفقود اور ارد گرد نظر دوڑائیں تو دُکھی کرنے والے حالات نظر آتے ہیں۔ ایسے عالم میں مزاحیہ شاعری کے ذریعے ہم کچھ نہ کچھ خوشیاں بکھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قہقہے بانٹنے والی شاعری اُداس ماحول میں ایک بہتر Contribution ہے۔

ارژنگ: آپ کی اب تک کوئی کتاب منظر عام پر آئی ہے کہ نہیں؟

خالد مسعود خاں: کتاب تو میری اب تک کوئی بھی شائع نہیں ہوئی ہے۔

ارژنگ: کالم نگاری کی طرف کیسے آئے؟

خالد مسعود خاں: کالم نگاری پر مجھے آمادہ کرنے کا سہرا ضیاء شاہد کے سر ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ایک دفعہ لاہور ایئر پورٹ پر فلائٹ کے انتظار میں بیٹھا تھا اور ضیاء شاہد بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ اتفاق سے فلائٹ لیٹ ہو گئی جس کے سبب مجھے اور ضیاء شاہد کو طویل گپ شپ کا موقع میسر آیا۔ اسی ملاقات میں انہوں نے مجھے کالم لکھنے کا مشورہ دیا۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ تھوڑے عرصے بعد ضیاء شاہد سے خبریں کے ایک مشاعرے میں دوبارہ ملاقات ہوئی اور اس بار انہوں نے مجھے کالم لکھنے کا مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مطالبہ بھی کیا کہ میں خبریں کے لیے کالم بھیجنا شروع کروں۔ انہی دنوں خبریں ملتان کا اجراء ہوا تھا اور جو

ریزیڈنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے ان کے مجھے فون آنے شروع ہو گئے کہ آپ نے کالم لکھا کہ ابھی نہیں لکھا، لکھ دیا ہے تو بھجوا دیں۔ خبریں میں ایک دن جی کڑا کر کے کالم لکھ مارا اور سوچا کہ کالم چھاپ دیں گے تو ٹھیک ہے ورنہ کالم لکھنے کا مطالبہ چھوڑ دیں گے۔ یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے، مسلسل آٹھ سال تک میں نے خبریں میں کالم لکھا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر اوصاف میں بھی لکھتا رہا۔ ایکسپریس سے بھی منسلک رہا اور پانچ سال سے روزنامہ جنگ کے ساتھ منسلک ہوں۔ صحافت میں آپ ضیاء شاہد کو میرا اُستاد بھی کہہ سکتے ہیں۔

ارژنگ: شاعر اور صحافت میں آپ کو کون سا حوالہ زیادہ پسند ہے؟

خالد مسعود خاں: مجھے ذاتی طور پر شاعری کا حوالہ زیادہ خوشگوار اور پاورفل لگتا ہے مگر میں صحافت اور شاعری میں کوئی تضاد یا تصادم محسوس نہیں کرتا کیونکہ یہ دونوں ہی میری ذات کے حصے ہیں۔ نظام کی خرابیوں اور معاشرے کی ناہمواریوں اور برائیوں کے خلاف جو میرے اندر غصہ پیدا ہوتا ہے وہ صحافت کے ذریعے نکل جاتا ہے اور جو لطافت باقی بچتی ہے میں اسے شاعری کے قالب میں ڈھال لیتا ہوں۔

ارژنگ: آپ نے تعلیم کس شعبے کے متعلق حاصل کی؟

خالد مسعود خاں: تعلیم تو میں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کی لی تھی۔ ایم بی اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ اس شعبے میں ملازمت بھی کی مگر صحافت اور ادب کی طرف نکل آیا۔

ارژنگ: بحیثیت قوم ہم انقلاب کی طرف بڑھ رہے ہیں یا انارکی کی جانب یا پھر کسی اور طرف؟

خالد مسعود خاں: انقلاب کی طرف تو نہیں جا رہے ہیں۔ ہمارے اندر انقلاب کا جین (Gene) نہیں ہے۔ اگر حالات کو صحیح رُخ نہ دیا گیا تو انارکی کی طرف جانے کا امکان موجود ہے۔ صورت حال کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہی نہیں ہے۔ ان کا مطمع نظر تو بس یہ ہے کہ کسی طرح آج کا دن اقتدار میں گزر جائے کل کی فکر نہیں۔ بلوچستان کا ایشو پیچیدہ صورتِ حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بلوچ ہمارے دشمن نہیں ہیں مگر جب ہم ان کو شکوے، شکایتیں نہیں سنیں گے، حقوق غصب کریں گے تو وہ مزاحمت تو کریں گے۔ ڈرون کا معاملہ ہے، امریکہ سے کیے گئے معاہدے ہیں اور

فاٹا کا ایشو ہے۔ یہ سب معاشرے کو انارکی کی طرف دھکیل رہے ہیں مگر میں Optimistic ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ حالات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ ان حالات کو ٹھیک کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تسلیم کرے کہ حالات خراب ہیں۔ جب حکومت مانتی ہی نہیں کہ حالات خراب ہیں تو پھر وہ اسے ٹھیک کیسے کرے گی۔ مسئلے کا ادراک ہو گا تو پھر ہی کوئی حل بھی نکلے گا۔ ورنہ تو یہ کرپشن اور بے ترتیبی ہمارے معاشرے کو انارکی کی طرف ہی لے جائے گی۔

ارژنگ: کون سے ادیب اور شاعر سے زیادہ متاثر ہیں؟

خالد مسعود خاں: تحریر کی پسندیدگی مستقل چیز نہیں ہے۔ کسی کتاب سے کمٹ منٹ بھی مستقل نہیں ہوتی۔ نیا شعر زیادہ مزہ دیتا ہے اور نیا شاعر ہانٹ کرتا ہے۔ ادب میں خاص پسند ناپسند چلتی رہتی ہے۔ مثلاً مجھے بچپن اور لڑکپن میں شفیق الرحمٰن نے اپنے حصار میں رکھا اور جوانی میں مشتاق یوسفی کے اسیر ہو گئے۔ ناول میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد پسندیدہ ہیں تو فضل کریم فضلی کا ناول بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ دیوانِ غالب ہر بار نیا لطف پیدا کرتا ہے اور اقبال کا مطالعہ بھی مستقل رہتا ہے۔ نئے شعراء میں مجھے اظہر ادیب کی نظم بے حد پسند ہے اور نظم کے ہی شاعر معین نظامی کے علاوہ عباس تابش، فیصل عجمی اور بیرونِ ملک بسنے والے شاعر پسند ہیں۔ آپ کے علاوہ شوکت فہمی پسند ہیں۔

ارژنگ: شاعری کے فروغ میں مشاعرے کا کیا کردار ہے؟

خالد مسعود خاں: مشاعرے کی روایت ہماری بڑی تہذیبی روایت ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔ پہلے مزاح مشاعرے میں انٹرٹینمنٹ کے طور پر آتا تھا اب مگر مزاحیہ مشاعرے کا کلچر سامنے آیا ہے۔ میری رائے میں سنجیدہ شاعری اور مزاح کا مکس مشاعرہ زیادہ بہتر ہے۔

ارژنگ: پاکستان میں ادبی مراکز لاہور، اسلام آباد اور کراچی کو سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ آپ ان مراکز سے دور ملتان میں مقیم ہیں۔ کیا آپ کو اس دوری کا احساس ہوتا ہے؟

خالد مسعود خاں: میرا یقین ہے کہ میرٹ اور ٹیلنٹ کو روکا نہیں جا سکتا۔ صرف راستہ لمبا ہو جاتا ہے۔ اسلام آباد یا لاہور میں ہوتا تو الیکٹرانک میڈیا تک بھی باآسانی رسائی ہوتی جو کہ ملتان میں ذرا مشکل ہے۔ مگر میں ملتان میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اس حوالے سے کوئی

پشیمانی نہیں ہے۔ کیونکہ لاہور اور اسلام آباد سے دور ہونے کے جہاں Regret نقصانات ہیں وہاں پلس پوائنٹ بھی ہیں۔ کراچی کا نام میں نے دانستہ طور پر نہیں لیا کیونکہ کراچی کا مزاج میرے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔

دراصل ہم وہی چیزیں گنتے ہیں جو ہمیں نہیں ملتی ہیں۔ ان چیزوں کا شمار نہیں کرتے جو ہمیں حاصل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملتان کا ہم پر حق ہے اور ہمارے اسی حوالے سے کچھ فرض ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میرے کالموں میں بھی مقامی موضوعات چھائے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ اپنے اردگرد کے موضوعات پر بات کرے ہمارا کینوس چھوٹا ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ بات عجیب لگتی ہے کہ بوسیریا اور چلی کی محرومیاں ہمیں رُلاتی ہیں لیکن گرد و پیش کے مسائل سے بے نیاز رہتے ہیں کہ ان پر اظہار خیال سے ہمارا کینوس چھوٹا ہو جاتا ہے۔

خورشید مستانہ

- آج کا ادیب اپنی سماجی ذمہ داریاں نہیں نبھا رہا۔
- مایوسیاں، پریشانیاں اور ناکامیاں مل کر مجھے شاعری کی طرف کھینچ لائیں۔
- آدمی جب ایک دفعہ عشق میں ناکام ہو جائے تو پھر وہ ہرجائی ہو جاتا ہے۔

خورشید مستانہ پنجاب کی لازوال شعری روایت کے امین ہیں۔ منیر نیازی کی رائے میں اُن کی شاعری کے موضوعات ہمارے معاشرے کے موجودہ طرز زندگی کے اہم حقائق کے بارے میں ہیں۔ جن کو وہ بڑے گہرے اور صاف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جو کہ ان کے ہم عصر شعراء کرام میں بہت کم ہے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق جاوید ان کی شاعری کا لب ولہجہ استادانہ مہارت پر مبنی ہے۔ عمر کی ستر بہاریں دیکھ چکے ہیں مگر ان کی شاعری میں اب بھی جذبوں کی جوانی اور روانی چھلکتی ہے۔ پنجاب کے مشاعروں میں ان جیسی پذیرائی، داد اور واہ واہ کم ہی شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔

ارژنگ: اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

خورشید مستانہ: میری پیدائش مشرقی پنجاب کی ریاست نابھہ کے علاقہ مانا نوالہ برج میں ہوئی۔ تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن قیام پاکستان کے وقت میری عمر سات سال کے قریب تھی۔ ہجرت کے واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ میرے والد صاحب مشرقی پنجاب سے پاکستان کی جانب ہجرت کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ ان کی شہادت میری آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ ان کا جسد مجھے اب بھی یاد ہے۔

پاکستان پہنچنے کے بعد ابتدائی سال شدید کسمپرسی کے عالم میں گزارے۔۱۹۵۲ء میں جب مجھے سکول داخل کروانے کے لیے لے گئے تو انہوں نے میری عمر پر اعتراض کیا جو کہ بچوں کے سکول داخل ہونے کی عمومی عمر سے کافی زیادہ تھی۔ خیر میری عمر کم لکھوا کر سکول داخل کروا دیا گیا۔ میٹرک میں نے میاں چنوں ہائی سکول سے کیا اور سکول کے ستر طالب علموں میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

ارژنگ: قیام پاکستان سے پہلے کا سماجی ماحول کیسا تھا؟ آپ تو رہتے بھی سکھ اکثریت علاقے میں تھے؟

خورشید مستانہ: پارٹیشن سے پہلے اچھا ماحول تھا۔لوگ مذہبی جنون میں مبتلا نہیں تھے۔ یہاں تک کہ کئی مسلمانوں اور سکھوں نے آپس میں پگیں تبدیل کی ہوئی تھیں جو کہ پنجاب میں منہ بولے بھائی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا میرے والد صاحب کو سکھوں نے شہید کر دیا تھا لیکن ہمیں باحفاظت پاکستان کی سرحد تک پہنچانے والے بھی سکھ ہی تھے۔ مارنے والے بھی سکھ تھے اور بچانے والے بھی سکھ تھے۔اس لیے تمام لوگوں کے بارے میں ایک بیان زیادتی ہوگی۔

ارژنگ: شاعری کی طرف کب اور کیسے مائل ہوئے؟

خورشید مستانہ: جب میٹرک کر لیا تو نوکری کی تلاش شروع کی۔مگر نوکری باوجود کوشش نہیں ملی۔ دکھ بہت سارے اکٹھے ہو گئے اور اتنے زیادہ ہو گئے تھے کہ شعر بن کر نکلنے لگ گئے۔ مایوسیاں، پریشانیاں اور ناکامیاں مل کر مجھے شاعری کی طرف کھینچ لائیں۔غم روزگار اور غم جاناں نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا۔

ارژنگ: ہجرت کے بعد آپ نے اپنی تمام زندگی میاں چنوں میں گزاری ہے۔ ادبی مراکز سے دور ہونے کا احساس کبھی نہیں ہوا؟

خورشید مستانہ: ادبی مراکز سے دوری کا احساس وسائل کی مجبوریوں کے نیچے ہی دب کر رہ گیا۔ مزدور کو مرکز سے بھلا کیا تعلق؟ تعلیم ادھوری رہی کہ ہمارے شہر میں کوئی کالج نہیں تھا اور دوسرے شہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کے وسائل نہ تھے۔ بس میں کنڈیکٹر کے طور پر

روزگار کا آغاز کیا۔ تین سال کنڈیکٹری کی اور پھر تین سال بسوں میں چیکر رہا۔ بس بسوں میں بھی شعر لکھتا رہا۔ ذہن پر شاعری اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ اپنے گردوپیش کے کام تو بس خوابیدہ انداز میں ہی سرانجام دیتا رہا۔ دل و دماغ تو شاعری میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔

ارژنگ: پہلا شعری مجموعہ کب شائع ہوا؟

خورشید مستانہ: پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا جو کہ مزاحمتی نظموں پر مشتمل تھا۔ بہت سارا کلام تو ضائع ہو گیا۔ ۲۰۰۵ء میں ''سہکدے پھٹ'' کے عنوان سے کتاب شائع ہوئی۔ آج کل بھی ایک مجموعہ زیرِ طبع ہے مگر ابھی تک اُس شعری مجموعے کا نام فائنل نہیں کر سکا۔

ارژنگ: آپ کی تمام شاعری پنجابی زبان میں ہے کبھی اُردو میں لکھنے کے متعلق نہیں سوچا؟

خورشید مستانہ: اُردو لکھنے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ پنجابی ماں بولی تھی اس لیے کسی لغت کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اُردو میں لکھنے کے لیے زیادہ جدوجہد کرنا پڑتی، لغات اور عروض کا مطالعہ کرنا پڑتا۔ پنجابی زبان میں ہی خواب اور خیال آتے تھے اسی لیے مناسب بھی یہی لگا کہ ماں بولی کے ذریعے ہی لوگوں سے اور خود سے ہم کلام ہوا جائے۔

ارژنگ: آپ عملی سیاست میں پچھلے چالیس سال سے سرگرم ہیں۔ کئی بار کونسلر منتخب ہوئے ہیں اور عوامی جلسوں میں سیاسی نظمیں پڑھتے ہیں۔ سیاست میں کیسے آئے؟

خورشید مستانہ: سیاست میں تو سیاستدان مجھے کھینچ لائے۔ آپ کے سوال کے جواب میں منیر نیازی کا صرف یہ شعر پیش کروں گا:

کجھ انج وی راہواں اوکھیاں سن، کجھ گل وچ غم دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوگ وی ظالم سن، کجھ سانوں مرن دا شوق وی سی

ارژنگ: کیا زندگی میں کبھی عشق کیا؟

خورشید مستانہ: عشق کیا اور بھرپور کیا۔ میرے نام کی نسبت اسی عشق کی ہے۔ اگر عشق کا تڑکا نہ لگے تو شاعری بے کار ہے۔ مگر ایک بات ہے آدمی جب ایک دفعہ عشق میں ناکام ہو جائے تو پھر وہ ہرجائی ہو جاتا ہے۔ وہ ہر محبت میں پہلی محبت کا نشہ اور سرور تلاش کرتا ہے مگر پہلی محبت جیسی سرشاری اور بےخودی دوبارہ کسی محبت میں نصیب نہیں ہوتی۔ آج کل تو

حالات ہی کچھ اور ہیں۔ عشق موبائل فونوں پر ہوتے ہیں۔ ہمارے وقت میں تو کہانی ہی دوسری تھی۔

''چھلا دے جانشانی تیری مہربانی''

ارژنگ: کیا آج کا دانشور اور ادیب اپنا صحیح کردار ادا کر رہا ہے؟

خورشید مستانہ: میں نہیں سمجھتا کہ آج کا ادیب اور دانشور طبقہ اپنا کردار نبھا رہا ہے۔ ادیب اور دانشور اپنی سماجی اور معاشرتی ذمہ داریاں نبھانے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ مصلحت اندیشی کا دور دورہ ہے۔ شاعر کا معاشرے میں وہ کردار نظر نہیں آتا جو ہوا کرتا تھا۔ سچائی اور انصاف کا ساتھ دینے کی بجائے ذاتی مفادات کو ترجیح دینا تو کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے۔ اہل قلم پر تو انصاف اور سچائی کے ساتھ کھڑے ہونے کی شرط تو یوں بھی لازم ہے کہ ہم لوگ ان بلند اخلاقی رویوں کی تبلیغ کرتے ہیں۔ جس محبت اور وفاداری کا ذکر ہم لوگ اپنی شاعری میں کرتے ہیں ہمیں عملی زندگی میں بھی ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

راجہ رسالو

- پنجابی زبان وادب کی راہ میں جان بوجھ کر روڑے اٹکائے جا رہے ہیں۔
- رائٹرز گلڈ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔
- ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی بینیفٹ شو یا میچ منعقد ہونا چاہئیں۔

راجہ رسالو ۱۱ جولائی ۱۹۲۸ء کو وار برٹن ضلع شیخو پورہ چک نمبر ۵۹۰ میں حاجی میاں سلطان محمد کے گھر پیدا ہوئے میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول شیخو پورہ سے پاس کیا ورثے میں ملے ادبی ماحول اور طبیعت میں فطری ادبی لگاؤ کی وجہ سے ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا آج کل پاکستان رائٹرز گلڈ پنجاب کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''سوانح ڈاکٹر نذیر احمد'' پرنسپل گورنمنٹ کالج، ''پنجاب دے لوگ گیت''، ''پنجابی دی دوسری کتاب'' (پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ) ''آ وا جائی'' (بچوں کے لئے معلوماتی مضامین) اور ''لوریاں'' کے نام قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ ''گلاں داتا دے شہر دیاں'' کے عنوان سے، ''امروز'' اور مغربی پاکستان میں ''راجدھانی'' کے عنوان سے اور پنجابی اخبار ''سجن'' میں ''لہراں بہراں'' کے عنوان سے کالم لکھتے رہے ہیں آج کل روز نامہ جنگ کے ادبی صفحے کے لئے سالانہ پنجابی ادب کا جائزہ لکھتے ہیں پنجابی زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے خاص طور پر راجہ رسالو کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

چٹان: ادب کی طرف کیسے آنا ہوا؟

راجہ رسالو: میرے والد مرحوم حاجی سلطان محمد اپنے وقت کے پرائمری پاس تھے۔ آس پاس کے تین چار دیہاتوں میں لکھنے پڑھنے کا کام ان کے ذمے تھا۔ ان کے علاوہ میرے دو بڑے بھائی حاجی محمد عاشق اور محمد حسین قرآن پاک کے علاوہ پنجابی کتابیں پڑھ لیتے تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں لکڑی کا صندوق دیکھا جس میں بے شمار کتابیں تھیں ان میں ہیر وارث شاہ، سید فضل شاہ کی سوہنی، مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا میاں محمد بخش کی سیف الملوک امام بخش کی شاہ بہرام اور دیگر چند قصے تھے۔ سکول سے واپس آ کر اور بھینسوں کو چرانے سے فرصت نکال کر یہ کتابیں پڑھتا جس سے آہستہ آہستہ خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

چٹان: آپ کی پہلی باقاعدہ تخلیق کیا تھی؟

راجہ رسالو: جہاں تک میری پہلی تخلیق کا تعلق ہے میرا مضمون ''پورن دا کھوہ'' کے عنوان سے ۱۹۴۸،۴۹ء میں ماہنامہ پنجابی میں شائع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر مرحوم مولانا عبدالمجید سالک اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر تھے۔

چٹان: آپ نے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ پنجابی زبان وادب کی ترقی وترویج کے لئے صرف کیا ہے۔ آپ کے خیال میں پنجابی زبان وادب کی راہ میں کیا رکاوٹ ہے۔

راجہ رسالو: اس سلسلے میں میرے خیال کے مطابق فنڈز کی کمی ہے۔ نہ گورنمنٹ گرانٹ دیتی ہے اور نہ صنعتکار اشتہار دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ پنجابی زبان وادب کی راہ میں جان بوجھ کر روڑے اٹکائے جارہے ہیں۔ سندھ میں سندھی بولی جاتی ہے۔ سندھی اخبار ورسائل نکلتے ہیں۔ باقی صوبوں میں بھی ایسے ہی حالات ہیں لیکن پنجاب میں اس کے برعکس آج تک کوئی پنجابی اخبار یا رسالہ کامیاب نہیں ہوا۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ لوگ پنجابی پڑھنا یا بولنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ جان بوجھ کے ایسے حالات پیدا کئے جارہے ہیں کہ پنجابی بولنے اور پنجابی پڑھنے والوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ ایک دور تھا پنجابی اخبار ''سجن'' بہت پڑھا جاتا تھا۔ آج بھی میری گلی کا ہاکر مجھے دیکھ کر یہ نعرہ لگاتا ہے کہ ''آ گیا سجن''، مگر اس کو بھی یہی مجبوری آڑے آ گئی تھی کہ یعنی اشتہار یا تو بالکل ہی نہ ملے یا ملے تو

انتہائی تھوڑے۔ آپ اندازہ کریں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں جب میاں نواز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ''سجن'' کو پورے سال میں صرف ۳۲ روپے کا ایک اشتہار ملا تھا اور وہ پنجاب سے باہر کے علاقوں سے۔

چٹان: پنجابی زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں اخبارات و رسائل کا کیا کردار رہا ہے؟

راجہ رسالو: اس سلسلہ میں سب سے پہلے روز نامہ ''امروز'' کا نام لوں گا پنجابی ادب کی ترقی میں امروز کا بڑا عمل دخل رہا ہے امروز کی وساطت سے خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں نے بھی پنجابی ادب پڑھنا شروع کر دیا امروز کا پنجابی صفحہ امروز کے ایڈیٹر جناب احمد ندیم قاسمی نے میاں افتخار الدین کے کہنے پر شروع کیا تھا۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں اس صفحے میں امروز کے بند ہونے تک لکھتا رہا۔ پہلے راجدھانی دا روزنامچہ کے عنوان سے اور بعد میں'' گلاں دا تا شہر دیاں'' کے نام سے میرے کالم امروز میں چھپتے رہے۔

چٹان: آپ نے زیادہ تر پنجابی زبان میں لکھا ہے اس کی خاص وجہ؟

راجہ رسالو: اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اگر مجھے کوئی زبان تھوڑی بہت آتی ہے تو وہ پنجابی زبان ہے۔ میں زبان و ادب کے معاملے میں آج بھی طالبعلم ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جیسا میں پہلے بیان کر چکا ہوں میں نے جب پڑھنا شروع کیا تو میرا سب سے پہلا واسطہ پنجابی کتابوں سے پڑا تھا۔ پنجابی کا رنگ مجھ پر اتنا گوڑا چڑھا ہوا ہے کہ کسی اور زبان کی طرف دھیان دینے کو جی ہی نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر پنجابی لکھتا ہوں۔

چٹان: شاعر یا ادیب نہ ہوتے تو کیا ہوتے؟

راجہ رسالو: شاعر یا ادیب نہ ہوتا تو گاؤں میں یا تو رانجھے کی طرح بانسری بجاتا یا بھینسیں چراتا۔

چٹان: آپ کی اولاد میں سے کسی کا ادب کی طرف رجحان ہے؟

راجہ رسالو: جی اللہ کی مہربانی سے میری ایک بیٹی شاعرہ ہے وہ لاہور کالج کی گریجویٹ ہے چونکہ بال بچے دار ہے اس لئے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دے پاتی۔ اس کے علاوہ میرا بیٹا غلام حسین صادق نثر لکھتا ہے اس کے مضامین ''لہراں'' میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

چٹان: ادبی گروہ بندیاں ادب کے لئے سود مند ہیں یا نقصان دہ؟

راجہ رسالو: گروہ بندیاں سیاست میں ہوں یا برادری قبیلے میں نقصان دہ ہوتی ہیں ادیبوں کی ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی نئی نسل کو ادب سے متنفر کر رہی ہے یہی وجہ ہے کہ نئی نسل ادباء کے قریب جانے سے کتراتی ہے۔ایک دور تھا شاگرد اپنے اساتذہ کا نام بڑے فخر سے لیا کرتے تھے۔آج کوئی کسی کا شاگرد بننے کو تیا نہیں اور اس کی وجہ صرف یہی اساتذہ کا غیر مناسب رویہ ہے۔

چٹان: آپ پاکستان رائٹرز گلڈ سے وابستہ ہیں جس کے منشور کا ایک اہم حصہ ادیبوں کی فلاح و بہبود ہے۔اس حوالے سے پاکستان رائٹرز گلڈ ادیبوں کی بہتری کے لیے کیا کر رہا ہے؟

راجہ رسالو: ادیبوں کے لئے تو خیر کیا کرنا ہے آج کل تو پاکستان رائٹرز گلڈ اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہی ہے۔

چٹان اس کی کیا وجہ ہے؟

راجہ رسالو: وہی بنیادی وجہ فنڈز کی کمی ہے پہلے حکومت ہمیں کبھی کبھار فنڈ دے دیتی تھی اب وہ بھی نہیں ملتے۔

چٹان: جس طرح فنکاروں اور کرکٹروں میں اپنی برادری کی مدد کے لئے بینیفٹ شو یا میچ منعقد ہوتے ہیں کیا یہ ممکن نہیں کہ ادیبوں کی مالی امداد کے لیے بھی ایک ایسی تنظیم کا وجود عمل میں لایا جائے۔جو ہر سال ادیبوں کے لیے بینیفٹ پروگرام منعقد کروائے اور اس پروگرام کی آمدنی بذریعہ قرعہ اندازی اس تنظیم کے ممبر ادیب کو دی جائے۔

راجہ رسالو: میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے یہ بہت اچھی تجویز دی ہے ایسا بالکل ممکن ہے اور اس پر باقاعدہ عمل ہونا چاہئے۔کیونکہ ہمارے جہاں بعض ایسے ادیب اور لکھنے والے بھی ہیں جن لوگوں نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزار دی اور اپنی ذات یا اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کر سکے۔اور اب ان کی حالت یہ ہے کہ نہ تو کسی کے آگے ہاتھ پھیلا سکتے ہیں نہ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی تنظیم کا وجود عمل میں لایا جائے جو پہلے تو ملک گیر سطح پر ادیبوں اور دانشوروں کی تنظیم سازی کرے اور اس کے بعد

بینیفٹ پروگرام منعقد کروائے اوراس کی آمدنی بذریعہ قرعہ اندازی کسی نہ کسی ادیب کو اس طریقے سے دی جائے کہ اس کی عزت نفس مجروح نہ ہواوراس کی مدد بھی ہو جائے اس سلسلے میں میرٹ کو اولیت حاصل ہونی چاہیے ملک کے چند بڑے ادیبوں کو مل بیٹھ کر ایسا طریقہ وضع کرنا چاہیے کہ یہ سارا عمل شفاف طریقے سے طے پائے اور حق دار کو اس کا حق ملے اور وقت پر ملے۔

چٹان: پاکستان رائٹرز گلڈ پہلے کی طرح فعال ہو جائے گی؟

راجہ رسالو: میری خواہش تو یہی ہے لیکن میرے اکیلے کے چاہنے سے تو کچھ نہیں ہو گا سب مل کر اس کی طرف دھیان دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ فعال نہ ہو۔

چٹان: پنجابی کے کن ادیبوں اور شاعروں نے آپ کو متاثر کیا؟

راجہ رسالو: شروع میں وارث شاہ، مولوی عبدلستار، مولوی غلام رسول اور میاں محمد بخش کو پڑھا اس کے بعد بلھے شاہ، شاہ حسین، خواجہ غلام فرید، اور بابا فرید سے راہنمائی حاصل کی جس پر مجھے فخر ہے۔ ان کے علاوہ استاد دامن، احمد راہی، نجم حسین سید، مشتاق صوفی، منیر نیازی، افضل پرویز، افضل احسن رندھاوا، امرتا پرتیم، اور پروفیسر موہن سنگھ ماہر جیسے بڑے اور سچے شاعروں سے متاثر ہوں نئی نسل میں شفقت تنویر مرزا، منشا یاد محمد آصف خان، فرخندہ لودھی اور رفعت سلطان نے بڑا متاثر کیا۔

ڈاکٹر ریاض مجید

○ نعت کی طرح ریڈیو اور ٹی وی پر حمد کے مشاعرے ہونے چاہئیں۔

○ غزل نے کسی دور میں نہ شاعروں کو مایوس کیا اور نہ سامعین کو۔

○ نظم کے لیے مخصوص کسی بڑے شاعر کی کمی اب تک محسوس کی جا رہی ہے۔

ارژنگ: آپ کی پیدائش کب، کہاں اور کون سے گھرانے میں ہوئی؟ نام، قلمی نام، ولدیت۔

ریاض مجید: تاریخ پیدائش 12 اکتوبر 1942۔ مقام گڑھا (جالندھر کینٹ، مشرقی پنجاب انڈیا) اصل نام: ریاض الحق طاہر، قلمی نام: ریاض مجید۔ ولدیت: عبدالمجید

میری پیدائش جالندھر کے مولوی خاندان میں ہوئی جو گزشتہ کئی صدیوں سے درس و تدریس سے متعلق رہا ہے۔ خاندان مغلیہ کے دور میں اس خاندان کے دو بڑے عالم مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا محمد محسن قاضی القضات کے درجے پر فائز تھے۔ مولوی عظیم مصنف ''علی نامہ'' سے اس خاندان کی ادبی حیثیت کا ریکارڈ دستیاب ہے۔ ان کے بیٹے مولوی محمد سلیم (1805 تا 1880) مصنف گلزار محمدی، گلزار سکندری، گلزار موسیٰ، گلزار آدم نے قصص الانبیاء کو منظوم کیا۔ گلزار محمدی، پنجابی زبان میں منظوم سیرت کی پہلی کتاب ہے۔ اس خاندان کا ابتدائی سراغ محلہ دریا گنج دہلی کی تاریخی مسجد جسے عرف عام میں گھٹا مسجد کہتے تھے، سے ملتا ہے۔ بعد میں یہ خاندان لدھیانہ منتقل ہوا اور پھر بعد میں گڑھا وہند (موجودہ جالندھر کینٹ) میں منتقل ہو گیا۔ مولوی محمد سلیم اور ان کے بیٹے محمد علی یہیں مدفون ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ خاندان اور اس کے مختلف افراد لاہور، ملتان اور فیصل آباد

میں رہائش پذیر ہوئے۔امثال القرآن اور مثنوی سیلاب عشق کے مصنف حمید مسلم اور شانِ غزل (ہم طرح دیوان غالب) کے مصنف عبدالغفور سلیمان سیماب کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔اسی طرح کانٹے اور کلیاں، سیل دوراں، الغزال، باران رحمت (نعت) اور صبح صادق (نعت) کے مصنف میر کمال مسلم کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہے۔اس خاندان کی تفصیلات تاریخ ارائیاں، مطبوعہ علمی بک ڈپو لاہور اور تحقیقی مقالہ مولوی محمد سلیم (حیات و خدمات) میں مل سکتی ہیں۔

ارژنگ: اپنے والدین اور اپنے بچپن کے بارے میں کچھ فرمائیں۔

ریاض مجید: میرے والد عبدالمجید 1953ء میں فوت ہوئے۔اس وقت میں چھٹی جماعت میں زیر تعلیم تھا۔میری پرورش میری والدہ عزیز بیگم (جو اپریل 2002ء میں نوے سال کی عمر میں فوت ہوئیں) نے کی۔میری تعلیم کی ذمہ داری میرے بڑے بھائیوں احسان الحق اور اکرام مجید نے سنبھالی۔بچپن میں مجھے کرکٹ کھیلنے اور مطالعے کا زیادہ شوق تھا۔میرے ماموں حمید جالندھری مصنف (شام صحرا) اور مالک مکتبہ کاروان لاہور کی طرف سے مطالعے کے لیے تازہ بہ تازہ کتابیں مل جاتی تھیں۔یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا۔

ارژنگ: تعلیمی کیفیت اور ایسے اساتذہ کرام کا ذکر جن سے آپ متاثر ہوں؟

ریاض مجید: میں نے میٹرک سٹی مسلم ہائی سکول لائل پور، ایف اے اور بی اے گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے کیا۔بی اے میں نے یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل کی۔اس کے بعد میں نے ایک سال میں ایم اے (اُردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1964 میں کیا۔ 1981ء میں یونیورسٹی میں ہی اُردو نعت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔میرے اساتذہ میں مرزا محمد منور، سجاد باقر رضوی، حمید احمد خان (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)، وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی اور سیّد عبداللہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔سجاد باقر رضوی صاحب سے دوستانہ انداز میں زمانہ تعلیم کے بعد بھی متعدد صحبتیں رہیں۔اسی طرح مرزا محمد منور اور سیّد عبداللہ سے بھی آخری وقت تک نیازمندی کا سلسلہ جاری رہا۔

ارژنگ: پہلی حمد اور نعت کب کہی اور اس کے محرکات کے بارے میں اظہار فرمائیں؟

ریاض مجید: پہلے حمدیہ اور نعتیہ اشعار کے بارے میں پوری طرح تعین کرنا تو شاید ممکن نہیں لیکن غالباً 1961ء کے زمانے میں، میں نے پہلی نعت کہی۔ میری ایک فارسی نعت اسی زمانے میں روزنامہ ''عوام'' فیصل آباد میں چھپی ملتی ہے۔ اس زمانے میں رمضان المبارک میں نعت خوانوں کی مختلف ٹولیاں مختلف گلی محلوں میں گھومتی تھیں اور نعتیں لحن کے ساتھ پڑھ کر لوگوں کو سحری کے وقت جگانے کا مبارک فریضہ سرانجام دیتی تھیں۔ میں نے ابتدائی چند نعتیں اپنے محلے میں گشت کرنے والی ایک ایسی ہی پارٹی کے لیے لکھیں۔ پہلی باقاعدہ طویل حمد میں نے 1973ء میں سفر عمرہ کے لیے بحری جہاز سفینہ عابد میں جدہ جاتے ہوئے لکھی۔ یوں ایک محتاط اندازے کے مطابق میں اپنی نعت گزاری کے آغاز کا تعین 1961ء اور حمد کا 1973ء سے کرسکتا ہوں۔ اگر متفرق شعروں کے حوالے سے بات کی جائے تو شاید اس کا ابتدائی سراغ 1961ء اور 1962ء کے درمیان ہی مل جائے۔ جب میں نے بچوں کے لیے نظموں میں یا غزل اور نظمیں حمد اور نعتیہ عناصر پر کچھ لکھا۔

جہاں تک حمد اور نعت کے محرکات کا تعلق ہے ان کا زیادہ تر تعلق باطنی احساسات، جذبات سے ہوتا ہے۔ ایسی کچھ شاعری نعتیہ مشاعروں میں شرکت کی غرض سے بھی لکھی۔ خصوصاً اسی زمانے میں عید میلاد النبیؐ کے حوالے سے شہر میں منعقد ہونے والے ایک مشاعرے کے لیے میں نے ایک خمسہ لکھا جس میں پانچواں مصرع ٹیپ کے مصرعے کے طور پر بار بار دہرایا جاتا تھا۔ اسی زمانے سے غالباً (1962ء میں) عید میلاد النبی ﷺ کے دنوں میں بھی روزنامہ ''عوام'' فیصل آباد (تب لائل پور) میں چھپا۔

ارژنگ: حمد صنف سخن ہے یا نہیں؟ تفصیل سے بیان کریں۔

ریاض مجید: حمد ایک باقاعدہ صنف سخن ہے اور اپنی فکری ارفعیت اور فنی عظمت کے حوالے سے ان تمام خصوصیات اور صفات پر پورا اُترتی ہے جو کسی بھی صنف کے لیے ضروری ہے۔ آغاز شاعری سے لے کر اب تک تعداد میں کم ہونے کے باوجود عہد بہ عہد حمدیہ اشعار کا گراں قدر ذخیرہ موجود ہے جنہیں عظیم شاعروں نے تخلیق کیا اور اپنے فکری اور محاسن کے اعتبار سے ارفع ادب کے درجے پر فائز ہے۔ فارسی شاعری کو ہی لیجیے۔ ایک ہزار سال سے

زیادہ عرصہ پر پھیلی ہوئی فارسی شاعری میں ہر بڑے شاعر کے ہاں حمدیہ اشعار سر دیوان ہی دستیاب ہیں جو ہر لحاظ سے فکری اور فنی معیارات کے امین ہیں۔ عصر حاضر میں با قاعدہ نعتیہ دیوان بھی چھپ رہے ہیں جو فن کی جملہ خوبیوں کے آئینہ دار ہیں۔

ارژنگ: کیا حمد و نعت کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے یا نہیں؟

ریاض مجید: دیکھنا چاہیے۔ جب ہم حمد و نعت کو بحیثیت صنف سخن شمار کرتے ہیں تو اس کا اعتبار اور وثوق اسی صورت میں قائم رہے گا۔ جب اس کو مروّجہ تنقیدی معیارات کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ اگر چہ ان اصناف کی بنیاد عقیدت محض پر ہے۔ مگر یہ عقیدت فن کا درجہ تبھی اختیار کر سکتی ہے جب اس میں وہ تمام فنی محاسن موجود ہوں جو ہر دور میں ادبیات عالیہ کی کسوٹیوں میں شامل رہے ہیں۔

ارژنگ: ترویج حمد و نعت کے لیے حکومت کو کوئی تجویز دینا چاہیں گے؟

ریاض مجید: نعت کی طرح ہر ریڈیو اور ٹی وی پر حمد کے مشاعرے ہونے چاہئیں اور صدارتی سیرت ایوارڈ کی طرح حمدیہ کتابوں پر بھی انعامات دیے جانے چاہئیں۔ اگر حمد کے حوالے سے با قاعدگی سے کوئی ماہنامہ بھی اشاعت پذیر ہو سکے تو اس سے حمد کے رجحانات اور میلانات کی ارتقائی صورت سامنے آسکے گی۔

ارژنگ: زندگی کی اہم تمنا کے بارے میں بتائیں؟

ریاض مجید: خاتمہ بالخیر۔

ارژنگ: اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تفصیلات بتائیں۔

ریاض مجید: فہرست درج ذیل ہے۔

1- پس منظر (غزلیں) 1973

2- گزرے وقتوں کی عبارت (غزلیں) 1973ء

3- ڈوبتے بدن کا ہاتھ (نظمیں) 1974ء

4- انتساب (نظمیں) 1978ء

5- اُردو میں نعت گوئی (مقالہ پی ایچ ڈی) 1990ء

6- توے دے تارے (پنجابی نظمیں) 1987ء
7- حی علی الثناء (پنجابی نعتیہ ہائیکو) 1991ء
8- اللھم صل علی محمد (نعتیہ مجموعہ) 1994ء
9- خودی تے بے خودی (علامہ اقبال کی معروف مثنوی اسرار و رموز کا تنقیدی جائزہ)
10- سر دوش ہوا (کلیات نظم خلیق قریشی) 1994ء
11- پڑھ بسم اللہ (پنجابی بال شاعری) 1991ء
12- نئی آوازیں (جدید غزل کا انتخاب) 1972ء
13- رفحان میں ایک شام (کل پاکستان مشاعرے کی روداد) 1978ء
14- انتخاب روشنی (گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے علمی و ادبی مجلے کا پچاس سالہ انتخاب) 1974ء
15- روشنی کے گیت 1972ء
16- تعمیر نو کے گیت (ملی نغموں کا انتخاب) 1972ء
17- سیدنا احمد ﷺ (پنجابی نعتیہ دیوان) 2000ء
18- خاک (غزلیں) 2003ء اُردو
19- بے چہرہ کونپلیں (نظمیں) اُردو (زیر طبع)

متعدد نعتیہ مجموعے/حمدیہ مجموعے/اُردو پنجابی شعری مجموعے/مضامین کی کتب (15 کتب)

ارژنگ: حمد و نعت کہنے کے لیے بنیادی طور پر کن باتوں کی اشد ضرورت ہے؟

ریاض مجید: فنی لوازمات کے حصول کے ساتھ ساتھ اخلاص اور حب اطاعت نژاد کی ضرورت ہے۔ یعنی شاعر ادبیات عالیہ کی تخلیق کے مروّجہ لوازمات کے ساتھ ساتھ اخلاص و اطاعت کے اوصاف سے متصف ہو۔

ارژنگ: حمدیہ ادب کے حوالے سے تحریر و تحقیق پر کوئی کام کرنے کا ادارہ ہے؟

ریاض مجید: گزشتہ پچیس سالوں کی نعت پر تحقیق یعنی پی-ایچ-ڈی کے مقالے (جو 1975ء تک کی نعت گوئی کو محیط تھا) میں اضافہ۔

لغت نعت کی تدوین/حمد و نعت کے حوالے سے مختلف کتابوں کی تخلیق و تدوین

ارژنگ: کیا آپ کے قلب میں کبھی یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایک مجموعہ حمد بارگاہ ایزدی میں پیش کیا جائے؟

ریاض مجید: الحمدللہ! ''ربنا لک الحمد'' کے نام سے میرا ایک حمدیہ مجموعہ زیر اشاعت ہے۔ جبکہ ایک مجموعہ حمدیہ دیوان، ایک مجموعہ حمد و مناجات باعنوان ''آمین'' اور کچھ دوسری حمدیہ کام کی ترتیب بھی میرے پیش نظر ہے۔

ارژنگ: کیا شاعری میں آپ کے کوئی باقاعدہ اُستاد ہیں؟

ریاض مجید: اس بارے میں عرض ہے کہ میں نے اپنی شاعری کا آغاز بچوں کی نظموں سے میٹرک کے زمانے میں کیا اور اس ذیل میں کسی سے تلمذ حاصل نہیں۔

ارژنگ: جدید غزل کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟

ریاض مجید: جدید غزل کا آغاز ہم نے نہیں کیا۔ یہ تو مرزا غالب سے بھی پہلے ہو چکا ہے۔ بلکہ جدید اور قدیم کی بحث ایک حد تک اضافی ہے۔ کیونکہ ہر زمانے میں جدت کا ایک رُخ موجود رہا ہے۔ جو غالب تک آتے آتے باقاعدہ طور پر کلاسیکل غزل سے مختلف ہو چکا تھا۔ جہاں تک ملی حوالے سے تعلق ہے حالی نے اس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ پھر اقبال سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ آج کے شاعروں تک آتا ہے۔ ہم جدت کو اس حوالے سے لیتے ہیں کہ فرسودہ مضامین سے اجتناب کیا جائے اور ذاتی واردات کے حوالے سے جدید احساسات کو بیان کیا جائے اور فرسودہ تشبیہات اور استعارات سے بچتے ہوئے شعر کہے جائیں۔ اس موضوع پر امجد اسلام امجد کی ایک کتاب بھی ہے جس میں انہوں نے پرانے شاعروں کے ہاں ان عناصر کو دریافت کیا ہے جو آج کے لگتے ہیں۔ جدید ترین غزل کا آغاز 60ء کی دہائی میں ظفر اقبال، منیر نیازی، شہزاد احمد اور شکیب جلالی کر چکے تھے۔ اگر ہم صرف ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہیں تو ظفر اقبال کی ''آبِ رواں'' اس طرح کی غزل کی رجحان ساز کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ میں نے جب جدید غزل کا آغاز کیا اس وقت فیصل آباد میں حزیں لدھیانوی، خلیق قریشی اور منظور بڑی کامیابی سے غزل کہہ رہے تھے۔ ان کے ہاں کلاسیکی شاعری بھی

بڑے احترام کے ساتھ موجود تھی۔ جدیدیت کے علمبرداروں میں افضل احسن رندھاوا، اکرام مجید اور نظم میں فاروق حسن اور نذیر ناجی کے نام نمایاں تھے۔ 1972ء میں میں نے فیصل آباد سے 12 جدید شاعروں کے کلام پر مشتمل کتاب ''نئی آوازیں'' مرتب کی جس میں افضل احسن، احسن زیدی، انور محمود، حزیں لدھیانوی، تنویر جیلانی، حسن نثار اور میرے ساتھ ساتھ دیگر احباب شامل تھے۔ عدیم ہاشمی فیصل آباد کے حوالے سے اپنی شناخت نہیں چاہتے تھے اس لیے بوجوہ ان کا کلام اس کتاب میں شامل نہ ہو سکا۔

ارژنگ: آج کی غزل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ریاض مجید: غزل نے کسی بھی دور میں نہ شاعروں کو مایوس کیا نہ سامعین کو۔ گزشتہ آٹھ دس برسوں میں غزل اور بھی بہتر ہو گئی ہے۔

ارژنگ: جدید غزل میں فیصل آباد کے شعراء کا کیا کردار ہے؟

ریاض مجید: اگر ہم بعد میں آنے والوں کو پانچ پانچ سال کے ادوار میں تقسیم کریں تو کوثر علی، زاہد فخری، خاور زیدی، انجم سلیمی، مقصود وفا، خاور جیلانی اور اگر موجودہ دور کا ذکر کریں تو علی زریون اور احمد سلیم روفی کا کلام فیصل آباد کی شاعری کے ثروت مند ہونے کا ثبوت ہے۔ فیصل آباد نے قریباً چالیس کے قریب شاعر غزل کو دیے۔

ارژنگ: کیا جدت صرف موضوعات کی حد تک محدود ہے؟

ریاض مجید: نادرہ کاری کہنے کے انداز کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ طرزِ احساس نیا ہو اور سچی اقدار کے ساتھ بات کرنے کا انداز بھی نیا ہو۔ یہی جدت ہے۔

ارژنگ: کیا اُردو شاعری میں انگریزی الفاظ کا استعمال درست ہے؟

ریاض مجید: کوملتا اور سنک پن کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ آپ ٹی ایس ایلیٹ کی نظم دیکھیں انگریزی نظم ہے لیکن شانتی شانتی پہ ختم ہوئی ہے جو ہندی کا لفظ ہے۔ موبائل فون ہمارے استعمال میں ہے مگر شاعری کیوں اس سے محروم ہے؟ حالانکہ محبوب کی گفتگو بھی ہوا کی لہروں پر سفر کرتی اور اس فون کے ذریعے کانوں میں رس گھولتی ہے۔

ارژنگ: کیا مجید امجد کے ہاں عروض کے کچھ مسائل ہیں؟

ریاض مجید: ان کے ہاں ایک مسئلہ ہے۔ ان کی بعض نظموں میں ایسی لائنیں موجود ہیں جو عروضی تقاضے پورے نہیں کرتیں۔ انہیں ہم نثری لائنیں کہہ سکتے ہیں۔ اس کا ذکر میں نے کچھ مجید امجد شناس لوگوں میں بھی کیا تھا اور میں اب بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں۔

ارژنگ: معریٰ نظم کی طرف شعراء کی توجہ کم کیوں ہے؟

ریاض مجید: نظم کے لیے مخصوص بڑے شاعر کی کمی اب تک محسوس کی جا رہی ہے۔ ایک کمی جو نظم میں محسوس کی جا رہی ہے وہ حسیات کی شاعری کا فقدان ہے۔ جس کی وجہ سے قاری نظم سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ میری کتاب ''انتساب'' میں آٹھ دس معریٰ نظمیں شامل ہیں۔ عظمت اللہ خان مرحوم اکثر معریٰ نظمیں لکھا کرتے تھے مگر زندگی نے انہیں کتابی شکل دینے کی مہلت نہیں دی۔ موجودہ شعراء میں آپ کی بھی کچھ معریٰ نظمیں موجود ہیں۔ نئے لوگوں کو چاہیے کہ معریٰ نظم کی طرف توجہ دیں۔

ارژنگ: نثری نظم کا کیا جواز ہے؟

ریاض مجید: اگر ایک آدمی عروضی آہنگ کا خیال رکھتے ہوئے نہیں لکھ سکتا مگر وہ اندر سے شاعر ہے تو کیا اسے لکھنا چاہیے؟ کہا جاتا ہے کہ اس طرح کے لوگ شاعر بنتے جائیں گے۔ آپ دیکھیں پچاس ساٹھ لاکھ کے شہر میں شاعر ہیں کتنے؟ کتنے ایسے شاعر ہیں جو غزل بھی لکھتے ہیں۔ انکی کتابیں بھی آ چکی ہیں مگر وہ درحقیقت شاعر ہیں۔ ان میں وہ فکری اپچ ہی نہیں ہے کہ انہیں شاعر تسلیم کیا جائے۔ مجھ سے اکثر یہ سوال ہوتا ہے کہ نثری نظم کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک عام اظہار کو آپ جیسے جیسے بلیغ کرتے جائیں گے نثری نظم بنتی جائے گی۔ گلی میں پھول کھلتا ہے عام آدمی کہے گا پھول کھلا ہے۔ یہ کم از کم ایسپریشن ہے۔ ایک آدمی کہے گا پھول مسکراتا ہے۔ یہ شاعری کی طرف ایک قدم ہے۔ اسی طرح ایک آدمی کہتا ہے ٹہنیوں پر چراغ جلا۔ یہ طرز اظہار نثری نظم کے اور قریب ہو جاتا ہے۔ یونہی نثر جیسے علامتی

انداز میں آ گے جائے گی وہ نظم بنتی جائیگی ۔لفظوں کو عروضی ہم آہنگ دینے والے بہت سے ملیں گے لیکن شاعری کہاں ہے؟ایک نثری نظم دیکھیں۔

ہم ندیوں پر رُکتے ہیں
صرف زخم دھونے کے لیے
اور ہماریں مائیں بندوق سے اپنے بچوں کا قد ناپتی ہیں
جب امریکہ کی کسی مل میں ایک گولی بنتی ہے
تو ایک ویت نامی ماں اپنا کلیجہ پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے

آپ شاعر ہیں تو آپ کا اندر خود گواہی دے گا کہ ''تم بڑے وہ ہو تمہیں مار کے ٹکڑے کر دوں'' کی بہ نسبت یہ بہت بڑی شاعری ہے۔اسی طرح نثری نظم اور رہے گی۔یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ جسے نثر بھی لکھنی نہیں آتی ہو وہ نثری نظمیں لکھنے کی ناکام کوشش کرے تو غلط ہے۔میں نے شہزاد صاحب جو عمر اور شاعری کے لحاظ سے مجھ سے بہت بڑے ہیں کی کتاب ''معلوم سے آگے'' کی تقریب میں صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کی یہ نثری نظمیں بھی نہیں ہیں۔

ریحانہ قمر

- شاعری کو اپنے اندر کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہوں۔
- میری شاعری میرے جیسی ہے۔
- کسی کی خامی آپ کی خوبی نہیں بن سکتی۔

ریحانہ قمر اس وقت اُردو زبان کی مقبول ترین شاعرہ ہیں۔ پروین شاکر کے بعد انہوں نے بھرپور انداز میں نسوانی جذبات کی شعری آہنگ میں ترجمانی کی ہے۔ اب تک ان کے چار شعری مجموعے شائع ہو کر عوامی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں جن کے نام ''سوچ کی دہلیز'' پر، ''مگر تم اپنا خیال رکھنا''، ''ہم پھر نہ ملیں شاید'' اور ''تم ہو تو میں بھی ہوں'' ہیں۔ ریحانہ قمر امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا میں مقیم ہیں اور انجمن ترقی اُردو امریکہ کی صدر ہیں۔ آپ امریکہ میں اُردو ادب کی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں میں ہمیشہ صفِ اوّل میں رہتی ہیں اور پاکستان کی طرح امریکہ میں بھی بہت مقبول و معروف ہیں۔ گزشتہ دنوں ارژنگ کے چیف ایڈیٹر امریکہ گئے تو ریحانہ قمر سے ایک غیر رسمی انٹرویو کیا جو نذر قارئین ہے۔

ارژنگ: آپ ایک مقبول شاعرہ ہونے کے علاوہ ایک کامیاب بزنس لیڈی، ایک کامیاب گھریلو خاتون اور ایک معروف سماجی شخصیت ہیں۔ اتنے سارے شعبوں کو بیک وقت کیسے سنبھالتی ہیں؟

ریحانہ قمر: میں جو بھی کام کرتی ہوں پوری لگن اور خلوص کے ساتھ کرتی ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں زندگی کے جن جن شعبوں سے منسلک ہوں تمام میں کامیاب و کامران ہوں۔

ارژنگ: شعری سفر کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ریحانہ قمر: غالباً ساتویں جماعت میں تھی جب شعر کہنے کا آغاز کیا۔ میرے دادا بہت اچھے شاعر تھے۔ اس وجہ سے گھر میں ایک ادبی فضا بچپن ہی سے میسر تھی۔ سب سے اہم بات تو میرے نزدیک یہ ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت قدرتی ہوتی ہے۔ باقی گرد و پیش کے حالات بھی اس پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن بنیادی صلاحیت فطری اور پیدائشی ہوتی ہے۔

ارژنگ: آپ نے شاعری تو کم سنی میں ہی شروع کر دی تھی لیکن آپ کا پہلا شعری مجموعہ کافی تاخیر سے آیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

ریحانہ قمر: اس کی بنیادی وجہ میرے ذاتی حالات ہی تھے۔ شادی کے بعد میں امریکہ آ گئی اور پھر معاشی جدوجہد میں ایک عرصہ گزر گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی گو کہ شعری سفر تو مسلسل جاری رہا لیکن میں گھریلو زندگی کو کافی زیادہ اہمیت دیتی آئی ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میرے شعری سفر کی وجہ سے میری گھریلو زندگی متاثر ہو۔ اس لیے مجموعہ ترتیب دینے میں تاخیر ہوئی۔

ارژنگ: کس شاعر سے زیادہ متاثر ہیں؟

ریحانہ قمر: میں شاعر سے نہیں ہمیشہ شعر سے متاثر ہوتی ہوں۔ اچھا شعر کہنے والا اساتذہ میں سے ہو یا پھر نوآموز ہو اس سے میں سمجھتی ہوں کہ زیادہ فرق نہیں پڑتا اور اچھا شعر تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے۔ ہمارے نوجوان شعراء بھی بعض اوقات چونکا دینے والے اشعار کہتے ہیں۔

ارژنگ: شاعری کے علاوہ کسی اور صنف ادب سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں؟

ریحانہ قمر: میرا بنیادی تعارف اور محبت تو شاعری ہی ہے لیکن میں نے چند افسانے بھی لکھے ہیں اور ایک ڈرامہ بھی لکھ چکی ہوں۔ تاہم میں شاعری ہی کو اپنے اندر کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہوں۔

ارژنگ: جب آپ پر تنقید ہوتی ہے تو کیسا لگتا ہے؟

ریحانہ قمر: اگر تو تنقید تخلیقی سطح پر ہو تو وہ بہت اچھی لگتی ہے اور انسان اس سے سیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھی اور تخلیقی نوعیت کی تنقید سے تو فنکار اپنے ہنر کو مزید بہتر بنانے کی کوشش

کرتا ہے۔ بحیثیت فنکار میں بھی تنقید سے سیکھتی ہوں لیکن اگر تنقید برائے تنقید ہو یا پھر بازاری سطح کی ہو تو پھر اس پر کان نہیں دھرتی۔

میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتی ہوں جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں ایک گھریلو خاتون ہوں۔ اگر گھر میں کبھی زیادہ گہما گہمی ہو اور کچن میں بہت سے استعمال شدہ برتن جمع ہو جائیں اور میں بوجہ مصروفیت انہیں فوری طور پر نہ دھوسکوں تو پھر کچن کی لائٹ بجھا دیتی ہوں۔ خود پر بے جا تنقید کرنے والوں کے ساتھ بھی میرا یہی رویہ ہے۔ ذہن کے جس گوشے میں وہ لوگ بسے ہوتے ہیں میں اس گوشے کی لائٹ بجھا دیتی ہوں اس طرح وہ مجھے باوجود خواہش کے ستا نہیں پاتے۔

ارژ نگ: لوگوں سے کوئی شکایت بھی ہے؟

ریحانہ قمر: مجھے لوگوں سے کم ہی شکایت ہے۔ ویسے بھی میرے لیے ہزاروں کی تعداد میں محبت کرنے والے لوگ زیادہ اہم ہیں۔ اگر چند لوگ اپنی آگ میں جل رہے ہیں تو جلنے دیں۔

ارژ نگ: اپنی مادر وطن سے تو ہر انسان کو پیار ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے ملک کی تو ہر بات اچھی بات لگتی ہے۔ کوئی ایسی خوبی آپ نے امریکی معاشرے میں دیکھی جو ہم میں نہ ہو؟

ریحانہ قمر: ویسے تو ان لوگوں میں کئی خوبیاں ہیں لیکن مجھے جو ان کی خوبی پسند ہے وہ یہ ہے کہ وہ چیزوں کو عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ جو بھی چیز ایجاد کرتے ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس ایجاد کو دُنیا میں زیادہ سے زیادہ انسانوں تک کیسے پہنچایا جائے۔ اگر انہوں نے کمپیوٹر لیپ ٹاپ ایجاد کیا ہے تو اسے افریقہ کے بھی آخری شہر تک پہنچا دیا ہے لیکن ہمارا رویہ اس کے بالکل متضاد ہے۔ ہم چیزوں کو مخصوص کر دیتے ہیں۔ ہر سطح پر ہماری یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو چیز جو فن ہمارے پاس ہے اسے کسی بھی طرح عام نہ ہونے دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ ہمارے معاشرے کی ایک بڑی خرابی ہے۔

ارژ نگ: اچھا آپ کی شاعری کا محور و مرکز عورت کے جذبات و احساسات ہیں اس بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

ریحانہ قمر: یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔ ارے بھئی! جب میں عورت ہوں تو عورت ہی کے جذبات واحساس بیان کروں گی۔ باقی کچھ باتیں بحیثیت انسان مرد وعورت میں مشترک ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ان موضوعات کو بھی Discuss کیا ہے۔ آپ نے میرے مجموعے ''تم ہو تو میں بھی ہوں'' کی آخری نظمیں تو پڑھی ہوں گی لیکن مختصراً بات پھر وہی دہراؤں گی کہ میری شاعری میرے جیسی ہے۔

ارژنگ: آپ گیت نگاری بھی کرتی ہیں۔ موسیقی سے دلچسپی کس حد تک ہے؟

ریحانہ قمر: موسیقی کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ موسیقی کا تعلق واقعی انسان کی روح کے ساتھ ہے اور یہ روح کے لیے ریلیکس ہونے کا سبب ہے۔

ارژنگ: کبھی کسی سے محبت کی؟

ریحانہ قمر: پھر کبھی بتاؤں گی۔

ارژنگ: قارئین کے لیے کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

ریحانہ قمر: قارئین کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ بڑا بننے کے لیے خود محنت کریں۔ دس ہزار لوگوں کو برا مت کہیں۔ کسی کے برا ہونے سے آپ اچھے نہیں ہو جاؤ گے۔ کسی کے چھوٹا ہونے سے کبھی کوئی بڑا نہیں بن سکتا۔ کسی کی خامی آپ کی خوبی نہیں بن سکتی اس لیے خود پر زیادہ محنت کریں اور اپنی تخلیق بہتر بنانے پر زور دیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر

○ مجھے نمود و نمائش پسند نہیں اور نہ ہی مرکز نگاہ بننے کا شوق ہے۔

○ میں نے ریٹائر منٹ کو مسئلہ نہیں بنایا۔ پہلے بھی لکھتا پڑھتا تھا، اب بھی لکھتا پڑھتا ہوں۔

○ آپ کو میرے بنک بیلنس میں شاید کچھ نہ ملے۔

ارژنگ: ڈاکٹر صاحب اس وقت آپ غالباً پینسٹھ برس کے ہو چکے ہیں اور ملازمت سے ریٹائر ہوئے بھی چار پانچ برس ہو چکے ہیں۔ اب جب کہ آپ کی باقاعدہ مصروفیات نہیں رہیں تو آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟

ڈاکٹر سلیم اختر: سچ پوچھیں تو مجھے یہ یاد ہی نہیں رہتا کہ میں ریٹائر ہو چکا ہوں بعض لوگ ریٹائر منٹ یا بڑھتی ہوئی عمر کو اعصاب پر سوار کر لیتے ہیں۔ لیکن میں نے ریٹائر منٹ کو مسئلہ نہیں بنا یا آگے بھی لکھتا پڑھتا تھا، اب بھی لکھتا پڑھتا ہوں بلکہ بہت سے طویل المدت ادبی منصوبے جو میں ملازمت کے دوران مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ ان پر کام کرنے کے لیے میرے پاس خاصا وقت ہے۔ رہی عمر کی بات تو بڑھاپا جسمانی کم اور ذہنی زیادہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں میری افتادِ طبع کچھ الگ سی رہی ہے میں جب جوان تھا تو بعض امور کے لحاظ سے بوڑھا سمجھا جاتا تھا۔ اب جب کہ کیلنڈر عمر کے لحاظ سے بوڑھا ہو رہا ہوں تو مزاج میں چونچال پن بڑھ چکا ہے مجھے کئی بے تکلف دوستوں نے کہا کہ ریٹائر منٹ کے بعد تم زیادہ تیز ہو گئے ہو۔ لہٰذا میں ذہنی طور پر نہ ریٹائر ہوا ہوں اور نہ ہی بزرگوں میں شمار کیا جا سکتا ہوں۔

ارژ نگ: عمر کے اس دور سے جب آپ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟
ڈاکٹر سلیم اختر: جب میں ماضی پر نگاہ بازگشت ڈالتا ہوں تو سود و زیاں کے طویل سلسلے نظر آتے ہیں میں نے زندگی سے کچھ لیا بھی ہے اور اس کے عوض معاشرے کو کچھ دیا بھی ہے اپنی معلمی کی صورت میں اور اپنی تحریروں کے صورت میں بھی، دراصل میں اوائل عمر ہی میں اپنے لیے کچھ ترجیحات کا تعین کر لیا تھا جن میں سرفہرست یہ تھا کہ کوئی کام محض پیسہ کمانے کے لیے نہیں کرنا اسی لیے ساری عمر میں نے امتحانوں کا سپر نٹنڈنٹ بننے کی خواہش نہ کی۔ ایف اے، بی اے کی سطح کے پرچے نہ دیکھے حالانکہ یہ وہ ذرائع ہیں کہ جائز اور ناجائز طریقوں سے خوب پیسہ کمایا جا سکتا تھا۔ یوں وقت اور توانائی بچا کر میں نے تنقید اور افسانہ نگاری کے لیے خود کو وقف کیے رکھا۔ آج آپ کو میرے بینک بیلنس میں شاید کچھ نہ ملے لیکن میں نے جو عزت یا محبت حاصل کی اپنے دوستوں، طالب علموں اور قارئین سے میں اسی سرمایہ کو جانتا ہوں۔
ارژ نگ: آپ کی اس وقت کل کتابیں کتنی ہیں ذرا ان میں سے اہم کتابوں کے نام بھی گنوا دیں؟
ڈاکٹر سلیم اختر: اس وقت میں کتابوں کی نصف سنچری مکمل کر چکا ہوں یہ گفتگو ختم ہونے تک شاید نئی کتاب بھی چھپ چکی ہو میری مراد افسانوں کے تازہ مجموعے ''آدھی رات کی مخلوق'' سے ہے جو اس وقت پریس میں ہے جہاں تک میری قابل ذکر کتابوں کا ذکر ہے تو چند کے نام گنواتا ہوں اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ تنقیدی دبستان شعور اور الشعور کا شاعر، غالب، اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، اقبال اور ہمارے فکری رویے، جوش کا نفسیاتی مطالعہ، تخلیقی اور لاشعوری محرکات وغیرہ۔
ارژ نگ: آپ کی ڈاکٹریٹ کا کیا موضوع تھا؟
ڈاکٹر سلیم اختر: میں نے اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے تحقیقی مقالہ قلم بند کیا تھا۔ یہ مقالہ دو حصوں میں شائع ہوا، ،نفسیاتی تنقید،، اور مغرب میں نفسیاتی تنقید۔

ارژنگ: نفسیات میں آپ نے اور کیا کچھ لکھا ہے؟

ڈاکٹر سلیم اختر: نفسیات کے متعدد موضوعات پر میری کتابیں چھپی ہیں جن میں سے ''عورت، جنس اور جذبات'' سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ ''ہماری جنسی اور جذباتی'' زندگی بھی شائع ہوئی ہے اور پھر فرائڈ، ایڈلر اور ''ژونگ'' کے حالات زندگی اور نفسیاتی تصوارات کے حوالے سے ایک کتاب ہے ''تین بڑے نفسیات دان'' نفسیات کے سلسلے میں آپ کو دلچسپ بات بتاؤں کہ مجھے ایسے قارئین بھی ملے جو صرف میری نفسیاتی کتابوں سے ہی آگاہ تھے بلکہ وہ نفسیاتی کتابوں والے سلیم اختر اور تنقید والے سلیم اختر کو الگ الگ جانتے تھے۔ گزشتہ کئی برس سے ان نفسیاتی کتابوں کے مطالعے کے بعد مجھے متعدد مردوں، عورتوں اور نوجوانوں نے اپنے اپنے جنسی مسائل اور جذباتی الجھنوں کے بارے میں خطوط لکھے۔ جن کا میں اپنی بساط کے مطابق جواب بھی دیتا۔

پچھلے دو تین برس سے کراچی کے ایک خوبصورت انٹرنیشنل میگزین رابطہ میں خودشناسی کے مستقل عنوان تلے میں نفسیاتی مسائل پر لکھ رہا ہوں ان مضامین کی وجہ سے نفسیاتی مشورے طلب کرنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ میری شخصیت کا ایسا پہلو ہے جس سے نہ تو لوگ آگاہ ہیں اور جس کے بارے میں، میں خود بھی بالعموم گفتگو نہیں کرتا۔

ارژنگ: آپ پروفیسر اردو کے ہیں مگر اوڑھنا بچھونا نفسیات کو بنا رکھا ہے یہ کیسے ہوا۔ یعنی اردو سے آپ نفسیات کی جانب کیسے آگئے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں اردو کے پروفیسر بالعموم اردو تک ہی محدود رہتے ہیں؟

ڈاکٹر سلیم اختر: اگر آپ کا خیال ہے کہ نفسیات میری ادبی منصوبہ بندی کا حصہ تھی تو ایسی بات نہیں ہے بلکہ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں نے تو ایف اے میں اردو بھی نہیں پڑھی تھی میں بنیادی طور پر فلسفے کا طالب علم تھا اور فلسفے ہی میں ایم اے کرنے کی خواہش تھی لیکن بعد میں نفسیات کا مطالعہ بڑھتا گیا اور میں اس میں اتنی دلچسپی لینے لگا کہ پھر فلسفے کو ذہن سے نکال دیا اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید میں نے نفسیات میں ایم اے کیا ہوا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔

میں صرف ایم اے اردو ہی ہوں۔ بس مطالعے کا شوق تھا جو ہنوز جاری ہے۔ جب تنقید لکھنی شروع کی تو چونکہ نفسیات کے کثیر مطالعے سے ایک مخصوص زاویہ نگاہ بن چکا تھا لہٰذا تنقید اور افسانوں میں بھی خود بخود نفسیات شامل ہوگئی تاہم میں نے اتنی احتیاط ضرور برتی کہ تنقید میں نفسیات صرف وہیں استعمال کی جہاں اس کی ضرورت یا جواز تھا یونہی بلا سوچے سمجھے اندھا دھند تخلیق کاروں پر نفسیاتی لاٹھی چارج نہیں کیا۔

ارژنگ: اب تک ہم نے بہت گفتگو کی لیکن آپ کے افسانوں کا ذکر نہیں آیا۔ ویسے بھی ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ جس طرح بطور نقاد آپ کا کھڑ کا دڑ کا رہتا ہے اس طرح افسانوں کے بارے میں نہیں ہوتا؟

ڈاکٹر سلیم اختر: آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں تنقید سے کہیں پہلے افسانے لکھنے شروع کیے تھے آپ کو میں تھوڑا پیچھے لے جانا چاہتا ہوں یعنی جب میں انبالے شہر میں تھا اور پانچویں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا اس وقت بچوں کی کہانیاں پڑھتا اور بچوں کے کئی رسالے ابا جی نے جاری کرائے ہوئے تھے یوں پڑھتے پڑھتے کم عمری ہی میں لکھنے کا شوق بیدار ہوگیا اور اسی عمر ہی میں، میں نے بچوں کے رسالوں میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں مضامین اور نظمیں لکھنا شروع کیں قیام پاکستان کے وقت میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میں نے پہلے دو افسانے ،،قربانی،، اور ،،ساحرہ ۱۹۴۹ء میں لکھے جب کہ میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا یہ لاہور کے ایک فلمی پرچے میں چھپے بھی لیکن نہ تو میرے پاس ان کا ریکارڈ ہے بلکہ اب تو مجھے اس پرچے کا بھی نام یاد نہیں جس میں ان کی اشاعت ہوئی۔ دو سال بعد جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا تو رسالہ ''شمع'' دہلی میں میرے دو افسانے ''ایک محبوبہ ایک طوائف'' اور ''کٹھ پتلی'' شائع ہوئے، شمع، اس وقت کا بے حد مقبول پرچہ تھا اس کے بعد بھی کوئی ایک آدھ کہانی چلتی رہی لیکن میں نے یہ ساری کہانیاں کسی مجموعے میں شامل نہ کیں۔ جس افسانے سے میں اپنی افسانہ نگاری کرنا چاہوں گا وہ ہے ''سویٹ ہارٹ' ۱۹۶۲ء کے سالنامہ ادب لطیف، میں مرزا ادیب مرحوم نے اسے شائع کیا اس وقت اس کا خاصا چرچا ہوا اور یہ ہندی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

ارژنگ: آپ کے کتنے افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں؟

ڈاکٹر سلیم اختر: تنقید کے مقابلے میں میرے لیے افسانہ نگاری بہت مشکل ثابت ہوتی ہے اسی لیے افسانے تنقید کے مقابلے میں بہت کم تعداد میں لکھے جا سکے پھر میں افسانے پر زیادہ محنت بھی کرتا ہوں اس کا عنوان، آغاز اور اختتام ان پر میں خصوصی توجہ دیتا ہوں۔ افسانہ لکھ لینے کے بعد اس میں کانٹ چھانٹ کا عمل جاری رہتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی کہانی ہو جس کے تین چار ڈرافٹ نہ بنے ہوں اسی لیے تنقید کے مقابلے میں افسانوی مجموعوں کی تعداد کم ہے۔ اس وقت تک یہ مجموعے چھپ چکے ہیں،، کڑوے بادام،،۔ کانٹھ کی عورتیں چالیس منٹ کی عورت۔۔۔ مٹھی بھر سانپ۔۔۔ اور زیر طبع مجموعہ، آدھی رات کی مخلوق، ان افسانوں کے ساتھ ساتھ ایک ناولٹ بھی ہے۔ ضبط کی دیوار اس کے پاکستان اور ہندوستان میں کئی ایڈیشن چھپے اور یہ ہندی میں بھی ترجمہ کیا گیا ویسے بھی میرے متعدد افسانے انگریزی، ہندی، گرمکھی، بنگلہ اور آسامی زبانوں میں ترجمہ کیے جا چکے ہیں۔

ارژنگ: آپ نے کبھی کسی کتاب کی تقریب رونمائی نہیں کرائی نہ ہی کبھی آپ کے ساتھ کوئی شام وغیرہ منائی گئی؟

ڈاکٹر سلیم اختر: مجھے کتابوں کی رونمائی پسند نہیں اس لیے آج تک میں نے اپنی کسی کتاب کی تقریب منعقد نہ کرائی بلکہ بعض دوستوں یا ناشروں نے ایسا کرنا چاہا تو انہیں بھی منع کر دیا اور آج کل جس پیمانے پر فائیو سٹار ہوٹلوں میں یہ تقریبات منعقد ہوتی ہیں اس خرچ میں تو انسان اپنا ولیمہ کر سکتا ہے۔ مجھے نمود و نمائش پسند نہیں نہ ہی مرکز نگاہ بننے کا شوق ہے اس لیے ان تمام احباب کو سختی سے منع کر دیتا ہوں جو میرے اعزاز میں تقریب منعقد کرنا چاہتے ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں ایک چارم بھی ہوتا ہے اور خاصی پبلسٹی بھی مل جاتی ہے لیکن نہ تو میں اس چارم کا طلب گار ہوں اور نہ ہی پبلسٹی کا شوقین میں نے ساری عمر گھر بیٹھ کر کام کیا ہے مدح اور مذمت سے بے نیاز ہو کر۔ یہ مزاج کا تقاضا ہے اور میں اس طرح خوش ہوں۔

ارژنگ: اس کے باوجود آپ پر خاصا لکھا گیا موافقت میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ بلکہ گزشتہ مہینوں میں یہ خبر بھی چھپی تھی کہ بھارت میں ایک صاحب نے آپ کی تنقید پر تحقیقی

مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر: جی ہاں یہ درست ہے میں غالباً پاکستان کا واحد زندہ نقاد ہوں جسے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس کی زندگی ہی میں اس کی تنقید پر ڈاکٹریٹ دی گئی۔ بھارت کے صوبہ بہار میں ڈاکٹر جلیل اشرف نے اردو تنقید کے فروغ میں ڈاکٹر سلیم اختر کا حصہ کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا اور رانچی یونیورسٹی نے اس پر ڈگری دی تھی مقالے کے نگران مشہور نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی ہیں:۔ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت نقاد، کے عنوان سے یہ مقالہ انڈیا میں اور پھر اس برس پاکستان میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے میرے عزیز دوست ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ''ہم سفر بگولوں کا'' کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی جسے پاکستان کے مشہور ناشر نیاز احمد نے شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ہی میرے بارے میں ایک اور کتاب بھی مرتب کی تھی، ڈاکٹر سلیم اختر، شخصیت اور تخلیقی شخصیت، اسی برس شعبہ اردو گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم محمد سعید اور طالبہ حمیرا ماجد نے ایم اے اردو کے تھیسس کے لیے مجھ نا ہنجار کا انتخاب کیا محمد سعید کے تھیسس کا موضوع ہے، ڈاکٹر سلیم اختر اور مطالعہ غالب و اقبال، ان کے نگران پروفیسر سید معین الرحمٰن ہیں۔

سیف اللہ خالد

○ ادب میں جتنی بھی تحریکیں چلیں سب نے کسی نہ کسی روایت سے اپنی کائنات سجائی۔

○ سب سٹینڈر شاعری جو عوام سے داد وصول کرتی ہے نوجوان شعراء کا معیار قرار پائی ہے۔

○ دھاندلی جیسی بھی ہو میرے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے۔

سیف اللہ خالد کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ بے شمار کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں میں ''ریشم جیسے خواب'' اور ''کبھی تو چاند نکلے گا'' شعری مجموعے ہیں ان کے علاوہ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال اور ''دیباچے سے فلیپ تک'' ان کی بے لاگ تنقیدی کتابیں ہیں اسی بدولت دونوں کتب ادبی حلقوں میں بے حد متنازعہ ہیں۔

چٹان: بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

سیف اللہ خالد: تبدیلی زندگی کا لازمہ ہے۔ صبح و شام ہمیں انقلاب کا پیغام دیتے ہیں اور جمود کو توڑنے کا درس دیتے ہیں ادب بھی زندگی کا ایک خوبصورت اور موثر عنصر ہے لہٰذا اس میں بھی تبدیلی ضروری ہے انسان کے فکری، عملی تغیرات اس کے فن پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں خواہ وہ کسی پیمانے پر ہو ادب زندگی کا ایک اعلیٰ رویہ ہے لہٰذا اس میں بھی ہر آن تازگی

اور جدت کا ہونا ضروری ہے ادب میں جتنی بھی تحریکیں چلیں سب نے کسی نہ کسی روایت سے اپنی کائنات سجائی لیکن ترقی پسند تحریک نے جس انقلابی نقطہ نظر کا آغاز کیا وہ تھا سچ کا پرچم جو ابھی تک لہرا رہا ہے اور ادب کی تمام اصناف پر برابر اثر انداز ہو رہا ہے چنانچہ آج کے جدید ادبی رجحانات پر بھی اس کی روشنی پڑ رہی ہے جینوئن ادب اسی تحریک کے اثرات سے مالا مال نظر آتا ہے ادب کو شعری اور نثری پیمانوں سے ناپا جاتا ہے لہٰذا بدلتے ہوئے ادبی رجحانات ایک عمومی زاویہ نظر ہے آج کے بدلتے ہوئے ادبی رجحانات میں سب سے پہلا رویہ یہ ہے کہ قلمکار نے اپنی ذات کو آفاقی تصور دینے کا رویہ اختیار کیا ہے اس کا آغاز احمد ندیم قاسمی سے ہوا تھا جنہوں نے انسان عظیم ہے خدایا، جیسا عظیم فن پارہ لکھ کر انسان کو کائنات کا مرکز قرار دیا ہے۔

چٹان: قاسمی صاحب کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے تو کیا اس ضمن میں احسان دانش مرحوم کا کیا ذکر کئے بغیر بات تشنہ نہ رہ جائے گی؟

سیف اللہ خالد: یقیناً احسان دانش صاحب کا تذکرہ ضروری ہے بلکہ قاسمی صاحب کے ہم عصر بہت سے ان ادیبوں شاعروں کا حوالہ بھی آتا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں انسان کی عظمت کو اجاگر کیا احسان دانش کا حوالہ اس لئے اہم ہے کہ انہوں نے انسان کے رگ و پے میں مچلتی طاقتوں کو وجدانی بصیرت سے محسوس کیا اور انہیں موثر شعری لباس پہنایا عظمت انسان کی یہ تحریک آگے بڑھی تو زمانہ موجود میں ڈاکٹر وزیر آغا تک پہنچی ان کی تازہ کتاب ''عجب اک مسکراہٹ'' میں یہی ترانہ گونجتا ہے۔ نوجوان قلمکاروں نے انسان کی عظمتوں کو نئے نئے انداز سے اجاگر کیا ہے جدید ادبی رویوں میں ایک اہم رویہ حقیقت پسندی پر مبنی رجحان بھی ہے یعنی اشیاء موجود کو موزوں ڈکشن عطا کر کے سادگی سے بیان کیا جائے مبالغہ آرائی سے گریز کیا جائے زمین اور اس کے مسائل کو اہمیت دی جائے اس مرحلے پر یکایک ہم ایک ایسی حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنا دوران مابعد الطبیعاتی کیفیات سے بڑی حد تک محروم دکھائی دیتا ہے جو کلاسیکی ادب کا خاصا تھیں کیونکہ آج کے ادیب اور شاعر نے یہ بات مان لی ہے کہ مادیت نے جسم کے ساتھ روح کو بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے اور

جولوگ مسند ارشاد پر فائز ہو کر بیٹھے ہیں وہ بھی دراصل مادیت کے اسیر ہیں۔ وہ فقط تصوف کے لالہ وگل سے سجی مسند ارشاد کو اپنی مادی ضروریات کی تسکین کے لئے استعمال کرتے ہیں چنانچہ اس حوالے سے جو جدید ادبی رویہ جنم لیتا ہے وہ ہے مابعدالطبیعات کی طرف ادیب اور شاعر کی توجہ اس حوالے سے شہزاد احمد، از ہر منیر اور وزیر آغا نے خاصا کام کیا ہے با لخصوص آغا صاحب کی کتاب دستک اس دروازے پر، کے کردار، میں اور تو،، نے ان گتھیو ں کو کامیابی سے سلجھایا ہے آج کا شاعر ممتاز اطہر بڑی جرات سے کلاسیکی مابعدالطبیعاتی رو یے پر طنز کرتے ہوئے علی الاعلان کہتا ہے

ہر ایک آنکھ آسمان کی طرف لگی ہوئی
زمین پر جو روشنی کی فصل تھی اجڑ گئی

چٹان: محبت ایک پٹا ہوا موضوع ہے۔ اس کے متعلق جدید ادبی رجحانات میں کیا مثبت تبدیلی آئی ہے؟

سیف اللہ خالد: سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ اب شاعر نہایت حقیقت پسند ہو گیا ہے اور وہ اس بازی گاہ میں جن اضطرابی کیفیات سے گزرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ فریق ثانی بھی انہی مراحل سے گزرے یعنی وہ محبت بھی برابر کی سطح پر کرنا چاہتا ہے جیسے نوجوان شاعر طارق اسد کہتا ہے۔

یہی دن ہیں محبت کے یہی موسم ہیں ملنے کے
یہ دن گزرے تو پھر تیرا سراپا کون دیکھے گا

یہ سب سٹینڈرڈ شاعری جو عوام سے دادِ سخن وصول کرتی ہے نوجوان شعراء کا معیار قرار پائی ہے اور اہل ذوق اصل شاعری کا ذائقہ بھول گئے ہیں اس صورتحال سے ایک ایسے المیے نے جنم لیا ہے جس کی حوصلہ شکنی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس غیر معیاری شاعری کی پذیرائی کرنے والے پیشہ ور دیباچہ نویس اور فلیپ نگار سرگرم عمل ہو گئے ہیں ان کی سفارشوں سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ لوگ،، الم غلم، تحریروں کو ادب سمجھ کر ان پر لٹو ہو رہے ہیں۔

چٹان: ادب میں تشدد اور بدتمیزی کی چند مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں اس کے بارے میں

آپ کیا کہیں گے؟

سیف اللہ خالد: اس سماج میں جہاں ہر چیز نمبر دو ہے ادب بھی دو نمبر ہو گیا ہے اور تخلیق کار بھی اسی قماش کے ہیں ظاہر ہے جب آپ دو نمبر چیز کو ایک نمبر چیز ثابت کرنے پر تل جائیں تو غیر معمولی اور ناشائستہ رویہ جنم لیتا ہے جس کو برحق ثابت کرنے کے لیے تشدد کا ہتھیار استعمال کرنا لازم آتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اب ادب گاہوں میں گھس بیٹھئے اپنا فن دکھار ہے ہیں اور ہر وہ ہتھیار استعمال کر رہے ہیں جو ایسے لوگوں کو استعمال کرنا چاہئے یہاں میں پھر اس بات کو دوہرانا چاہوں گا کہ ان ادبی ،، گھس بیٹھیوں ،، کی پشت پناہی کے لئے ''فورسز'' موجود ہیں۔ جن میں پبلک ریلشنگ کا گھٹیا حربہ بھی ہے جو عصائے موسیٰ کی طرح جابجا اپنا اعجاز دکھارہا ہے۔

چٹان: بعض ادیبوں نے ادب کی آڑ میں اچھی خاصی فحش نگاری کا مظاہرہ کیا ہے اس رویے کو آپ کیا نام دیں گے؟

سیف اللہ خالد: جنسی رویے کو عریانی کا لباس پہنا کر یہ تصور کرنا کہ منٹو کی روایات آگے بڑھ رہی ہیں انتہائی بدذوقی ہے حالانکہ منٹو نے کبھی جنس پر کچھ نہیں لکھا بلکہ جنسی کج روی خواہ وہ تصوراتی ہو یا عملی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر قلم اٹھایا تھا لیکن آج کے ادیب کی بدقسمتی ہے کہ وہ اس طرح کی کیفیات کو علامتوں کا لباس پہنانا بھی گوارہ نہیں کرتا اس حوالے سے علی نواز شاہ کی ،، کالک ،، اور خون، کا تذکرہ ضروری ہے یہاں تک تو خیریت تھی مگر عرفان احمد خان نے اپنے ناول ''گزارہ ایسے ہوتا ہے'' میں جس فحش نگاری کی حدیں پار کی ہیں انہیں کسی بھی حوالے سے ادبی طور پر مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔

چٹان: کسی تخلیق کے بارے ایک ہی ،، قد کاٹھ ،، کے دو مختلف ادیبوں کی رائے مختلف کیوں ہوتی ہے؟ کیا یہ ادبی منافقت نہیں ہے؟

سیف اللہ خالد: نہیں منافقت تو جان بوجھ کر کی جاتی ہے یہاں صورتحال یہ ہوتی ہے کہ ایک ادیب کی ایک طرف سے آنے والی رائے کا دوسرے ادیب کو اس وقت علم ہوتا ہے جب کوئی مصنف فلیپ کے طور پر دونوں ادیبوں کی آراء کو سامنے شائع کرتا ہے جیسے ایوب ندیم

نے اپنے شعری مجموعے،، چاند میرا ہمسفر ،، میں ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی جیسے قطبین کی آراء کو فلیپ کے طور پر بالمقابل شائع کیا ہے دوسری بات یہ ہے کہ رائے کا اختلاف ہر شخص کے ذہنی کینوس کا سوال ہے ایک تخلیق کے متعلق دو متضاد یا مختلف آراء کو منافقت نہیں بلکہ اپروچ کا اختلاف سمجھنا چاہئے۔

چٹان: دیباچہ اور فلیپ نگاری کی ادبی حیثیت کیا ہے؟

سیف اللہ خالد: باقی ادبی اصناف کی طرح دیباچہ اور فلیپ اصناف ادب نہیں بلکہ ادیب کو پرموٹ کرنے کے وسیلے ہیں اردو کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اس میں دیباچے اور فلیپ نگاری کا غلط استعمال کیا گیا ہے اور انہیں سفارشی رقعے بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

چٹان: دیباچے سے فلیپ تک، آپ کی حالیہ تصنیف ہے آپ کو اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

سیف اللہ خالد: میں مزاجاً غیر مفاہمت پسند واقع ہوا ہوں۔ دھاندلی جیسی بھی ہو میرے تن بدن میں آگ لگا دیتی ہے ادب تو میری زندگی ہے اور ادب سے کھیلنے والوں کو میں کسی صورت معاف نہیں کر سکتا ''دیباچے سے فلیپ تک'' کی شان نزول میرا یہی مزاج ہے عرصہ دراز سے ادب میں نام نہاد ادیبوں اور ان کے بزرگوں نے جو دھاندلی شروع کر رکھی تھی اس نے مجھے کتاب کو قلم بند کرنے پر اکسایا میری زندگی میں کچھ بھی مقدس نہیں لہٰذا بڑی سے بڑی شخصیت بھی میرے قلم کے نشانے پر رہتی ہے۔ میں اقوال زریں کو نہ سنتا ہوں اور نہ انہیں حوالے کو طور پر استعمال کرنا گوارہ کرتا ہوں چنانچہ احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، خواجہ زکریا اور اس طرح کے تمام بزرگان ادب نے دیباچے اور فلیپ کے نام پر جو دھاندلی مچائی اس نے مجھے یہ کتاب لکھنے پر آمادہ کیا۔ میں جانتا ہوں یہ تار پر چلنے کا عمل تھا لیکن اس عمل کو میں نے بڑے توازن کے ساتھ سرانجام دیا۔

چٹان: آپ نے اپنی گفتگو میں اب تک جو حوالے دیئے ہیں وہ صرف لاہور اور سرگودھا سے متعلقہ ہیں اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

سیف اللہ خالد: دنیا میں بڑے بڑے فاتحین نے جب کسی ملک پر یلغار کی ہے تو سب سے

پہلے اس کے صدر مقام پر ہلہ بولا ہے اگر چہ بعد میں مضافات بھی ان کے دائرے میں آ جاتے ہیں میں خود مضافات کا آدمی ہوں اور میں جانتا ہوں کہ اس وقت سچا اور اچھا ادب لاہور اور سرگودھا سے باہر وجود میں آ رہا ہے سچ یہ ہے کہ سماج کی سچی عکاسی کرنے میں غزل نے اہم کردار ادا کیا ہے اس کا سرخیل شکیب جلالی تھا جس نے مضافات میں آنکھ کھولی اور تاریخ ادب میں اپنا انمٹ نقش ثبت کر گیا۔

سیاسی معاشرتی اور اقتصادی صورتحال کو کامیابی کے ساتھ ادبی جامہ پہنانے میں آج کی نسل بھی نہایت موثر کردار ادا کر رہی ہے نوشی گیلانی، ممتاز اطہر، منور جمیل اور طارق اسد جیسے غیر لاہوری لوگ کامیاب تخلیقات کر رہے ہیں۔

چٹان: آپ نے نوشی اور منور جمیل کا اکٹھے ذکر کیا ہے جبکہ ان دونوں میں کچھ غزلوں کی چوری کا مقدمہ بھی عدالت میں تھا جس کا فیصلہ نوشی کے حق میں ہو گیا اس صورت میں منور جمیل گویا چور ٹھہرتے ہیں کیا اس کے باوجود آپ منور جمیل کو ایک کامیاب شاعر کہیں گے؟

سیف اللہ خالد: متنازعہ غزلوں کو چھوڑ کر بھی اگر دونوں کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو دونوں ہی اپنی جگہ بھرپور اور مکمل شاعر ہیں۔

سلیم طاہر

- تخلیق کار کے لیے اضطراب انتہائی ضروری ہے۔
- ادب برائے ادب کو بکواس سمجھتا ہوں۔
- بعض ادیبوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنا مزار بنا لیا ہے اور ہر سال باقاعدگی سے اپنا عرس بھی کرواتے ہیں۔

''میں اور آپ'' کے حوالے سے ملک گیر شہرت حاصل کرنے والا سلیم طاہر ٹی وی پروڈیوسر، لیکن بنیادی طور پر ایک حساس شاعر ہے بقول احمد ندیم قاسمی، سلیم طاہر اس طرح کی جدوجہد میں مصروف ہے جیسے کوئی کانٹوں بھری جھاڑیوں کے جنگل میں گزرگاہ بنا رہا ہو، کبھی ، میں اور آپ کے ذریعے معاشرے میں ہونے والی ظلم و زیادتیوں کو آشکار اور معاشرے کے ناسوروں کی نشاندہی کرتا اور کبھی اپنے شعری مجموعے'' کہرام'' میں اپنی سوچ کے گھنے جنگل سے گزرگاہ بناتا ہوا سلیم طاہر یونیورسٹی دور سے ہی شاعر کی حیثیت سے نوجوانوں کے دل کی دھڑکنوں کا حصہ بن چکا تھا آج سے کوئی ۱۲ سال پہلے سلیم طاہر کا پہلا پنجابی شعری مجموعہ،، تاہنگھ تریل،، کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آیا جس کو ادبی و عوامی دونوں سطحوں پر کافی پذیرائی ملی ایک طویل وقفے کے بعد حال ہی میں سلیم طاہر کا اردو غزلوں پر مشتمل شعری مجموعہ،، کہرام،، کے نام سے آیا ہے اب کی بار سلیم طاہر کے اس شعری مجموعے کی جس طرح عوامی اور ادبی حلقوں میں پذیرائی ہو رہی ہے خدشہ ہے کہ میں اور آپ کے حوالے سے سلیم طاہر کی برسوں کی شناخت کو گم نہ کر دے اور میں اور آپ کے

بجائے سلیم طاہر کا حوالہ اس کا مجموعہ ، کہرام، بن جائے ایسا ہوا تو اچنبھے کی بات نہ ہوگی کہ اس میں اپنا آپ منوانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے سلیم طاہر کے مجموعے ''کہرام'' کی اشاعت کے بعد ان سے جو بات چیت ہوئی ہے وہ پیش خدمت ہے۔

چٹان: شعر کہنا کب شروع کیا؟

سلیم طاہر: ٹھیک سے تو یاد نہیں غالباً ساتویں آٹھویں جماعت کے قریب شعر کہنے شروع کئے۔ لیکن وہ ایسے تھے کہ سنائے نہیں جا سکتے میرا مطلب مکمل بے وزن اور سرے سے بے تکے شعر تھے۔

چٹان: باقاعدہ شاعری کا آغاز کب کیا؟

سلیم طاہر: بھرپور شاعری کا آغاز ۷۰ء میں ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی دور میں بین الکلیاتی مشاعروں میں شرکت کرتا تھا۔ شروع میں، میں صرف نظم لکھتا تھا۔ لیکن میرے ایک شاعر دوست (ان کا نام نہیں بتاؤں گا) جو ہمارے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ ان کے کہنے پر غزل لکھنا شروع کی۔

چٹان: حال ہی میں آپ کا اردو شعری مجموعہ ''کہرام'' کے نام سے آیا ہے۔ جبکہ آپ کا پنجابی شعری مجموعہ تاہنگھ تریل کے نام سے کوئی ۱۲ سال پہلے آیا تھا۔ دوسرے مجموعے کی اشاعت میں اتنا طویل وقفہ دینے کی خاص وجہ کیا ہے۔ جبکہ آپ کے ہمعصر دوسرے شاعروں کے اس عرصے میں بیسیوں شعری مجموعے آچکے ہیں۔

سلیم طاہر: میرے نزدیک اہمیت معیار کی ہے۔ مقدار کے چکر میں وہ شاعر پڑتے ہیں جو اپنے معیار کے حوالے سے کسی احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی شاعر کے بڑا ہونے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ اس نے بڑی تعداد میں شعری مجموعے دیئے ہیں۔ یوں لگتا ہے ان لوگوں میں کتابیں چھپوانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر مہینے ایک نئی کتاب دے دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے شاعری کو کمرشل بنا دیا ہے۔ یہ اسی دوڑ کا نتیجہ ہے کہ سنجیدہ قاری ادب سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

چٹان: کسی بھی شاعر کے کامیاب ہونے میں پی آر کیا کردار ادا کرتی ہے؟

سلیم طاہر: وقتی طور پر تو پی آر آپ کو سہارا دے سکتی ہے۔ لیکن مستقل کامیابی کے لئے کارکردگی انتہائی ضروری ہے۔

چٹان: آپ کی شاعری میں آنکھ کا استعارہ بار بار استعمال ہوا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

سلیم طاہر: انسانی جسم میں آنکھ ایسا مرکز ہے کہ وہ انسان کی اندرونی کیفیات بیان کرتی ہے۔ بعض اوقات جب لفظ اور زبان جواب دے جاتے ہیں تو ان حالات میں آنکھ اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ویسے بھی چونکہ میرا تعلق ویژن سے ہے۔ اس لئے اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے۔

چٹان: بنیادی طور پر آپ شاعر ہیں جب کہ عملاً آپ ٹی وی پروڈیوسر ہیں آپ کیا سمجھتے ہیں آپ نے دونوں شعبوں سے کہاں تک انصاف کیا ہے؟

سلیم طاہر: اپنی حد تک تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے دونوں شعبوں کے ساتھ انصاف کیا ہے لیکن اس بارے میں حتمی رائے تو لوگ ہی دے سکتے ہیں۔ میں اور آپ کے حوالے سے تو لوگ میری کارکردگی سے واقف ہیں۔ بلکہ یوں کہوں تو مناسب ہوگا کہ اس حوالے سے اپنی کارکردگی منوا چکا ہوں۔ اب میرا اردو مجموعہ قارئین تک پہنچے گا تو اس بارے میں بھی وہی رائے دیں گے کہ میں اس شعبے میں کہاں تک کامیاب ہوں۔

چٹان: آپ کی کچھ مزاحیہ شاعری بھی ہے۔ جسے چند لوگوں نے ٹی وی مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھا آپ ان کا نام بتانا پسند کریں گے؟

سلیم طاہر: مزاحیہ شاعری ایک شارٹ کٹ ہے ان لوگوں کے لئے جن کی سنجیدہ شاعری اس قابل نہیں ہوتی کہ اسے کسی کے سامنے پیش کیا جائے۔ میرے نزدیک مزاحیہ ادب کی مستقل اہمیت نہیں ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف وقتی طور پر لوگوں کو خوش کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ ایسے ہی کسی موڈ میں نے چند مزاحیہ غزلیں، نظمیں کہی تھیں۔ لیکن میں ان کو اون نہیں کرتا مبادا لوگ مجھے بھانڈ سمجھیں۔ جن لوگوں نے ٹی وی مشاعروں میں میری مزاحیہ شاعری کو اپنے نام سے پڑھا ہے۔ یہ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے کیونکہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔

چٹان: مزاحیہ مشاعروں کا ادب پر کیا اثر پڑا ہے؟

سلیم طاہر: مزاحیہ مشاعرہ او سٹیج ڈرامہ ایک مقصد کے حامل دو مختلف ڈرامے ہیں۔ جس کا انتظامیہ کو تو فائدہ پہنچتا ہے۔لیکن ادب کو بے حد نقصان ہوا ہے۔

چٹان: ادب کے فروغ کے لئے ٹی وی کیا کردار ادا کر رہا ہے؟

سلیم طاہر: اس حوالے سے ٹی وی کا کردار بڑا مثبت ہے۔ ہمارے ملک میں کوئی بھی اچھی سے اچھی کتاب ایک ہزار سے زیادہ نہیں چھپتی یہ ٹی وی کا کام ہی ہے کہ وہ اس کتاب کو ان لوگوں تک بھی پہنچاتا ہے جو کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے یا جن تک کتاب نہیں پہنچتی۔

چٹان: ٹیلی ویژن پر گانے والوں کو جو عزت و اہمیت دی جاتی ہے اس کے مقابلے میں ادیبوں دانشوروں کی حیثیت شاید آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ جبکہ پڑھے لکھے لوگ کسی بھی قوم کا دماغ سمجھے جاتے ہیں ادیبوں سے اس امتیازی سلوگ کی کوئی خاص وجہ؟

سلیم طاہر: یہ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے۔ ساری قوم کمرشلائز ہو گئی ہے۔اسی چکر میں ادیبوں اور دانشوروں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جا رہا ہے۔اور یہ ہمارے لئے بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے۔

چٹان: بدلتے ہوئے ادبی رویوں سے مطمئن ہیں؟

سلیم طاہر: دیگر تمام شعبوں کی طرح ادب میں بھی حق مارنے والے آ گئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔لیکن اپنے تعلقات اور سازشوں کے بل بوتے پر یہ ادب میں ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں۔ یہ ادبی بدمعاش ہیں بلکہ ان کے لئے ادبی دہشت گرد کا لفظ زیادہ موزوں ہے ان لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنا مزار بنا لیا ہے اور باقاعدگی سے ہر سال اپنا عرس بھی کرواتے ہیں۔

چٹان: ادب برائے ادب کے نظریے کے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟

سلیم طاہر: ادب برائے ادب کو بکواس سمجھتا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں لوگوں کی خدمت اور عبادت کیلئے بھیجا ہے نا کہ وہ کسی کونے میں بیٹھ کر صرف اپنی ذات کی تسکین کے

لئے وقت برباد کرتا رہے۔ میں ادب برائے زندگی پر یقین رکھتا ہوں۔

چٹان: ادب میں بنیاد پرستی کی اہمیت پر روشنی ڈالیں گے؟

سلیم طاہر: بنیاد پرستی پر عمل کرنا ہر ادیب شاعر کا فرض ہے کیونکہ ہر پودا یا درخت اپنی جڑوں کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے بغیر جڑوں کے اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ادیب یا شاعر جب تک اپنے نظریئے پر قائم رہے گا اس وقت تک اس کی پہچان ہوگی۔ نظریہ چھوڑ دے گا تو اس کی مثال اس پودے جیسی ہوگی جو جڑوں سے اکھاڑ دیا گیا ہو، ہوا میں معلق ہو اور اس کی عمر محدود ہو۔

چٹان: ادب میں سرقہ اور چوری بہت بڑھ گئی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

سلیم طاہر: یہ سلسلہ نیا نہیں ہے پہلے بھی سرقہ اور چوری ہوتی تھی لیکن پتہ کم چلتا تھا اب کمپیوٹر کا دور ہے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں نے فلاں کی غزل یا نظم چوری کی ہے اسلام آباد کا ایک انٹرنیشنل شاعر چکوال کے ایک غیر معروف شاعر کی نعت ٹی وی کے مشاعرے میں پڑھ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک معروف مزاحیہ شاعر دو شعراء کی نظمیں پڑھ کر اپنا ادبی قد کاٹھ بنا لیتا ہے میرے نزدیک یہ زیادتی ہے، اور یجنل شاعری کو ہی اہمیت دی جانی چاہئے۔

چٹان: بقول احمد ندیم قاسمی سلیم طاہر کسی تلاش میں سرگرداں ہے تفصیل میں جائیں گے؟

سلیم طاہر: بہت سی باتیں پردے میں رہیں تو بہتر ہے ویسے بھی کسی تخلیق کار کے لئے اضطراب انتہائی ضروری ہے باہر سے سمندر پرسکون نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر کا اضطراب تب ہی نظر آتا ہے جب اس کے اندر غوطہ زنی کی جائے اس کے اندر جھانکا جائے اس کے اندر داخل ہوا جائے بعینہ ہی انسان بھی ایک سمندر ہے جسے بہت کم لوگ اندر جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے اندر اترنے سے کتراتے ہیں۔ میں جس کی تلاش میں ہوں اس کا ذکر کہرام میں موجود ہے۔

سلیمان جاذب

- پاکستانی میڈیا دُنیا بھر میں پاکستان کا امیج خراب کر رہا ہے۔
- ادبی گروہ بندیاں ختم ہو جائیں تو ادب اور زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔
- اگر کوئی ادیب عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اسے ضرور سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔

سلیمان جاذب کا بطور شاعر اور انٹرنیٹ جرنلسٹ تعارف تو ادبی رسائل اور اخبارات کے ذریعے ادبی ذوق رکھنے والے باقی دوستوں کی طرح مجھے بھی تھا۔ گزشتہ برس اتفاق سے میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو ان کی شخصیت کی اِک نئی جہت سامنے آئی اور وہ تھی ایک کامیاب ایونٹ منیجر اور اعلیٰ منتظم ہونے کی۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ عجمان میں سلیمان جاذب نے خوبصورت لہجے کے مقبول شاعر وصی شاہ کے اعزاز میں ایک شام کا انعقاد کیا تھا۔ لاطینی امریکہ جاتے ہوئے مختصر وقت کے لیے میں بھی متحدہ عرب امارات آیا ہوا تھا۔ وصی شاہ کے ساتھ منائی جانے والی شام میں شرکت کی جب دعوت ملی تو میرے ذہن میں یہی تھا کہ زیادہ سے زیادہ تیس چالیس لوگ ہوں گے اور بیرونِ ملک ہونے والی ادبی تقریب کی طرح شاید یہ بھی کوئی مختصر سی تقریب ہوگی۔ وہاں تو مگر منظر ہی اور تھا۔ تقریب میں پہنچ کر میں تو ہکا بکا رہ گیا۔ ہزار کے قریب لوگ فائیو سٹار ہوٹل کے سب سے بڑے ہال میں موجود ہیں۔ کوئی سعودی عرب سے آیا ہے تو کوئی کویت اور بحرین سے۔ دوبئی اور ابوظہبی شارجہ کے لوگ تو گویا میزبان بنے ہوئے تھے۔ مجھے جب اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا تو میرے لیے مناسب الفاظ کا چناؤ مشکل ہو رہا تھا کہ پاکستان سے باہر آج

تک میں نے کسی ادبی تقریب کا اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا تھا۔ کھانے کے علاوہ ہر مہمان کو ایک ننھے سے پرفیوم کا تحفہ بھی دیا گیا۔ بلاشبہ اس تقریب میں لوگوں کی تعداد اور جوش وخروش میں خوبصورت شاعر دوست وصی شاہ کی شخصیت کی سحر انگیزی ہی بنیادی محرک تھی مگر جس انداز میں اس تقریب کے لیے اعلیٰ انتظامات کے گئے اور لوگوں کو متحرک کیا گیا اس کا سہرا تھا سلیمان جاذب کے سر تھا۔ اس شام تو وہ بھی مصروف تھے اور میں نے بھی اگلے دن برازیل روانہ ہونا تھا اس لیے ان سے تفصیلی بات چیت نہ ہوسکی مگر گزشتہ دنوں میرا دوبئی جانا ہوا تو وہاں کی ادبی وسماجی تقریبات کے روح رواں سلیمان جاذب سے تفصیلی گفتگو ہوئی جو کہ ارژنگ کے قارئین کی نذر ہے۔

ارژنگ: عام چلن تو یہی ہے کہ نوجوان پہلے شاعری کی جانب آتے ہیں اور پھر صحافت یا کالم نگاری کا رُخ کرتے ہیں مگر آپ پہلے صحافی بنے بعد میں شاعری کی طرف آئے۔ پہلے ہمیں یہ معمہ سمجھایئے گا؟

سلیمان جاذب: میں نویں جماعت میں تھا جب میرا پہلا کالم شائع ہوا۔ اس لحاظ سے آپ کی بات بجا ہے کہ میرا پہلا تعارف بطور صحافی ہے اور شاعری کے حوالے سے میرا تعارف لوگوں میں بعد میں پہنچا۔ نثر میں میرا ہاتھ شروع سے ہی رواں تھا۔ بچپن میں ہی اپنی کلاس اور سکول کے دیگر طلباء کے لیے تقاریر لکھ کر دیا کرتا تھا لیکن شعری موزونیت بھی موجود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ نثری حوالے سے تعارف ذرا پہلے لوگوں تک پہنچا۔

ارژنگ: کیا کوئی شعری مجموعہ بھی شائع ہوا ہے؟

سلیمان جاذب: ہاں! ''تیری خوشبو'' کے نام سے شعری مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

ارژنگ: آپ کی ویب سائٹ تو یہاں خاصی مقبول ہے۔ ویب جنرلزم کے علاوہ بھی کہیں لکھتے ہیں؟

سلیمان جاذب: روزنامہ نئی بات میں آج کل لکھنا شروع کیا ہے۔ یہاں میں اس اخبار کا بیورو چیف بھی ہوں اور کالم بھی لکھ رہا ہوں۔

ارژنگ: آپ معروف صحافی بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ایونٹ مینجمنٹ کیسے کر پاتے ہیں؟

سلیمان: اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے سرفہرست تو یہ ہے کہ کمیونٹی بہت بڑی ہے۔ پاکستانیوں کے علاوہ برصغیر کے قرب وجوار میں جہاں کہیں سے بھی ہم زبان لوگ آتے ہیں اور یہاں پائے جاتے ہیں وہ ہمارے ٹارگٹ سامعین و ناظرین ہیں۔ آپ اگر مجھے کامیاب منتظم کے طور پر سوال کر رہے ہیں کہ میری کامیابی کی وجہ کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ لوگوں کی پسند کا خیال رکھتا ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ اور کس کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسری وجہ کہ ہر چیز کی کمرشل ویلیو کا بھی خیال رکھتا ہوں۔

ادبی پروگراموں کے علاوہ میں نے گزشتہ دنوں یہاں حدیقہ کیانی، عمر شریف اور منی بیگم کے شو کرائے ہیں۔ خوش قسمتی یا اتفاق کہہ لیں کہ عربی تقریبات میں ہماری کمیونٹی کی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ اگر آپ پاکستان سے کوئی بھی ایسی سلیبرٹی بلاتے ہیں اور ٹھیک انداز میں اس کی مارکیٹ کرتے ہیں تو پھر کامیابی یقینی ہوتی ہے۔

ارژنگ: کیا آپ نے اس شعبے میں تعلیم بھی حاصل کی ہے؟ یا پھر محض اتفاق سے ہی ادھر آ نکلے؟

سلیمان جاذب: تعلیم تو میں نے شماریات کے شعبے سے متعلق حاصل کی تھی اور یہاں میری پہلی نوکری بھی اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے ہی تھی مگر آہستہ آہستہ مجھے شماریات کا شعبہ بورنگ محسوس ہونا شروع ہو گیا اور میں نے تقریبات کا رُخ کیا۔ آج کل میں بطور ایونٹ منیجر ہی کام کر رہا ہوں۔

ارژنگ: کیا ادیب کا سیاست میں بھی کوئی کردار ہونا چاہیے؟

سلیمان جاذب: ادیب طبقہ ان لوگوں میں سے ہے معاشرے میں جن کو زندگی اور حالات کا ادراک باقی عوام سے قدرے بہتر ہوتا ہے۔ سیاست بھی عوامی خدمت کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے اور اس ذریعے سے اگر کوئی ادیب عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اسے ضرور سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔

ارژنگ: شاعری اور صحافت کو اگر ایونٹ منیجر کی نظر سے دیکھیں تو کیا کہیں گے؟

سلیمان جاذب: صحافت اور شاعری کی وجہ سے پروگرام اور تقریبات کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعری اور صحافت کی وجہ سے لوگوں میں آپ کا تعارف موجود ہوتا ہے اور پھر اس سے زبان و بیان میں بھی نکھار آ جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ براہِ راست پاکستان کے میڈیا سے بھی منسلک ہیں۔کیا آپ میڈیا کے موجودہ کردار سے مطمئن ہیں؟

سلیمان جاذب: پاکستان کے مسائل اُجاگر کرنے کے حوالے سے اگرچہ میڈیا اچھا کردار ادا کررہا ہے مگر منفی رپورٹنگ کے سبب باہر دنیا میں رہتے ہوئے اس انداز سے منفی تصویر ہی بن رہی ہے۔میڈیا کسی طرح بھی ملک کے امیج کے لیے مثبت کام نہیں کررہا بلکہ میں تو کہوں گا کہ میڈیا کی وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان کا امیج خراب ہورہا ہے۔اگر باہر دنیا میں ہمیں کہا جاتا ہے کہ آپ سب دہشت گرد ہیں تو یہ انہیں پاکستانی میڈیا ہی بتارہا ہے۔میڈیا ملک کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔

ارژنگ: متحدہ عرب امارات میں اردو ادب کے کیا حالات ہیں؟

سلیمان جاذب: UAE میں اُردو کے حوالے سے اچھا خاصہ کام ہورہا ہے۔پاکستانی نژاد ادیب کبیر خان کو کشمیر کے وزیراعظم کا ایوارڈ ملا ہے۔مقامی عرب ڈاکٹر زبیر فاروق اُردو شاعری کرتے ہیں اوران کے تیس سے زائد شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں جو سب کے سب اُردو میں ہیں۔مگر پھر بھی یہاں کے جو ادیب اُردو ادب سے وابستہ ہیں وہ پاکستان سے ہی آئے ہوئے ہیں۔پاکستانی خاندانوں کے جو بچے یہاں پیدا ہوتے ہیں وہ اُردو لکھ اور پڑھ نہیں سکتے ہیں۔سچ پوچھیں تو یہ بڑا نقصان ہوگیا ہے۔

ارژنگ: پاکستان کے ادیبوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟

سلیمان جاذب: اہل قلم دوستوں سے تو یہی گزارش ہے کہ اگر ادبی گروہ بندیاں ختم کردیں گے تو ادب اور زیادہ ترقی کرسکتا ہے۔اس کی بہتر ترویج ہوسکتی ہے۔پاکستان کی ادبی گروہ بندیوں کے نقصانات ہمیں یہاں بیٹھے اور زیادہ شدید ہوتے ہیں کہ جب ہم مشاعرے کراتے ہیں تو شاعروں کی طرف سے اس طرح کی شرطیں رکھی جاتی ہیں کہ اگر فلاں شاعر آئے گا تو پھر میں نہیں آوٗں گا۔ان لوگوں کو بلائیں گے تو ہم لوگ نہیں آئیں گے۔ان ادبی گروہ بندیوں کی وجہ سے ہم لوگ بڑے بڑے مشاعرے کرنے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں۔

شہرت بخاری

○ شاعری تو بس شاعری ہوتی ہے اس میں جدید اور قدیم کی کوئی قید نہیں۔

○ ترقی پسند تحریک کے اُردو ادب پر بہت سارے احسانات ہیں۔

○ لاہور کا دل اور دامن بہت وسیع ہے اور ہر نئے آنے والے کو جگہ دیتا ہے۔

شہرت بخاری کا نام اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے شہرت بخاری لندن میں مقیم ہیں۔ لندن میں رہنے کے باوجود ان کا انداز بالکل روایتی ہے، لاہور کا نام سن کر اب بھی ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

ارژنگ: آپ ایک طویل عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ لندن اور انگریزوں کے بارے میں آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

شہرت بخاری: میرے نزدیک پاکستان کے بعد رہنے کے لیے سب سے اچھی جگہ لندن ہے اور لندن میں بھی پرانا لندن۔ پرانے لندن کے لوگ بڑے روایتی ہیں۔ ہمیشہ روایتوں کا پاس رکھتے ہیں۔ یہاں کا موسم بھی بہت خوب ہے اور ماحول بھی، جہاں تک گوروں کا تعلق ہے تو میری دانست میں گورے بڑے غیر متعصب ہیں۔ کبھی بھی تعصب سے کام نہیں لیتے یہاں میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ کچھ سال پہلے میں اور میری بیوی لندن میں ایک سٹیشن پر بیٹھے ہوئے تھے کہ نشے میں دھت ایک انگریز پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی خالی نظروں سے تکتا رہا پھر قومیت کی بنیاد پر ہمیں گالیاں دینے لگا اور ہمارے سامنے تھوک کر چلا گیا۔ میں خیر انتہائی افسردہ ہوا اور میری بیوی مجھ سے زیادہ کہنے لگی کہ میں نہ کہتی تھی کہ

اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے واپس چلے چلیں۔ ہم ابھی اپنی زبان میں یہی باتیں کر رہے تھے کہ قریب ہی کھڑا ایک انتہائی معزز انگریز ہمارے پاس آیا اور بڑی معذرت کرنے لگا کہنے لگا، خدا کی قسم ہم ایسے لوگ نہیں ہیں جیسا یہ شرابی تھا، اور باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر اس شرابی کی حرکت پر معافی مانگنے لگا یہ تو خیر ایک واقعہ ہے اس طرح کے کئی واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ جن سے انگریزوں کی وسیع القلمی کا ثبوت ملتا ہے۔

ارژنگ: لندن میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

شہرت بخاری: عامر: بیٹا لندن میں سب کچھ ہے بس لاہور نہیں ہے۔

ارژنگ: اچھا: لاہور کے متعلق آپ کافی رومانوی معلوم ہوتے ہیں؟

شہرت بخاری: ہاں: بالکل لاہور سے مجھے عشق ہے۔ لاہور کا دل اور دامن بہت وسیع ہے۔ ہر نئے آنے والے کو جگہ دیتا ہے اور اس میں ایسا جادو ہے کہ ہر نئے آنے والے کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ لیکن یار یہ لاہور تو وہ لاہور ہے ہی نہیں جس میں ہم نے بچپن گزارہ ہے۔ شہر کی باہر والی فصیل کے ساتھ ساتھ نہر چلا کرتی تھی۔ دن بھر عورتیں نہر پر کپڑے دھوتی تھیں۔ ہم بھی نہر کے گرد باغات میں کھیلا کرتے تھے۔ اب تو نہ وہ نہر رہی نہ وہ باغات لیکن پھر بھی میں تو ہمیشہ یہی کہتا ہوں۔ جیوے شہر لاہور

ارژنگ: کیا لندن میں بھی ادبی بیٹھکیں اور مشاعرے ہوتے ہیں؟

شہرت بخاری: مشاعرے کے بغیر تو اردو شاعری کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ مشاعرے کی حیثیت اردو شاعری کی روایت میں ریڑھ کی ہڈی سی ہے۔ لندن میں بھی ہم کوئی نہ کوئی محفل سجائے رکھتے ہیں۔ یہاں بھی کافی اچھے شاعر موجود ہیں۔

ارژنگ: ترقی پسند تحریک کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا، ترقی پسند تحریک کے کردار کے حوالے سے آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

شہرت بخاری: ترقی پسند تحریک کے اردو ادب پر بہت سارے احسانات ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو جو شاعر اور ادیب دیئے آج بھی ان کے پائے کا کوئی شاعر یا ادیب موجود نہیں ہے۔ فیض، مجاز، ساحر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی اور کرشن چندر ان کے

قد کا کوئی بھی شاعر یا ادیب اس عہد نے پیدا نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو کئی نئی جہتیں عطا کی ہیں۔

ارژنگ: جدید شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شہرت بخاری: شاعری تو بس شاعری ہوتی ہے اس میں جدید اور قدیم کی تو کوئی بھی قید نہیں ہے۔ ہم اسے مختلف شعراء کے عہدوں میں تو تقسیم کر سکتے ہیں لیکن جدید اور قدیم کا تصور غلط ہے بہر حال آج کل بھی چند شعراء اچھا کہہ رہے ہیں۔

ارژنگ: آپ کی شاعری پر موسیقی کے بڑے اثرات ہیں؟

شہرت بخاری: اردو شاعری کی تو بنیاد ہی موسیقی پر ہے۔ بالخصوص غزل میں موسیقیت نہ ہو تو وہ بالکل بے مزہ لگتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ایک اچھا سازندہ ساز کی مدد سے بے وزن غزل کو وزن میں لا سکتا ہے۔

ارژنگ: آپ کے بقول پیپلز پارٹی کی سیاست بہتر ہے، بھٹو صاحب کے بارے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟ شہرت بخاری: (بڑے دکھ بھرے جذباتی انداز میں) صاحبو: بھٹو جیسا لیڈر اس دھرتی نے پیدا ہی نہیں کیا۔ وہ تو اس دھرتی کا لعل تھا۔ بھٹو کی شہادت پر میں نے ایک سلام لکھا تھا۔

اے سپہر، وفا کے مہر مبیں
اے وقار زمین و اہل زمیں
ذوالفقار علی کی لاج ہے تو
اہل ایماں کے سر کا تاج ہے تو
کون سی ماں نے تجھ سا پوت جنا
موت بھی جس کو کر سکے نہ فنا
تجھ کو ڈھونڈیں مگر کہاں پائیں
بند ہیں راستے جدھر جائیں

یوں دھڑکنے سے رہ گیا ہے دل
سانس لینا بھی ہو گیا مشکل
اے غریبوں کے پاسبان سلام
بے زبانوں کے ترجمان سلام
اے میرے عہد کے حسین سلام
اے شہیدوں کے نور عین سلام

ارژنگ: بھٹو کو پھانسی دینے پر جن لوگوں نے خودسوزی کر لی ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شہرت بخاری: ایک دفعہ آپ کے گورنمنٹ کالج لاہور میں فیض احمد فیض، ن۔م راشد پطرس بخاری، صوفی تبسم، وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے فارسی کا ایک شعر سنایا۔

سینہ صد چاک گزارند، دل صد پارہ
ایں بے خبراں چاک دریدہ نہ گزارند

شعر سنتے ہی فضا میں خاموشی چھا گئی، تھوڑی دیر میں فیض صاحب رونے لگے، پھر پطرس بخاری نے رونا شروع کر دیا۔ صوفی تبسم، ن۔م راشد سبھی لوگوں کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ (بات کرتے ہوئے شہرت بخاری کی آنکھوں میں بھی پانی تھا توقف کے بعد) بات حقیقت ہے، کسی کے دل کا حال معلوم کیے بغیر ہم اسے کیسے غلط کہہ سکتے ہیں۔

ارژنگ: کیا مشق سخن اب بھی جاری ہے؟

شہرت بخاری: (مسکراتے ہوئے) شاعری تو سانسوں کے ساتھ ساتھ جاری ہے لیکن یہ شاعری بھی چشمے کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی تو اتنے زوروں سے چلتا ہے کہ سیلاب ہی آ جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ بالکل ہی سوکھ جاتا ہے۔ ایک وقت تھا جب ایک دن میں سات سات آٹھ آٹھ غزلیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ ایک کا مطلع کہا تو دوسری کا مقطع ایک وقت میں کئی

کئی غزلیں اب وہ بات تو نہیں رہی لیکن مشق سخن بہر حال جاری ہے۔

ارژنگ: موسم کون سا پسند ہے؟

شہرت بخاری: سردیاں بہت اچھی لگتی ہیں لیکن صحراؤں میں میرے لیے ایک عجیب کشش ہے۔شاید میرا خمیر صحراؤں سے اٹھا ہے اس لیے (سید ہونے کی وجہ سے) میں صحراؤں سے بہت مانوس ہوں۔ ریت کے ٹیلے، کھجوریں، اونٹ، گرمی کا موسم میرے جیسے کے لیے تو خوشگوار نہیں لیکن صحرا کی گرمی میری روح کے موافق ہے۔

ارژنگ: آپ کا تعلق کسی ادبی گروہ سے ہے؟

شہرت بخاری: مجھے تو آج تک ادبی گروہ بندیوں کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ تعلق تو بہت بعد کی چیز ہے۔ میرا اگر کسی گروہ سے تعلق ہے تو وہ پیار کرنے والوں، وفا کرنے والوں اور ساتھ نبھانے والوں کا گروہ ہے۔

ارژنگ: لندن میں تنہائی محسوس نہیں ہوتی؟

شہرت بخاری: میرا بیٹا ڈاکٹر علی جوُ بخاری، بیوی، بہو اور پوتے سبھی میرے ساتھ رہتے ہیں ویسے بھی انگریزوں میں انسانی قدریں موجود ہیں۔ پچھلے دنوں ایک بس میں سفر کر رہا تھا کہ ڈرائیور نے یکدم بریک لگا دی میں اپنے دھیان میں گم تھا اس وجہ سے سامنے سیٹ سے ٹکرا گیا لیکن بالکل محفوظ رہا۔ مسافروں نے بس رکوا دی اور ایک ایک کر کے بس کے تمام مسافر میرے پاس آئے اور پوچھا،، کیا آپ ٹھیک ہیں؟ بالکل ٹھیک ہیں؟ کئی ایک نے تو پھول تک تھما دیے۔ ایسے ماحول میں بھلا کیا تنہائی محسوس ہو گی۔

شہزاد احمد

○ ہر آدمی کے پاس سچ کی تشریح ہے۔ بعض لوگ صرف اُسی کو سچ سمجھتے ہیں جو اُن کے لیے قابلِ قبول ہو۔

○ ادب ہمیشہ مکمل سچائی نہیں ہوتا اور یہ بالکل سچائی ہے۔

○ ادب اپنے طور پر ایک مقصد ہے۔ اسے کسی مقصد کے تابع نہیں ہونا چاہیے۔

ارژنگ: کیا ہمارے علمی، ادبی ثقافتی ادارے آپ کے خیال میں کوئی تعمیری کام کر رہے ہیں؟

شہزاد احمد: یہ سوال اگر سرکاری اداروں سے متعلق ہے تو اس کا جواب اور ہوگا اور اگر سوال ایسے اداروں سے ہے جو غیر سرکاری ہیں تو ممکن ہے سوال کی نوعیت بالکل بدل جائے۔ جہاں تک سرکاری اداروں کا تعلق ہے۔ اس میں کارکردگی کا معیار ہمیشہ کمزور رہا ہے۔ کیونکہ سرکاری طور پر ان اداروں کا سربراہ ہونے کے لیے صرف سیاسی ضرورتوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو ان اداروں کا سربراہ بنایا جاتا ہے۔ جو ان اداروں کی کارکردگی میں کچھ اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ان اداروں کے مقاصد کے بارے میں سرے سے کچھ جانتے ہیں۔ کچھ ادارے ایسے ہیں جن کا وجود ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ مثال کے طور پر مقتدرہ قومی ادارہ اس لیے بنایا گیا تھا کہ اردو کو اس کی وساطت سے دفتری زبان بنایا جائے گا۔ ۱۹۸۶ء میں اردو کو مکمل طور پر دفتری زبان کے طور پر نافذ ہونا تھا۔ ۸۶ء گزر گیا پھر ۸۹ء گزر گیا۔ اب تک ۱۳ برس گزر چکے ہیں۔ نہ قومی اسمبلی میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ یوں لگتا ہے یہ حکومت اور اس سے جو پچھلی حکومتیں تھیں اردو کو دفتری زبان بنانا نہیں چاہتیں۔ میں

اس بات پر اصرار نہیں کرتا کہ اردو کو ضرور دفتری زبان ہونا چاہیے۔ لیکن اس سلسلے میں دو ٹوک فیصلہ ضرور ہو جانا چاہیے کہ اردو دفتری زبان ہو گی یا نہیں۔ حکومت نہ اردو کو دفتری زبان بنانے کا فیصلہ کرتی ہے اور نہ وہ مقتدرہ قومی زبان کے ادارے کو ختم کرتی ہے۔ حکومت کروڑوں روپے فضول میں ایسے ادارے پر خرچ کر رہی ہے۔ جس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ایک اردو سائنس بورڈ کا ادارہ ہے جس کا رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو اس ادارے کا سربراہ بنایا جا تا رہا ہے۔ جو سائنس کی مبادیات بھی نہیں جانتے۔ میں نام تو نہیں لیتا لیکن ایسے لوگوں کو اس ادارے کا سربراہ ہونا چاہیے جو سائنسی علوم سے کم از کم ہمدردی رکھتے ہوں اور سائنسی مسائل کو سمجھتے ہوں۔ جہاں تک سرکاری اداروں میں ادب دوستی کا سوال ہے اس سلسلے کا سارے کا سارا روپیہ تقریباً ضائع ہو رہا ہے۔ بہت کم ادارے ایسے ہیں جہاں روپے کا صحیح مصرف نکل آتا ہے۔ ہاں البتہ نجی طور پر بعض ادارے اپنے طور پر کچھ کام کر رہے ہیں۔

ارژنگ: خالد احمد نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اس دنیا میں خوبصورت چہرہ رکھنے والا انسان زندگی میں کسی اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔ مگر کم شکل لوگ اپنی شخصیت میں کوئی ایسا کرشمہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو ان کو خوبصورت لوگوں کے سامنے لا کھڑا کرے۔ اس سلسلے میں انسان مختلف ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے۔ شعر کہتا ہے، افسانے لکھتا ہے۔ کالم نگاری کرتا ہے وغیرہ وغیرہ آپ اس سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

شہزاد احمد: بات یہ ہے کہ اگر آدمی خوش شکل ہو تو پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ اس سلسلے میں بہت سی مزاحمت جو لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے وہ فوری طور پر پیدا نہیں ہوتی ایک سرٹیفکیٹ ہوتا ہے فوری طور پر قبول کئے جانے کا۔ پھر اس کے ساتھ اگر آواز بہتر ہو، لباس اچھا ہو تو یہ کوالیفیکیشن ہے اور اگر اس کے ساتھ اگر اسے کچھ آتا جاتا بھی ہو تو یہ ایک ایکسٹرا کوالیفیکیشن ہے۔ اس لحاظ سے میں خالد احمد کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔

ارژنگ: سچ کے نام پر ادب میں بدتمیزی کی جو لہر چلی ہے۔ اس کا ذمہ دار کون ہے اور اس کا ادبی مستقبل پر کیا اثر پڑے گا؟

شہزاد احمد: ہر آدمی کے نزدیک سچ کی اپنی تشریح ہے۔ بعض لوگ صرف اسی کو سچ سمجھتے ہیں جو ان کے اپنے لیے قابل قبول ہو۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جو جمہوریت کے عمل سے حاصل کیا گیا ہو وہاں سچ کے معنی اس قدر محدود نہیں ہو سکتے۔ سچ ایسا ہونا چاہیئے جو معاشرے کے لیے زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہو۔ محض اپنے سچ کو لے کر نہ آپ اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں نہ معاشرے کے مسائل گرفت میں لے سکتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ سب سے بڑا جھوٹ ہوتا ہے۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیاں ادب کی ترقی کے لیے سودمند ہیں یا نقصان دہ؟

شہزاد احمد: ادبی گروہ بندیاں ادب کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اور قدرتی بن جاتی ہیں۔ اگر آپ ایک خاص طرح کا مزاج رکھتے ہیں۔ مثلاً آپ غزل کہنے والے ہیں تو آپ کے دوست بھی غزل کہنے والے ہوں گے۔ اور اگر آپ افسانہ لکھتے ہیں تو آپ کا اٹھنا بیٹھنا افسانہ لکھنے والے لوگوں کے ساتھ ہوگا یہ ایک قدرتی طریقہ ہے مل بیٹھ کے کام کرنے کا۔ مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں آپ اپنے حقوق کا تقاضا تو کرتے ہیں لیکن اپنے فرائض کی طرف توجہ نہیں دیتے صرف حقوق کے سلسلے میں نعرے بازی کی جاتی ہے اور یہ سلسلہ بیچ میں رہ جاتا ہے کہ آپ کے فرائض کیا ہیں۔ یہ بہت ضروری بات ہے کہ جب گروہ بنایا جائے تو اس گروہ کو کسی سیاسی یا سماجی مسئلے کے لیے مثبت طور پر تو استعمال کیا جائے لیکن منفی استعمال نہ ہو۔

ارژنگ: بقول اشفاق احمد کالم نگاری ادبی صنف نہیں ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے خاص طور پر مشتاق یوسفی، ابن انشاء، عطاء الحق قاسمی اور منو بھائی کے کالموں کے حوالے سے۔

شہزاد احمد: دیکھیں عمومی طور پر اشفاق احمد کی اس بات سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ کیونکہ عام طور پر ہمارے ہاں جو کالم لکھے جاتے ہیں ان کے موضوعات روزمرہ کے گزر جانے والے موضوعات ہوتے ہیں۔ اور کالم نویسی میں زیادہ احتیاط بھی نہیں کی جاتی نہ کالم نگار کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ادبی لحاظ سے کالم کی نوک پلک سنوار سکے۔ مگر بعض اوقات کالم بھی ایسا

ہوسکتا ہے جو ادب کی سطح پر آ سکتا ہے۔اب یہ ہر کالم پر الگ منحصر ہے کہ اس کو کس حد تک ادب کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔اصولی طور پر اشفاق احمد کی بات درست ہے لیکن یہ بات ہمیشہ کے لیے درست نہیں ہے۔

ارژنگ: کسی ایک تخلیق کے بارے میں ایک ہی سطح کے دو ادیبوں کی متضاد رائے کو آپ کیا نام دیں گے؟

شہزاد احمد: یہ ہوسکتا ہے دونوں کے پاس جو جواز موجود ہو۔ کیونکہ ادب ہمیشہ مکمل سچائی نہیں ہوتا اور یہ بالکل سچائی ہے۔ دو آدمی اگر پوری ایمانداری سے بات کر رہے ہیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ متضاد ہونے کے باوجود اپنی اپنی جگہ دونوں سچے ہوں۔

ارژنگ: فلیپ اور دیباچہ نگاری کا فائدہ یا نقصان کیا ہے۔آپ اسے تنقید یا ستائش کے کس خانے میں رکھیں گے؟

شہزاد احمد: فلیپ اور دیباچہ نگاری کی مثال سہرا بندی کی ہے جب دولہا کو سجایا جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ،،میک اپ،،تو کیا جاتا ہے۔یہی حال دیباچہ اور فلیپ نگاری کا ہے۔یہ باقاعدہ تنقید کے زمرے میں نہیں آتے اس میں فن پارے کے صرف مثبت پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کا مقصد صرف لکھاری کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔

ارژنگ: ٹی وی چینلز کی بھرمار اور انسان کی بے انتہا مصروفیت کے دور میں ادب اور ادیب کا مستقبل کیا ہے۔

شہزاد احمد: اصل میں ہم ایک ایسے دور میں سے گزر رہے ہیں۔جس میں ادب کو سب کا مسئلہ سمجھا جاتا تھا۔اس دور میں تانگے والا بھی شعر کہہ لیا کرتا تھا۔جو بھٹیارن تھی وہ بھی شعر کہتی تھی۔اب نہ تانگے والے کو فرصت ہے نہ بھٹیارن کے پاس وقت ہے۔اب چونکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔اس لیے بہت تھوڑے لوگ رہ گئے ہیں جو ادب کو پڑھتے ہیں اور ادب کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں۔ادب کی اہمیت انسانی زندگی میں بہت زیادہ ہے۔لیکن اس اہمیت میں عمر یا وقت کے لحاظ سے کمی بیشی بھی ہوسکتی ہے۔میں سمجھتا ہوں ادب صرف نوجوانوں کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔لیکن آگے چل کے ادب زیادہ عمر کے لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنے

گا۔اس وقت جو شاعری پسند کی جا رہی ہے وہ نو جوانوں کے موضوعات ہیں لیکن بعد میں جو ادب لکھا جائے گا وہ ایسے لوگوں کے متعلق ہو گا جن کے پاس وقت بھی ہے اور جن کی عمریں رسیدہ ہیں۔اس وقت ادب میں جذباتیت کم ہو جائے گی۔مگر گہرائی زیادہ ہو گی لیکن اس کے پڑھنے والے کم ہوں گے۔

ارژنگ: کیا شاعر اور ادیب کے لیے کسی نظریے کا حامل ہونا ضروری ہے؟

شہزاد احمد: بالکل ہونا چاہیے۔مگر یہ کہ دوسروں پر اپنے نظریے کو تھوپنا نہیں چاہیے۔یہی غلطی ترقی پسندوں نے کی تھی۔اور انہوں نے اس کا برا حشر بھی دیکھا۔ادب اپنے طور پر ایک مقصد ہے۔اس کو کسی اور مقصد کے تابع نہیں ہونا چاہیے۔جو آپ محسوس کرتے ہیں بس اسی کو بیان کریں اور اس بات کو بھول جائیں کہ پہلے سے متعین مقاصد پر لکھیں۔ادب سے مراد یہ ہے کہ آپ جس طرح جو محسوس کرتے ہیں۔اس کو بغیر کسی خیانت کے ویسا ہی بیان کریں۔

ارژنگ: آج کی غزل کس مقام پر ہے؟

شہزاد احمد: آج کی غزل بڑے اچھے مقام پر ہے۔میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کلاسیکی غزل کا انتخاب کیا جائے تو ممکن ہے جدید شاعروں کا انتخاب کلاسیکی شعراء کے انتخاب کے برابر ٹھہرے۔اس دور میں بڑی اچھی غزل ہو رہی ہے اور اس میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو زیادہ معروف نہیں ہیں۔میں سمجھتا ہوں غزل نے ترقی کی ہے اس کے موضوعات میں بہت اضافہ ہوا ہے۔اس میں افقی اور عمودی دونوں طرح ہی ترقی ہوئی ہے۔

ارژنگ: موجودہ دور میں اردو کے کون کون سے شاعر پسند ہیں۔

شہزاد احمد: نام لینے میں گڑ بڑ ہو گی۔اس لیے میں کسی کا نام نہیں لوں گا۔کیونکہ بعض اوقات آپ بہت اہم نام بھول جاتے ہیں جو ساری عمر کے لیے طعنہ بن جاتے ہیں۔

ارژنگ: پنجابی لکھنا کیوں چھوڑا؟

شہزاد احمد: یہ میرے لیے واقعی دکھ کی بات ہے۔مجھے پنجابی لکھتے رہنا چاہیے تھا۔مگر مشکل میرے لیے یہ ہے کہ پڑھتا میں انگریزی ہوں، لکھتا اردو ہوں، اور بولتا پنجابی ہوں۔اصل

میں ایک عجیب سا سوشل رویہ ہمارے ہاں چل نکلا ہے کہ جب ماں کے پاس بیٹھیں گے تو پنجابی بولیں گے۔ جب سکول میں جائیں گے تو اردو بولیں گے اور جب ذرا سا علمی مسئلہ ہو گا تو انگریزی میں بولیں گے۔

ارژنگ: تو کیا پنجابی کے بارے میں ہمارے ہاں احساس کمتری ہے؟

شہزاد احمد: نہیں میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اصل میں پنجابی اور اردو کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے۔ صرف چند ایک الفاظ بدل دینے سے اردو بن جاتی ہے اور اردو کا چونکہ ابلاغ پنجابی کی نسبت زیادہ ہے۔ اس لیے اردو کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ ہاں اگر اردو اور پنجابی بالکل متضاد زبانیں ہوتیں تو صورتحال یقیناً مختلف ہوتی۔

شہزاد احمد دُنیا سے چلے گئے ہیں۔ شعروادب کا ایک باب تکمیل کو پہنچا۔ ''کل نفس ذائقۃ الموت'' فرمان ہے اس پاک پروردگار کا جس کے قبضہ قدرت میں سب کی جان ہے۔ یقیناً ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والا تو خدائے ذوالجلال کا چہرہ ہی ہے۔ دل کو مگر یقین نہیں آتا کہ وہ اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو چکے ہیں۔ یقین کرنا یوں بھی دشوار پاتا ہوں کہ پچھلے ہفتے ان سے ٹیلیفون پر گپ شپ ہو رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور قہقہے بکھیرتا کٹیلا لہجہ۔ دراصل کالم لکھتے ہوئے میں ایک لفظ پر اٹک گیا تھا۔ کپڑے کی باریک کترن کو ہماری پنجابی زبان میں ''لیر'' کہتے ہیں۔ اُردو زبان میں اسے کیا لکھا جائے؟ بہت سوچا اور کئی کتابیں ٹٹولیں مگر جواب ندارد۔ کسی سے پوچھ لیا جائے؟ رہنمائی لینے کا خیال آتے ہی شہزاد احمد ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب کا نام ذہن میں اُبھرا۔ فون کر کے میں نے انہیں اپنی اُلجھن بتائی۔ بڑے پیار سے انہوں نے سمجھایا کہ اُردو میں بھی اسے ''لیر'' ہی لکھ دیں۔

بابا جی اشفاق احمد کہ جن کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا شرف مجھے حاصل رہا ان کے ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے مجھے سمجھایا کہ اُردو زبان کا ہاضمہ بہت

اچھا ہے۔ نئے الفاظ سمونے کی اس زبان کی صلاحیت بے مثال ہے۔ ایسا عالم شخص کہ لاکھوں نہیں کروڑوں میں ایک، مگر علم پر غرور و تکبر کا سایہ تک ان کو چھو کر نہ گزرا تھا۔ تصنع و بناوٹ نام کی کسی چیز سے تو ان کی شخصیت واقف ہی نہ تھی۔ کتاب سے بے پناہ محبت کرنے والے آدمی تھے۔ بہت سی کتابیں انہوں نے مجھے تحفے میں دیں۔ کتاب کی فرمائش وہ مجھ سے ہر ملاقات میں کیا کرتے تھے۔ اس بات کا افسوس مجھے تمام عمر رہے گا کہ انہوں نے مجھے جاپان سے انگریزی زبان میں ترجمہ کی گئی کچھ کتابیں لانے کی خواہش کا اظہار کیا جسے میں پورا نہ کرسکا اور کتاب کے علاوہ انہوں نے کبھی کوئی فرمائش کی بھی نہیں تھی۔ مسکراہٹ ہر وقت ان کے چہرے پر کھیلتی رہتی تھی۔

مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر تعینات ہوئے تو کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی۔ کئی نایاب کتب کی تازہ اشاعت کا اہتمام کیا۔ بہت سی اہم کتابیں نستعلیق خط میں نہیں تھیں۔ ان کو دورِ حاضر کے مقبول خط نوری نستعلیق میں شائع کروایا۔ ہمارے ملک میں عموماً سرکاری عہدیداروں کی عزت و تکریم ان کی کرسی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ان عہدوں اور کرسیوں کو عزت بخشتے ہیں۔ شہزاد احمد بھی ایسے ہی نابغہ روزگار شخص تھے۔ انہوں نے مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کر کے اس عہدے کو عزت بخشی۔ انہوں نے اپنے فرائض کو نہ صرف بخوبی سرانجام دیا بلکہ آنے والے آئندہ افسران کے لیے بھی ایک بلند معیار مقرر کر دیا ہے۔ وہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک ادارہ تھے۔ اپنی ذات میں انجمن ہونے کا مطلب اگر کسی کو سمجھ نہ آ رہا ہو تو صرف شہزاد احمد کی زندگی پر ایک نگاہ ڈال لے۔ تاریخ میں زندہ رہنے کے لیے وہ کسی منصب کے محتاج قطعاً نہیں تھے۔ ان کی خوبصورت شاعری عمر خیام کی طرح انہیں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ عالم مغرب کو جن چند مسلم تاریخی کرداروں نے اپنا گرویدہ بنایا ان میں سے ایک نام عمر خیام کا ہے۔ وہ یتیمی اور غریبی میں بچپن گزار کر فقط اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر ترک، ایران کی مشترکہ سلطنت کے سلجوقی حکمران کے دربار تک پہنچا۔ شاہی منجم مقرر ہونے کے ساتھ ہی شہنشاہ ملک شاہ کا قریبی مشیر بن گیا۔ ابراہیم خیمہ فروش کے بیٹے عمر نے اپنا تخلص خیام رکھا۔

ایک جنگ کے ہنگام، جس میں عمر خیام سترہ سالہ عام نوجوان سپاہی کے طور پر سلجوق بادشاہ الپ ارسلان کی سپاہ میں دادِ شجاعت دے رہا تھا تو اس نے وہاں تین پیشین گوئیاں کی تھیں۔ اوّل: الپ ارسلان جنگ جیتے گا۔ دوم: رومی اور سلجوقی دونوں بادشاہ قتل ہو جائیں گے۔ سوم: ملک شاہ زمام اقتدار سنبھالے گا۔ اس وقت کے درپیش حالات میں یہ تینوں باتیں انہونی سی لگ رہی تھیں کہ جنگ میں رومیوں کا لشکر الپ ارسلان کی فوج سے چھ گنا بڑا تھا اور جدید ہتھیاروں سے لیس۔ دونوں بادشاہوں کا مارا جانا غیر منطقی بات تھی اور ملک شاہ کے تخت نشین ہونے کا جہاں تک تعلق تھا تو وہ ابھی نوعمر تھا۔ چشم فلک نے مگر دیکھا کہ ایک سال کے اندر یہ تینوں پیشگوئیاں سچ ثابت ہو گئیں۔ انہی پیشگوئیوں کی صداقت کے صلے میں وہ شاہی ستارہ شناس بنا دیا گیا۔

(پس تحریر/ عامر بن علی)

ڈاکٹر صغریٰ صدف

○ میں نے شاعروں کی زندگی سے زیادہ اُن کے فن، فکر اور فلسفے پر کام کیا ہے۔

○ انسان کا ارادہ مضبوط ہو تو اُس کے لیے سب کچھ ممکن ہے۔

○ جو ادب زندگی کو نہ سنوارے وہ ادب نہیں ہو سکتا۔ ادب اور نعرے میں فرق ہونا چاہیے۔

س: یہ خیال کب اور کیسے آیا کہ لکھنا چاہیئے؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: چھٹی کلاس میں تھی جب میں نے اپنے نام کے ساتھ صدف تخلص استعمال کرنا شروع کیا اور نظمیں لکھیں جن میں محنت اور تعلیم سے مقام حاصل کرنے کا عزم پایا جاتا ہے۔

س: آپ نے ایم۔اے کا تھیسس فیض احمد فیض کے عمرانی فلسفے کے موضوع پر کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری میاں محمد بخش کے فلسفہ عشق پر کی۔ شاعری اور شاعروں کی زندگی سے دلچسپی کی کوئی خاص وجہ؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: شاعری سے میرا لگاؤ قدرتی ہے کیوں کہ میں خود شاعرہ ہوں۔ میں نے شاعروں کی زندگی سے زیادہ ان کے فن، فکر اور فلسفے پر کام کیا ہے۔ اسی لئے میں نے ایم۔اے میں تھیسس کیلئے فیض احمد فیض اور پی ایچ ڈی میں میاں محمد بخشؒ کے فلسفہ عشق کو اپنا موضوع بنایا۔

س: آپ نے کئی کتابیں اردو میں لکھی ہیں اور کئی کتب آپ کی پنجابی زبان میں ہیں۔ بیک

وقت مختلف زبانوں میں لکھنا کیسا تجربہ ہے؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: یہ مختلف زبانیں نہیں، ان میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ مختلف تجربہ تو تب ہو جب میں فرانسیسی، عربی یا کسی اور بدیسی زبان میں لکھوں۔ بہر حال ان دونوں زبانوں میں لکھنا اچھا لگتا ہے۔

س: آپ نے پنجابی زبان میں بہت کام کیا ہے۔ آج کل آپ پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج، آرٹ اینڈ کلچر کی ڈائریکٹر ہیں۔ اپنی موجودہ ذمہ داریوں کے متعلق ہمیں بتانا پسند کریں گی؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: یہ ادارہ پنجابی زبان، فن اور ثقافت کی ترویج و ترقی کیلئے قائم کیا گیا ہے۔ میری ذمہ داریوں میں پنجابی زبان، فن اور ثقافت تینوں کا فروغ شامل ہے۔ یہ جاب میرا شوق بھی ہے اس لئے میں اسے خوشی سے سرانجام دے رہی ہوں۔

س: پلاک کی اچیومنٹس کیا ہیں؟ اس ادارے کا کردار کس قدر اہم ہے؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: ماشاء اللہ پلاک کے زیر اہتمام پنجابی میگزین 'ترنجن' باقاعدگی سے چھاپا جا رہا ہے جس میں پنجابی زبان، فن اور ثقافت سے متعلق تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اسی طرح پنجابی زبان، فن،

ثقافت اور تاریخ سے متعلق کتب کی اشاعت بھی کی جاتی ہے۔ ادارے کے تحت پاکستان کے پہلے پنجابی ریڈیو چینل 'ایف ایم۔95 پنجاب رنگ' کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جس کے ذریعے پنجابی زبان و ادب کی ترویج ممکن ہوئی ہے۔ مزید برآں پنجاب میوزیم اور پنجاب آرٹ گیلری کے قیام کے ذریعے پنجاب کی ثقافت اور دستکاریوں کو محفوظ بنا کر عوام کیلئے قابل نمائش بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی لائبریری کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے جس میں پنجابی زبان، فن، ثقافت، تاریخ اور صوفی ازم پر کم وبیش 10 ہزار کتب ورسائل مطالعے کیلئے دستیاب ہیں۔ پنجاب آڈیٹوریم کے ذریعے مختلف قسم کی تقاریب کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے جن کے ذریعے پنجابی زبان اور ثقافت کا فروغ ممکن ہوا ہے۔ پنجاب کیفے میں ادباء، شعراء اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات کو آپس میں مکالمے کی سہولت بہم

پہنچانے کیلئے خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ تقریباً 19 کے قریب کتب کی اشاعت ادارے کے تحت کی جا چکی ہے اور کچھ کتابیں زیر طبع ہیں۔

س: اپنی ادبی تخلیق اور کتابوں کی تفصیل بتایئے گا؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: میری شاعری، تحقیق، فلسفے اور نثر کے حوالے سے دس کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

س: پہلی کتاب کب اور کن حالات میں آئی؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: 1999ء میں پہلی کتاب شائع ہوئی ''میں کیوں مانوں ہار''، اردو شاعری کی کتاب ہے۔

س: اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: جی میرا تعلق تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں سے ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ میٹرک قریبی قصبہ کوٹلہ سے کیا جہاں روزانہ چھ میل پیدل چل کر جایا کرتی تھی۔ بی۔ اے فوارہ چوک گجرات اور ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی فلسفہ ڈیپارٹمنٹ سے پہلی پوزیشن کے ساتھ کیا۔

س: آج کل آپ ادبی شعبے میں کچھ تحریر کر رہی ہیں؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: جی آج کل میں زیادہ تر اردو افسانہ، پنجابی کہانی اور تحقیقی کام کر رہی ہوں۔ کالم بھی لکھ رہی ہوں۔

س: ادیبہ، شاعرہ اور کالم نگار کے علاوہ آپ ایک سماجی شخصیت بھی ہیں۔ اتنا سارا کچھ کیسے کر پاتی ہیں؟ سب کاموں کیلئے وقت کیسے نکالتی ہیں؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: جی انسان کے ارادے مضبوط ہوں تو یہ سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔ پورا ہفتہ خیالات میرے ذہن میں تیرتے رہتے ہیں۔ اتوار کو میں انہیں صفحہ پر منتقل کرنے کی کاوش کرتی ہوں۔

س: آپ بیرون ملک بھی اکثر مشاعروں اور ادبی تقریبات میں جاتی رہتی ہیں۔ اب تک کون کون سے ممالک دیکھ چکی ہیں؟ سیاحت کا تجربہ کیسا رہا؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، فرانس، ناروے، دبئی، انڈیا، قطر وغیرہ۔ مشاعرے کم پڑھے ہیں۔ سیاحت کی غرض سے باہر زیادہ جانا ہوا۔

س: اب تک کون کون سے ادبی اعزازات حاصل کر چکی ہیں؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: کئی ممالک سے بے شمار اعزاز حاصل کر چکی ہوں مگر میری نظر میں اعزاز ایک ہی ہے پرائڈ آف پرفارمنس جو ابھی تک مجھے نہیں ملا۔

س: ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی، بہت پرانا مگر اہم سوال ہے، آپ اس بارے میں کیا رائے دیں گی؟

ڈاکٹر صغریٰ صدف: ادب دراصل ادب برائے زندگی ہی ہوتا ہے۔ جو ادب زندگی کو نہ سنوارے، زندگی کے مسائل کو زیرِ بحث نہ لائے وہ ادب نہیں ہوسکتا مگر ادب اور نعرے میں فرق ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی

- میرا نظریہ ادب برائے زندگی ہے۔
- ادب میں گروپ بندی کا قائل ہوں۔
- دوسری زبانوں کے ادب پر ناجائز قبضہ درست نہیں۔

ارژنگ: کیا آپ بتائیں گے کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی کون ہیں؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: جی ضرور میرا اصل نام حفیظ الرحمٰن ہے اور تخلص طاہر ہے۔ مگر اب بقول حسرت موہانی جب سے کہا ہے عشق نے حسرت مجھے کوئی بھی کہتا نہیں فضل الحسن۔ میں اب طاہر تونسوی ہوں اور اسی نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہوں۔ حتیٰ کہ میری والدہ مرحومہ بھی مجھے طاہر کہہ کر پکارتی تھیں۔ البتہ سرکاری کاغذات اور شناختی کارڈ پر یہی نام درج ہے اور ڈگریوں پر بھی حفیظ الرحمٰن طاہر تونسوی لکھا ہوا ہے۔ میں کاشانہ محمود تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان میں یکم جنوری 1948ء کو پیدا ہوا اور اولیاء کی اس سرزمین میں میرا بچپن اور پھر لڑکپن گزرا اور میں نے اپنی ابتدائی تعلیم وہیں مکمل کی اور پھر گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول ڈیرہ غازی خان سے میٹرک، گورنمنٹ کالج ملتان سے ایف ایس سی اور بی اے اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے اُردو کیا۔ (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے تھرڈ ایئر میں گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان میں داخلہ لیا اور پھر مائیگریشن کر کے گورنمنٹ کالج ملتان آ گیا۔ اسی طرح گورنمنٹ کالج ملتان میں ایم اے اُردو میں داخلہ لیا اور مائیگریشن کر کے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ڈگری لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس

وقت ملتان میں مقالہ لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ مجھے ہجرت کرنی پڑی اور اپنے اُستاد محترم ڈاکٹر سلیم اختر کے مشورے سے لاہور چلا آیا۔

آپ کے علم میں ہے کہ تونسہ ایک مردم خیز خطہ ہے۔ اولیاء کی سرزمین ہونے کے ناتے (حضرت شاہ سلیمان تونسوی جو چشتیہ سلسلے کے نامور ولی تھے انکی بدولت برصغیر پاک وہند میں چشتیہ سلسلے کو فروغ حاصل ہوا) اور پیر پٹھان کے فیض و برکات کی وجہ سے تونسہ، تونسہ شریف کہلایا اور ان کی بدولت علم و ادب کا بھی چرچا ہوا۔ چنانچہ اس زمین نے علم و ادب کے کئی روشن ستارے پیدا کیے جو ادب کی ترویج میں پیش پیش رہے اور بڑا نام کمایا۔ ان میں فکر تونسوی، ودیا پرکاش، سرور تونسوی، فدائے ادب تونسوی، محشر تونسوی اور رشید قیصرانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں لمحہ موجود تک ایک ایسی کہکشاں ہے جو ادبی دُنیا کو آباد اور شاداب کیے ہوئے ہے۔

ارژنگ: تونسہ ایک چھوٹا سا قصبہ اور پس ماندہ علاقہ ہے۔ وہاں سے آ کر آپ نے اتنی ترقی کی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اپنے آپ کو منوایا۔ اس کی وجوہات کیا ہیں؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: آپ نے صحیح سنا ہے اور درست کہا ہے کہ تونسہ پنجاب کی ایک پنجاب ماندہ تحصیل ہے اور جب سب تحصیلوں میں کالج کھل گئے تو پھر اس کی باری آئی۔ مگر یہاں تعلیمی کیفیت کا حال یہ ہے کہ اسے چھوٹا یونان کہا جا سکتا ہے اور تعلیم کا گراف سو فیصد ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ میرے چھوٹے سے گاؤں اور قصبے میں بھی شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو تعلیم یافتہ نہ ہو اور یہی حال لڑکیوں کا ہے۔ ہر گھر میں بی اے اور ایم اے پاس خواتین و حضرات کی تعداد قابل رشک ہے اور پھر آپ کے علم میں ہے کہ بادشمال جہاں جہاں سے گزرتی ہے ذہانتیں بکھیرتی چلی جاتی ہے۔ یہ حال میرے شہر اور اس کے آس پاس کی بستیوں کا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ روزگار کے مواقع نہ ہونا۔ صورت حال یہ ہے کہ تونسہ کے مغرب میں کوہ سلیمان ہے جو خشک اور بنجر پہاڑ ہے اور کبھی کبھی بارش ہو جاتی ہے۔ مشرق میں کہنے کو تو دریائے سندھ گزرتا ہے مگر وہ تونسہ کے لیے آبی وسائل کا باعث نہیں بنتا۔ رہی بات تونسہ بیراج کی تو یہ صرف نام کے لیے ہے۔ وہاں سے دو نہریں نکالی گئی ہیں۔ ان میں

سے ایک ڈیرہ غازی خان چلی جاتی ہے اور دوسری مظفر گڑھ۔ ہمارے حصے میں صرف سیلابی پانی آتا ہے۔ جو گزرگاہوں اور سڑکوں کو بھی بند کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے جب زمینوں کو پانی نہیں ملے گا تو فصلیں کیسے اُگیں گی۔ اناج کس طرح پیدا ہوگا۔ تونسہ میں میٹھے پانی کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔ رہی چشمہ سے نکلنے والی چشمہ نہر تو جو پانی بچ جاتا ہے ٹیل تک پہنچتے پہنچتے بس وہ قطرۂ اشک کے برابر ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں جب روزگار کے مواقع نہ ہوں تو پھر تعلیم کا حصول ہی مقصد رہ جاتا ہے اور یہی ہے۔ پھر روزگار کی تلاش کے لیے بلوچستان اور پنجاب کا رُخ کرنا پڑتا ہے۔ ایک اور بات محنت اور جفاکشی ہے۔ اس کی بدولت میں نے بھی پی ایچ ڈی کرنے کے بعد تحقیق و تنقید کی راہ اختیار کر کے شب و روز محنت اور اپنی تحریروں کی بدولت نام بھی کمایا اور شہرت بھی حاصل کی۔ حکومتی سطح پر دیر سے ہی سہی مگر اس کا اعتراف تو ہوا کہ مجھے 2009ء میں ادبی خدمات کے سلسلے میں تمغہ امتیاز ملا ہے۔ آپ نے بین الاقوامی سطح کی بات کی ہے مگر میرے لیے یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ تاہم مجھے خوشی ہے بلکہ فخر ہے کہ میرے تحقیقی کام کی پذیرائی ہوئی ہے۔ ملتان یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ایجوکیشن یونیورسٹی لاہور میں ایم اے کی سطح پر میری تحقیق و تنقید پر مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ایم فل کی سطح پر مقالہ تحریر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ونو بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ (بھارت) جامعہ شمس عین (الازہر یونیورسٹی) مصر میں میری تحقیق و تنقید پر پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور اساتذہ کی مہربانی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا گیا۔ اس میں یقینی طور پر میری محنت اور ریاضت کو بڑا دخل حاصل ہے۔

ارژنگ: ادب میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: میں ادب برائے زندگی کا قائل ہوں اور محض ادب برائے ادب کا نہیں۔ اس لیے کہ زندگی کی کیفیات اور اس کے باطن سے پھوٹنے والی روشنی اور اس کے محرکات کی وجہ سے یہاں کائنات رنگ و بو میں ہلچل ہے وہاں ادب میں بھی حرکت ہوئی اور تغیرات کی صورت حال بھی۔ اس تناظر میں جہاں زندگی میں حرکت و حرارت ہے تو پھر

ادب میں بھی اس کا ہونا لازمی امر بن جاتا ہے کہ ادب کے لیے موضوعات تو زندگی کے روزمرہ معمولات و معاملات ہی سے جنم لیتے ہیں۔ سو میں ادب کی تخلیق کے لیے مواد زندگی سے پیدا شدہ واقعات اور اس میں پیش آنے والے موضوعات سے لیتا ہوں اور میرا نظریہ ادب برائے زندگی ہے اور اس حوالے سے انسان کی باطنی واردات اور ظاہری تشکیلات ہیں۔ چنانچہ ہونے اور زندگی سہنے کو میں ادب کا وسیلہ سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک وہی ادب ہے جو زندگی کی بوقلمونیوں سے پیدا ہوتا ہے۔

ارژنگ: شاعری، تخلیق اور تنقید کس طرح ساتھ ساتھ چل رہے ہیں؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: میں نے اپنی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ مگر تحقیق و تنقید کی طرف زیادہ رغبت ہونے کی بنا پر شاعری کی طرف توجہ کم ہوتی گئی اور پھر اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ آدمی محض شاعر ہو تو مشاعرے پڑھنے کی طرف لپکا ہی رہتا ہے اور تحقیق و تنقید تو وقت مانگتی ہے۔ اس پس منظر میں میرے اُستاد محترم ڈاکٹر سلیم اختر نے مجھے مشورہ دیا کہ دو کشتیوں میں پاؤں مت رکھو۔ چنانچہ میں تحقیق و تنقید کی طرف آ گیا اور شاعری کم کم کرنے لگا۔ ویسے میں بنیادی طور پر شاعری یعنی تخلیقی فن کار ہوں اور شاعری کے حوالے ہی سے ادبی میدان میں قدم رکھا۔ پھر تحقیق و تنقید کی طرف راغب ہوا۔ تحقیق و تنقید کے سلسلے میں مجھے ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے راہ دکھائی اور عرش صدیقی نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تخلیق، تحقیق اور تنقید کو ساتھ ساتھ رکھتا ہوں اور شعر کہنا میری جبلت اور فطرت میں شامل ہے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ تخلیقی تجربے کے بغیر تنقید کا فریضہ سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے مجھے شعر کہنا اچھا لگتا ہے اور تخلیقی تحریروں کے بارے میں تنقید لکھنا تو اور بھی اچھا لگتا ہے اور پھر تحقیق کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے اور مواد کی فراہمی کے لیے تگ و دو کرتے ہوئے بہت اچھا اور بہت ہی اچھا لگتا ہے کہ اس سے انسان کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ آپ نے کوائف نامے میں میری تحقیقی و تنقید کتب کی فہرست دیکھی ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ میں نے اتنا کام کیسے کر لیا۔ ظاہر ہے یہ میری محنت اور لگن کا ثمر ہے اور اب تو میری شاعری کا مجموعہ ''تو طے ہوا نا!'' بھی سامنے آ چکا ہے جس کا

دیباچہ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر اسلم انصاری نے لکھا ہے اور فلیپ احمد فراز کا ہے جو میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ میرا ایک شعر ہے۔

صعوبتوں کے سفر میں میں نے بھرم رکھا پھر بھی حوصلوں کا
منافقت کے جہاں میں مجھ کو صداقتوں کا نصاب لکھنا

ارژنگ: یہ بات درست ہے کہ تحقیق و تنقید میں آپ نے ڈھیر سارا کام ہے۔ مگر فہرست میں مرتب کردہ کتابوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جبکہ آپ کا تخلیقی کام کم نظر آتا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: ایسا نہیں ہے میری اوریجنل کتابیں بھی بہت ہیں اور جو کتابیں میں نے ترتیب دی ہیں ان کی تحقیقی نوعیت بھی ہے اور تنقیدی اہمیت بھی۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ترتیب کے کام کو تیسرے درجے کا کام نہیں سمجھا جاتا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کسی بھی موضوع پر دس بیس کتابوں کو سامنے رکھ کر اور ان کے مضامین کا ایک انتخاب کیا اور دیباچہ لکھ کر کتابی شکل میں چھاپ دیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہندوستان میں ترتیب و تدوین کا کام پاکستان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوا ہے اور اس کام کی اہمیت اور افادیت بھی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان بھر میں مختلف موضوعات پر سیمینار ہوتے ہیں۔ غالب، میر انیس، میر، حالی، سرسیّد، شبلی، اُردو افسانہ کے مسائل، اُردو نویسی کے مسائل، اُردو املا کے مسائل، اُردو تحقیق۔ روایت و ارتقاء، تنقید کے دبستان وغیرہ۔ سیمیناروں میں جب یہ مضامین پڑھے جاتے ہیں اور ان کے خالق مختلف الخیال دانشور ہوتے ہیں اور اگر یہ سارے مقالے کتابی شکل میں یکجا ہو جائیں تو اس میں حرج کیا ہے۔ چنانچہ ایسی سینکڑوں کتابیں ہیں جن کے مرتبین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر انیس اشفاق، ڈاکٹر علی احمد کاظمی، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، اور بہت سے مستند ناقدین اور محققین ہوتے ہیں اور ان سے بجا طور پر استفادہ کیا جاتا ہے۔ تاہم اگر پاکستان میں کوئی لکھنے والا اس طرح کے موضوعات پر کتابیں مرتب کرے تو اس پر تنقید کی جاتی ہے اور اس میں تضاد یہ ہے کہ معترضین ہی اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور بغیر حوالے کے استفادہ کرتے ہیں اور پھر

دیکھیے کہ کسی خاص موضوع پر رسائل و جرائد کی تلاش اور تحقیق کے بعد کوئی کتاب مرتب کر دیتا ہے تو اس سے ریسرچ سکالرز کے لیے سہولت پیدا ہوتی ہے اور اسے بغیر دوڑ بھاگ کے ایک جگہ پر مواد میسر آ جاتا ہے۔ غالب صدی، اقبال صدی اور تحقیق و تدوین کے علاوہ لسانیات کے سلسلے میں جو کام تدوین کی شکل میں سامنے آیا اسے قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔اس وضاحت کے بعد اگر آپ مرتب کردہ کام دیکھیں تو اس کی مثال ''جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے'' اس حوالے سے اقبال صدی کے موقع پر میں نے علامہ اقبال کے فکر و فن کے بارے میں جو کتابیں مرتب کیں وہ ریسرچ سکالرز اور اقبال فہمی کے سلسلے میں کام کرنے والوں کی معاونت کرتی ہیں۔ یہی حال دوسرے موضوعات کا ہے۔ فہرست سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

شجر سایہ دار صحرا کا (کشفی ملتانی فن اور شخصیت) حیات اقبال، اقبال اور پاکستانی ادب، اقبال اور سلیمان ندوی، اقبال اور مشاہیر، اقبال اور عظیم شخصیات، طنز و مزاح، تاریخ تنقید، انتخاب، مسعود حسن رضوی (کتابیات) عرش صدیقی کے ساتھ مترادف، اقبال شناسی اور نخلستان، لکھنویات ادیب، اقبال شناسی اور النخیل، فیض کی تخلیقی شخصیت، اقبال شناسی ور نیرنگ خیال، ڈاکٹر سلیم اختر شخصیت و تخلیقی شخصیت، صنف نازک کی کہانیاں، صنف نازک کی شاعری، اقبال شناسی اور نیاز و نگار، ڈاکٹر فرمان فتح پوری انیس و دبیر تعارف و تقابل، غالب شناس اور نخلستان ادب وغیرہ کے متنوع موضوعات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا گیا ہوگا اور لمحہ موجود سے لے کر زمانہ مستقبل تک یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔اس کے ساتھ ساتھ میری تحقیقی و تنقیدی کتب اور مضامین کے مجموعوں پر نظر دوڑائیں تو میں نے اوریجنل کام بھی بہت کیا ہے اور ان میں جو تنوع اور انفرادیت ہے اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مثلاً تجزیے، ہم سفر بگولوں کا، رجحانات، ہم سخن فہم ہیں، لمحہ موجود ادب اور ادیب، عرش صدیقی، جہاں تخلیق کا شہاب، حیات اور کارنامے (پی ایچ ڈی کا مکالمہ)، تحقیق و تنقید منظر نامہ، تذکرہ کتابوں کا، وہ میرا محسن وہ تیرا شاعر، افکار و تجزیات، خواجہ فرید شخصیت اور فن میرے قلم سے نکلی ہوئی میری

تحریروں کی واضح گواہی کے لیے کافی ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ اتنے کم عرصے میں اپنا تخلیقی و تنقیدی کام کسی نے بھی نہیں کیا۔ ان کتب میں سے بیشتر بھارت میں شائع ہو چکی ہیں۔ حال میں ہی سچل سر شاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی خیر پور نے میری کتاب سچل سرمست، محبتوں کا پیامبر شائع کی ہے اور آپ کے علم میں ہے کہ میری ادبی خدمات کے سلسلے میں اس سال حکومت پاکستان کی طرف سے مجھے ''تمغہ امتیاز'' سے نوازا گیا جو میری محنت اور کام کا ثمر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم بھی شامل ہے۔

ارژنگ: کیا آپ گروپ بندی کے قائل ہیں اور کیا گروپ بندی کے فائدے ہیں یا نقصانات؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: جہاں تک میرا ذاتی تعلق ہے یوں تو میں ادب میں گروپ بندی کا قائل ہوں اور اسے ہم خیال لکھنے والے دوستوں کا ایک حلقہ سمجھتا ہوں اور آج کے میڈیا کے دور میں جب تک کوئی لکھنے والا اپنے گروہ کے ساتھ نہیں چلتا تب تک اس کی شناخت نہیں بن سکتی۔ البتہ اس سلسلے میں بددیانتی کا ارتکاب کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ محض گروپ کے لیے کسی کی نفی کرنا اچھی بات نہیں۔ دوسرے گروپ کے لکھنے والوں کے اچھے کاموں کی تحسین بھی ہونی چاہیے۔ مگر یہاں ایسا ہونا بہتر نہیں ہے کہ ادبی مزارعین صرف اپنے جاگیردار کی رطب اللسانی میں مصروف رہتے ہیں۔ یوں ادب میں جو تحریریں سامنے آئیں کیا وہ گروپ بند نہیں تھے۔ سرسیّد کی تحریک، فورٹ ولیم کی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک وغیرہ۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو اس کے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اختلاف تو صحت مند دل و دماغ کی علامت ہے۔ بس ذرا اس میں خرابی پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔

ارژنگ: ادبی مافیا کا کیا حال ہے؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: ادبی مافیا کا جو حال پہلے تھا اب بھی وہی ہے۔ یہ لوگ ہر دور میں چھائے رہتے ہیں کہ ان سب کے پیش نظر مفادات ہوتے ہیں اور مفادات اور رعایت حاصل کرنے کے لیے یہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ غیر ملکی دوروں سے لے کر

اعزازات حاصل کرنے تک یہ مافیا کیا کیا نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حقدار مارا جاتا ہے۔ یہ قبضہ گروپ ''جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے'' کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔

ارژنگ: تنقید کی موجودہ صورت حال سے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: کسی حد تک مگر اچھی تنقید بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ بس وہ گنے چنے ناقدین ہیں جن کے حوالے موجود ہیں یا پھر مغربی ادب سے استفادے کی بھونڈی شکل دکھائی دیتی ہے۔ پہلے ساختیات، پھر پس ساختیات اور پھر کچھ نہیں۔ تاہم ایسے ناقد موجود ہیں جن کی وجہ سے تنقید کا بھرم قائم ہے۔

ارژنگ: سنا ہے آپ فلمیں بہت دیکھتے ہیں، کون سی فلمیں پسند ہیں؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: آپ کو کس نے کہہ دیا کہ میں فلموں کا شوقین ہوں۔ میں تو فلمیں دیکھتا ہی نہیں اور پھر یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ میں 1987ء سے انتظامی عہدوں پر تعینات رہا ہوں۔ دفتری ذمہ داریوں سے وقت نہیں ملتا تھا کہ فلمیں دیکھتا پھرتا اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی نوکری کر رہا ہوں۔ پڑھنا بھی اس میں شامل ہے اور انتظامی مصروفیات بھی ہیں۔ جوانی میں سینما جا کر فلم دیکھ لیتے تھے اب تو ایسا بھی نہیں ہوتا۔

ارژنگ: کیا آپ موسیقی کے رسیا ہیں کیسی موسیقی پسند ہے؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: میں موسیقی کا دلدادہ ضرور ہوں مگر راگ راگنی سے واقف نہیں ہوں۔ البتہ غزلیں سننا زیادہ پسند کرتا ہوں اور اکثر اوقات ٹیپ ریکارڈر پر غزلیں لگا کر لکھنے کا کام کرتا ہوں تاکہ توجہ مرکوز رہے۔ البتہ مجھے بعض فلمی گیت بہت ہانٹ کرتے ہیں اس تناظر میں ہندوستانی گیت اچھے لگتے ہیں اور انہیں گنگناتا بھی رہتا ہوں۔

ارژنگ: کیا آپ کے نزدیک سرائیکی زبان و ادب کی الگ شناخت ہے؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: سرائیکی میرے نزدیک الگ زبان ہی نہیں برصغیر پاک و ہند کی قدیم ترین زبان بھی ہے اور وسیع زبان کے ناتے یہ ہر علاقے اور ہر خطے میں بولی جاتی ہے۔ سندھ کے بسنے والوں کی زبان بھی سرائیکی ہے اور سومرو عہد میں اسے بڑا عروج حاصل رہا۔ سرائیکی کی ایک الگ زبان ہونے کے ناتے ایک منفرد شناخت ہے۔ املاء کے اعتبار

سے بھی اور حروف کے اعتبار سے بھی کہ اس کے پانچ اضافی حروف ہیں اور یہ پنجابی زبان سے الگ تھلگ ہے اور اب تو یہ علاقائی زبانیں پاکستانی زبانیں ہیں۔ سرائیکی اب تدریسی زبان بھی ہے۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اور بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں سرائیکی کے الگ شعبے ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے سرائیکی الگ سے شامل ہے۔ سرائیکی ادبی بورڈ ملتان نے سرائیکی زبان و ادب کی نو سے زیادہ کتب شائع کی ہیں اور پنجابی سرائیکی کے جس جھگڑے کا تذکرہ آپ کر رہے ہیں وہ ماضی کا قصہ بن کر دفن ہو چکا ہے اور اس قصے میں بعض لوگوں کا ہاتھ ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب پر ناجائز قبضہ درست نہیں ہوتا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اسے ملتانی کہا ہے اور اگر اب پنجابی دانشور یہ کہیں کہ ملتانی سے مراد پنجابی ہے تو یہ سراسر تعصب کی بات ہے۔ خواجہ فرید کو پنجابی شاعری کہہ دینے سے ان کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ خالصتاً پنجابی یا سرائیکی کے شاعر ہیں۔ پنجابی دانشوروں کا تو یہ حال ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کو بھی پنجابی شاعر قرار دیا ہے۔ یہ رویہ درست نہیں ہے۔ زبانیں ایک دوسرے کی دشمن نہیں ہوتیں۔ یہ تو لوگ ہوتے ہیں جو ان میں دشمنی کا بیج بونے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ رہی بات سرائیکی صوبے کی تو میں لسانی بنیادوں پر تسلیم کا قائل نہیں ہوں۔ اگر پاکستان کو مزید صوبوں پر تقسیم کرنا ہے تو پھر یہ ایک انتظامی عمل ہوگا لسانی نہیں۔

ارژنگ: مستقبل کے عزائم کیا ہیں؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: آپ جانتے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے چیئرمین کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ تدریسی اور انتظامی دونوں ذمہ داریاں میرے سپرد ہیں اور بلامبالغہ یہ عطاء یونیورسٹی آف سرگودھا کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری صاحب کی ہے کہ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے یہ فریضہ سونپا ہے اور شعبہ اُردو کی ترقی کے لیے ان کی رہنماء میں میں آج شعبہ اُردو کو تحقیقی وتنقیدی (ریسرچ ورک) کے حوالے سے نمایاں کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔ ایم فل اُردو کی کلاسوں کا اجراء ہو

چکا ہے اور اب پی ایچ ڈی کی کلاس شروع کرنے کا پروگرام ہے۔ فیکلٹی کے ریسرچ جرنل کی اشاعت کا کام بھی جاری ہے۔ اس طرح کی مصروفیات میں سے جو وقت بچتا ہے اس میں میں اپنا تحقیقی و تنقیدی کام کرتا رہتا ہوں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ دیگر یونیورسٹیوں میں منعقد ہونے والے ادبی سیمیناروں میں بھی شرکت کروں۔ آپ نے میرے آئندہ کے عزائم کے بارے میں استفسار کیا ہے تو چند منصوبے ایسے ہیں جن پر کام ہو رہا ہے اور بعض کی اشاعت بہت جلد متوقع ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

1- شاعر خوشنوا۔ فیض احمد فیض
2- ماخذات غالب (پاکستان میں غالب شناسی کا تناظر)
3- ماخذات فیض
4- ماخذات احمد فراز
5- ماخذات خواجہ فرید
6- مولوی لطف علی۔ شخصیت وفن (پاکستانی ادب کے معمار)
7- حالی اور پیروئ مغربی (اس موضوع پر مکالات کا مجموعہ)
8- اُردو ادب کا عالمی نظام اور دوسرے مضامین (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)

ارژنگ: اُردو ادب میں ایک بڑے شاعر کا نام لیں تو آپ کس کا ذکر کریں گے؟

ڈاکٹر طاہر تونسوی: اس عہد کے اعتبار سے میرے نزدیک میر تقی میر، غالب، اقبال اور فیض بلا خوف حرف تردید بڑے شاعر ہیں۔

عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تری اذان میں نہیں ہے مری سحر کا پیغام

ظفر اقبال

- عوامی زبان ادبی بنتی رہتی ہے اور ادبی عوامی۔
- قومی زبان ایسی ہونی چاہیے جو اس کی چاروں علاقائی زبانوں کے مجموعے سے بنتی ہے۔
- میں غلط ہو سکتا ہوں لیکن جسے میں صحیح سمجھتا ہوں اُسے ضرور کر گزرتا ہوں۔

ارژنگ: ادبی سفر کا آغاز کیسے کیا ابتدا میں کن سے متاثر تھے۔؟

ظفر اقبال: میں اس وقت آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا جب میں نے دیوان غالب اور کلیات میر کا بیشتر حصہ پڑھ ڈالا تھا لیکن مجھے چونکہ پتہ تھا کہ میں نے کبھی جا کر شاعری کرنی ہے اور اگر یہ دونوں اساتذہ میرے زیر مطالعہ رہے تو میں ان کے اثر سے کبھی نہیں نکل سکوں گا۔ تو اس خدشے کے پیش نظر کلیات میر میں نے اپنے دوست سید اسرار زیدی کو دے دی جو ان دنوں اوکاڑہ ہی میں رہائش رکھتے تھے اور دیوان غالب (مصور چغتائی ایڈیشن) کوئی میرے ہاں سے اٹھا کر لے گیا جس پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے علاوہ میرا نہیں خیال کہ میں کبھی کسی کی شاعری سے متاثر ہوا ہوں۔ یہی دو شاعر شروع شروع میں میرے زیر مطالعہ آئے تاہم لکھنے کا آغاز میں نے بہت بُعد میں اس وقت شروع کیا جب میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔

ارژنگ: تو کیا آپ مطالعہ کی نفی کرتے ہیں؟

ظفر اقبال: میرا مطلب یہ ہے کہ ذہن پر اگر کوئی آدمی حاوی ہو جائے تو وہ اسی سے متاثر ہو

تا ہے اس لیے میں نے اس خطرے کا ازالہ اس طرح کیا کہ ان دونوں اساتذہ کو وقتی طور پر اپنے آپ سے الگ کر لیا۔

ارژنگ: اوکاڑا سے نکل کر لاہور میں پہچان بنانے کے لیے آپ کو کیا پاپڑ بیلنے پڑے؟

ظفر اقبال: دراصل میری پہچان قیام اوکاڑا کے دوران ہی بن چکی تھی، لاہور تو میں ۱۹۹۵ء میں آیا تھا اور یہ مسئلہ مجھے درپیش نہیں تھا۔

ارژنگ: آپ ہر وقت بڑے،، موڈ،، میں نظر آتے ہیں۔ اسکی کوئی خاص وجہ ہے؟

ظفر اقبال: میں موڈ میں ہوتا ہی نہیں۔ کبھی بھی، بلکہ ساتھ بیٹھے دوستوں کے ساتھ حسب توفیق گپ شپ بھی کیا کرتا ہوں اور مجھے کبھی خیال نہیں ہوا کہ میں دوسروں سے الگ تھلگ غصے یا موڈ میں ہوتا ہوں نہ ہی میرا مزاج ایسا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ بات صحیح ہو لیکن میں نے خود یہ بات کبھی محسوس نہیں کی نہ ہی یہ میری شعوری کوشش کا حصہ ہے۔

ارژنگ: آپ بیک وقت وکیل، کالم نگار اور شاعر ہیں، تین متضاد شعبوں میں خود کو برابر کیسے تقسیم کرتے ہیں؟

ظفر اقبال: مجھے ان میں ایسا کوئی تضاد نظر نہیں آتا اب تو میں اس بات کا عادی ہو گیا ہوں بلکہ وکالت میں تو کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے مجھے مدد دی ہے۔ مثلاً وکالت میں منطق اس کا لازمی حصہ ہے جو دلائل دیتے وقت کام آتی ہے تو کالم لکھتے وقت بعض اوقات میں اس منطق سے بھی کام لیتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں میرا کام آسان ہو جاتا ہے۔

ارژنگ: آپ کا کہنا ہے کہ کالم نگاری میں بھی آپ نے اپنی شاعری کی طرز پر اپنا وضع کردہ طریقہ اپنایا ہے؟

ظفر اقبال: میں کہوں گا کہ یہ میری اپنی ایجاد ہے اور بہت سے لوگوں نے اسکی نقل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن میں سمجھتا ہوں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔ فکاہیہ کالم میں، میں پیروڈی لکھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں اور سرخیاں ان کی متن ہمارے بھی پیروڈی کی ہی ایک شکل ہے۔

ارژنگ: سرخیاں ان کی متن ہمارے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کیا،''نوائے وقت'' کے کالم ''سرراہے'' ہی کی ایک شکل نہیں؟

ظفر اقبال: سرراہے کے ساتھ اس کا تقابل بالکل نہیں کیا جا سکتا وہ مختلف موضوعات پر

ٹکڑوں میں کمنٹس ہوتے ہیں جب کہ ''سرخیاں ان کی متن ہمارا'' اس میں عام طور پر کسی سیا ستدان کا بیان ہوتا ہے اور میں اس کو اپنی ٹریمنٹ دیتا ہوں اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس بیان کے اس حصے کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے یا اس کا مضحک پہلو یہ بھی نکل سکتا ہے۔یا یہ کہ بیان دینے والے کے دل کے کسی گوشے میں یہ بات بھی ہوسکتی ہے جو اس کے بیان کے بظاہر کے بالکل برعکس ہی کیوں نہ ہو بہر حال کالم نویسی کو میں نے اپنی شناخت بنا نے کی کوشش نہیں کی۔یہ کام میں خود مزا لینے کی خاطر کرتا ہوں۔

ارژنگ: کالم نویسی ایسا سنجیدہ کام آپ صرف مزا لینے کے لیے کرتے ہیں؟

ظفر اقبال: میرا مطلب یہ ہے کہ لکھنے میں شاعری بہت سنجیدہ کام ہے میں اس سے بھی بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ہر تخلیق کار اپنی تخلیق یا فن پارے سے بہت لطف اندوز بھی ہوتا ہے کیونکہ ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ آپ کے لیے حقیقی مسرت یہ احساس ہے کہ آپ کسی کام میں مکمل طور پر (Competent) ہوں اور کرافٹ کے حوالے سے جب آپ محسوس کرتے ہیں بلکہ اپچ کے حوالے سے بھی کہ آپ کی تخلیق وہ شعر ہو یا کالم ہو اس پر آپ کو ایک طرح کا عبور حاصل ہے تو لامحالہ اس احساس سے خوشی ہوتی ہے۔اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عبور آپ کو حقیقتاً حاصل بھی ہو بلکہ یہ احساس ہی کافی ہے کہ آپ کسی صنف کسی انداز کسی لہجے یا کسی اسلوب پر ایک طرح کی قدرت رکھتے ہیں۔

ارژنگ: کیا ہر شخص کے لیے اپنا الگ تجربہ ضروری ہے؟

ظفر اقبال: تجربہ جو میں نے کیا وہ شاعری کے حوالے سے کیا ہے اور ہر تجربہ آدمی اپنی کسی ضرورت یا مجبوری کے تحت کرتا ہے یا سمجھتا ہے کہ اس میدان میں کسی تخلیقی تبدیلی یا کایا کلپ کی ضرورت ہے اور جو شعراء یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی نیا تجربہ کیے بغیر ہی تسلی بخش طور پر اپنا تخلیقی سفر جاری رکھ سکتے ہیں وہ تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس نہں کرتے۔ میں نے مثلاً زبان کے حوالے سے محسوس کیا کہ مروج اور پرانی زبان نہ صرف یہ کہ میرے ساتھ نہیں چل سکتی بلکہ نئی شاعری کے لئے زبان کا نیا ہونا بھی اس حد تک ضروری ہے کہ اس کا طریقہ استعمال کم از کم نیا ہو اور زبان کے حوالے سے ہمارے ہاں بے جا (Taboos) پائے جاتے ہیں۔اس سے گلا خلاصی کو میں نے بہت ضروری سمجھا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا

کہ زبان کے حوالے سے اگر کھل کھیلنے کی ہمت اور انداز نہ اپنایا جائے تو آپ زیادہ دیر اور زیادہ دور تک سامان رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ یہ بات میرے تجربے میں آئی کہ وہ سرچشمے یعنی مقامی زبانیں جنہوں نے اردو کی آبیاری کی تھی ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کو اردو معلیٰ کہتے ہوئے یہ سرچشمے اس پر بند کر دیے حالانکہ اردو اپنے طور پر کوئی زبان نہیں تھی بلکہ بہت سی زبانوں اور بولیوں کا ایک مجموعہ تھی۔ جو عوام کی اکثریت میں بہت تیزی سے مقبول ہوئی اور پھیلی۔ ان دروازوں کو بند کرنے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا کہ اس زبان کے بہت سے الفاظ کثرت استعمال سے گھس چکے ہیں اور انہوں نے معنی دینا بند کر دیا ہے چنانچہ میں نے ان زبانوں اور بولیوں، الفاظ، لب ولہجہ، محاوروں اور روز مرہ (Flood Gate) اس زبان پر دوبارہ کھول دیا۔ جس کی پہلی مثال میرے دوسرے شعری مجموعے ''گلفتاب'' میں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان میں میں نے زیادہ تر پنجابی زبان کے استعمال کے امکانات کا جائزہ لیا ہے۔ بلکہ پنجابی کے وہ لفظ جو اردو میں متروک ہو چکے تھے ان کے بارے میں مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ دراصل یہ تو بہت عرصے سے اردو میں استعمال ہوتے رہے ہیں جن کا استعمال بعد میں ترک کر دیا گیا یہ اشفاق احمد کی ایک چھوٹی سی کتاب ''اردو کے خوابیدہ الفاظ'' سے مجھے علم ہوا۔

ارژنگ: لفظوں کو غیر متروک قرار دینے کا اختیار کس کے پاس ہے؟

ظفر اقبال: کچھ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جو عمومی سطح پر نہیں کیے جاتے بلکہ تخلیق کاروں اور مصنفین کی سطح پر کیے جاتے ہیں اور انہیں بدلا یا ان کی کایا کلپ بھی اسی سطح پر ہوتی ہے اور میں نے اسی نظریے کے تحت بطور ایک مصنف اور تخلیق کار کے اس تبدیل شدہ صورت حال کو دوبارہ روایت دینے کی کوشش کی۔ یہ کام زیادہ تر نقاد حضرات کرتے ہیں۔ جو اپنے طور پر زبان کے مدو جزر اور الفاظ کے سکہ رائج الوقت ہونے کے بارے میں وقتاً فوقتاً فیصلے کرتے رہتے ہیں۔

ارژنگ: گویا اس طرح آپ نے عوامی زبان کو ادبی زبان بنا دیا ہے؟

ظفر اقبال: یہ عمل چلتا رہتا ہے عوامی زبان ادبی زبان بنتی رہتی ہے اور ادبی زبان عوامی۔ کہا یہی جاتا ہے کہ زبان میں کسی بھی تبدیلی کا عمل عوامی سطح پر ہوتا ہے اور اس میں شعوری

کوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا لیکن ایک تخلیق کار چونکہ مستقبل بیں ہوتا ہے اس لیے وہ آنے والی ضروریات اور صورت حال کو سو پچاس سال پہلے بھی دیکھ سکتا ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ میرا نقطہء نظر غلط نہیں تھا وہ اس طرح سے کہ اب آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں اردو عوامی سطح پر بھی اب وہ اردو نہیں ہے جو پچاس سال پہلے بولی اور لکھی جاتی تھی حتیٰ کہ اخباری زبان تک تبدیل ہوگئی ہے اور یہ عمل پاکستان کے تمام صوبوں میں یکساں طور پر ہوا ہے۔ یعنی پنجاب میں بولی اور لکھے جانے والی زبان اس طرح تبدیل ہوئی ہے کہ اس میں پنجابی کے بے شمار لفظ لب و لہجے محاورے اور انگ شامل ہو گئے ہیں جو پہلے نہیں تھے جب کہ دوسرے صوبوں سندھ اور خصوصاً سرحد میں بھی یہی کچھ ہوا حتیٰ کہ سرحد پار بھارت میں بھی اخبارات ریڈیو، ٹیلی ویژن اور شعر ادب میں جو اردو زبان کارفرما ہوئی ہے وہ حیرت انگیز حد تک تبدیل ہو چکی ہے اور اس میں ہندی، سنسکرت، پنجابی اور انگریزی کے الفاظ اور لہجے کثرت کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ میرا عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ زبان میں تبدیلی کا عمل شعوری (تخلیقی سطح پر) اور عوامی یعنی بول چال کی سطح پر برابر جاری رہتا ہے اور ان دونوں کوششوں کو الگ نیں کیا جا سکتا۔ پھر میرا ایک تھیسز یہ بھی ہے کہ پاکستان کی ایک قومی زبان ایسی ہونی چاہیے جو اس کی چاروں علاقائی زبانوں کے مجموعے سے بنتی ہو کیونکہ صرف اسی ایک طریقے سے چاروں صوبوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لایا جا سکتا ہے اور انہیں ایک قوم کی صورت دی جا سکتی ہے جو اسے آج تک حاصل نہیں ہو سکی اور جو کہ ہمارا بہت بڑا المیہ بھی ہے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ صرف مذہب بھی ہمیں ایک قوم بنا سکنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ جو دُوری مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان میں اس حد تک پیدا ہوئی کہ ان دونوں طرف موجود تھا۔

ارژنگ: زبان کا رشتہ تو ہمارا انڈیا کے ساتھ بھی کافی حد تک موجود تھا۔ پھر ہمیں علیحدہ وطن کی ضرورت کیوں پیش آئی۔؟

ظفر اقبال: معاشی طور پر انہوں نے ہمارا جینا دشوار کر رکھا تھا اور آئندہ بھی کر سکتے تھے اور اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیں دبائے رکھنے کا شوق پورا کر سکتے تھے اور ہم سے سینکڑوں سال کی اس حکمرانی کا بدلہ لے سکتے تھے جو انگریزوں کے آنے سے پہلے ان کے تجربے میں

آئی تھی اور بھی کئی عوامل ایسے تھے جن کی وجہ سے ہمیں ان سے الگ ہونا پڑا اور اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مذہب جو ہے اگر کئی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے تو کئی معاملات اس کے دائرہ کار میں نہیں آتے اور جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں ورنہ اگر ہم اندر اور باہر دونوں طرف سے مسلمان ہوتے تو ایک امت مسلمہ کی شکل اختیار کرتے ہوئے اس یگانگت اور یکجہتی کا مظاہرہ کرتے جو ہمارے ہاں مفقود نظر آتی ہے۔ زبان کا حوالہ یہاں عملی طور پر ظاہر ہوا ہے کہ ایک بلوچی، سندھی اور پختون، پنجابی نہیں جانتا اور اسی طرح پنجابی ان صوبوں کی زبان بول سکتے ہیں لکھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں حالانکہ یہ صوبے ایک ہی ملک میں واقع ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ اگر ان علاقائی زبانوں کے فاصلے اتنے کم ہو جائیں کہ ایک یگانگت کا احساس پیدا ہو سکے تو ہماری قومی یکجہتی کا الجھا ہوا مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے۔

ارژنگ: تجربہ کرنے کے لیے کس قسم کی اہلیت درکار ہے؟

ظفر اقبال: اگر زبان کا تجربہ کر رہے ہیں تو آپ کو زبان پر خاصی حد تک عبور حاصل ہونا چاہیے یہ نہ ہو آپ زبان سے اپنی لاعلمی کو بہانے کے طور پر پیش کریں اگر آپ کو زبان پر قدرت حاصل نہیں ہے تو آپ کو اس کام میں ہرگز ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ اس کا نتیجہ ناکامی ہی ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جو تجربہ آپ کرنا چاہتے ہیں یا جو تبدیلی آپ لانا چاہتے ہیں۔ اس نظریے پر آپ کا مکمل ایمان بھی ہو تیسرے اس تجربے کو بروئے کار لانے کے لیے جس دلیری اور جرات کی ضرورت ہے وہ بھی آپ میں موجود ہو اور یہ تجربہ آپ اس بات سے بے پروا ہو کر کریں کہ دوسرے کیا کہیں گے یا یہ کہ وہ تجربہ کامیابی کا منہ دیکھتا ہے یا نہیں کیونکہ کسی تجربے کا ۵ فیصد کامیاب ہو جانا بھی اس کی کامیابی ہی کی دلیل ہے۔ حتیٰ کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک تجربہ مکمل طور پر ناکام بھی ہو جاتا ہے تب بھی یہ ایسا ہے کہ اسے کیا جانا چاہیے اور تبدیلی کی کوشش مسلسل کرتے رہنا چاہیے۔ کیونکہ تازگی اور تبدیلی تجربے سے ہی میسر آ سکتی ہے بلکہ ایک قول جس کا میں حوالہ بھی دیا کرتا ہوں یہ ہے کہ کچھ نہ سوچنے سے غلط سوچنا بہر حال بہتر ہے اور میں اپنے ضمن میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں اگر اب تک شعری ادب اور ادبی منظر پر موجود ہوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ان

تجربات سے خود فائدہ اٹھایا ہے۔ اگرچہ دوسروں کے لیے فائدہ اٹھانے کی دعوت بھی اس میں موجود تھی۔ لیکن اگر کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا تو شاید اس لیے بھی کہ اس کام میں بہرحال خطرات مول لینے پڑتے ہیں اور اپنی بنی بنائی شناخت اور امیج کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے جب کہ میرے اندر یہ جرات رندانہ تب بھی موجود تھی اور اب بھی اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ میں غلط ہوسکتا ہوں، لیکن جسے میں صحیح سمجھتا ہوں اسے ضرور کر گزرتا ہوں۔ اس سے میرے بڑے مخالفین وجود میں آئے لیکن اگر میں اس بات کا خیال کرتا تو شاید کبھی کچھ نہ کرسکتا اور اپنے ساتھ آغاز سفر کرنے والوں کی طرح ربع صدی پہلے سے ہی ایک قصہء پارینہ ہوکر شعری وادبی ریٹائرمنٹ لے چکا ہوتا۔

ارژنگ: جیسا کہ آپ نے ابھی کہا، اگر آپ کو زبان پر قدرت حاصل نہیں تو آپ کو اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے کیونکہ اس کا نتیجہ ناکامی بھی ہوسکتا ہے، کیا ہم اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں، اس کا نتیجہ تجربہ بھی ہوسکتا ہے؟

ظفر اقبال: یہ دو کیٹگریز ہیں ایک تو یہ کہ آپ کو زبان پر قدرت حاصل ہو لیکن آپ اس میں تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کریں دوسری یہ کہ زبان پہ قدرت حاصل ہونے کے باوجود آپ اس سے مطمئن نہ ہوں اور وہ آپ کے ساتھ چل نہ رہی ہو اور آپ سمجھ رہے ہوں کہ اس میں بنیادی تبدیلیاں کیے بغیر آپ اپنا تخلیقی سفر جاری نہیں رکھ سکتے تو پھر آپ کی یہ مجبوری بن جاتا ہے کہ آپ زبان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کریں حسب ضرورت اس کی توڑ پھوڑ کریں اور بطور خاص شاعری میں ایسے طریقے سے استعمال کریں کہ جو وسعت زدہ از کار رفتہ اور روائتی نہ ہو اور آپ کے مزاج کے لگا کھاتا ہو اور آپ کے تخلیقی وفور کا ساتھ دے سکتا ہو۔

ارژنگ: اس طرح بیک وقت دو محاذ پر لڑائی سے کیا تخلیقی قوت متاثر نہیں ہوگی؟

ظفر اقبال: اس طرح تجربہ آپ کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے پھر کوئی تضاد باقی نہیں رہ جاتا بلکہ یہ تجربہ آپ کو نئی طاقت توانائی اور تازگی بخشتا ہے۔

ارژنگ: ہمعصر کالم نگاروں اور شاعروں میں سے کن سے متاثر ہیں۔ چند ایک نام ضرور لیں؟

ظفر اقبال: نہ میں کسی شاعر سے متاثر ہوا ہوں نہ کسی کالم نگار سے بلکہ میں شعر و ادب میں متاثر کرنے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ نہ ہی میں اس ضمن میں کبھی استادی شاگردی کا روگ پالا ہے۔

ارژنگ: اپنے ایک انٹرویو میں آپ نے یہ بات کی کہ آپ نے اوکاڑا میں بیٹھ کر پاکستان کے دو بڑے ادبی گروپوں کا ناکوں چنے چبوائے کیا یہ بات درست ہے اور کیا یہ خود کو منوانے کا ایک طریقہ تو نہیں تھا۔؟

ظفر اقبال: اس میں مقصد تھا کہ ادب میں گروپ بازی یا دھڑے بندی ادب کو نقصان پہنچاتی ہے اور میں چونکہ بنیادی طور پر دھڑے بازی کے خلاف تھا اس لیے یہ دونوں دھڑے اور ان کے لیڈر بطور خاص میرا قدرتی ہدف بنتے تھے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی شناخت بنانے اور اپنے مقام کو اونچا کرنے کے لیے ان دونوں دھڑوں نے ایک طرح سے اپنی اپنی آڑھت کھول رکھی تھی اور اپنے اپنے ادبی رسالے کے ذریعے یہ اپنی اپنی دوکانداری چمکانے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے خلاف افسوسناک حد تک صف آراء تھے اور ایک ادبی بدمزگی انہوں نے پیدا کر رکھی تھی جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ چنانچہ میرے جیسے آدمی کا ان دھڑے بازوں کو آنکھیں دکھانا اور ان کو ان کی اصلی حیثیت سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں اس کام کے ذریعے اپنی پہچان بنانے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ اس لیے غلط ہے کہ میں تو خود بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا کیونکہ صورت حال یہ تھی اور کم وبیش اب تک بھی جاری و ساری ہے کہ پاکستان کا کوئی شاعر ادیب ان دونوں دھڑوں میں سے ایک کے ساتھ وابستہ ہوئے بغیر یا دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھے بغیر یا دونوں دھڑوں کے بارے میں ایک منافقانہ مرنجاں رویہ اختیار کیے بغیر ادبی منظر پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے ابتداء میں ان دونوں دھڑوں کی طرف سے ہمیشہ مثبت سلوک اور رویہ میسر آیا لیکن چونکہ ان کا کام غلط تھا جس کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں۔ اس لیے میرے پاس ان دونوں کو مسترد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا اور میں نے ان کی اس سیاست کا نا صرف ہمیشہ سے انکار کیا ہے بلکہ اس کے خلاف اپنی بساط کے مطابق صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے اور بعض اوقات یہ ناگوار فرض بھی ادا کرنا پڑا ہے کہ تخلیقی اعتبار سے ان دونوں ادبی رہنماؤں کی اصل حیثیت کیا ہے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ جس کا کہ مجھے ہر طرح سے حق حاصل ہے اور جس طرح کہ ہر لکھنے والے کا ہر دوسرے لکھنے والے کے بارے میں رائے ظاہر کرنے کا

استحقاق موجود ہوتا ہے۔ ورنہ مجھے الحمد اللہ ان کے ذاتی یا شخصی کردار سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اسی لیے میں ان کے فن کے بارے میں گفتگو کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

ارژنگ: آپ اور آپ کے بعد کی نسل کے شاعر اسلم کولسری کے بعد اوکاڑہ کے ادبی منظر پہ کوئی قابل ذکر نام جس نے آپ کو متاثر کیا ہو؟

ظفر اقبال: اوکاڑا میں ایک دو شاعر ہیں مثلاً مسعود احمد اور جاوید اختر مانو وہاں پر دو جینوین شاعر تخلیق شعر ادب میں مصروف ہیں جن کی دو دو تین تین کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ ان میں جاوید اختر مانو زیادہ جدید زیادہ جاندار اور زیادہ مزاحمتی ہے وہ نظم ونثر دونوں میں طبع آزمائی کرتا ہے اس نے شاعری کے علاوہ چند بہت اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے سینئر دوست اقبال صلاح الدین ہیں جو بیماری کی حالت میں بھی اپنے تخلیقی اور تحقیقی کام میں مصروف رہتے ہیں۔

ارژنگ: ادب کی ترقی وترویج میں ادبی اخبارات ورسائل کے مدیران کا کیا کردار ہے اور کیا ان کی اس ادبی خدمت کے صلے میں حکومتی سطح پر اعتراف ہونا چاہیے؟

ظفر اقبال: ان کا بالکل حصہ ہے بلکہ میں نے اپنے ایک انٹرویو میں اوراق، اور فنون، دونوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی خدمات کا اعتراف کیا تھا البتہ جو ادبی خبر نامے قسم کے اخبارات نکلتے ہیں ان کی اپنی ایک افادیت ہے اور شاعروں، ادیبوں کو ایک دوسرے کے ذاتی اور فنی معاملات سے آگاہ کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے جو دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور انہوں نے ایک اچھے خاصے خلا کو پر کر رکھا ہو۔ تو جہاں تک ایوارڈز کا تعلق ہے تو یہ دینے والوں کا تعلق ہے کہ وہ کس کا ایوارڈ دیتے ہیں اور کس کا نہیں۔ البتہ یہ مدیران کرام چونکہ اپنی حیثیت میں مسلمہ طور پر شاعر یا ادیب بھی ہیں۔ اس حیثیت میں وہ ایوارڈ دینے والوں کی نگاہ انتخاب میں آسکتے ہیں اور کئی حضرات کو یہ ایوارڈز مل بھی چکے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی

○ ادیب کی نظریاتی کمٹ منٹ معاشرے کے دیگر افراد سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہونی چاہیے۔

○ عوامی مقبولیت یا عدم مقبولیت کسی کے بڑا یا چھوٹا شاعر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

○ زندگی میں کسی بھی مقصد کے لیے میں نے کبھی کوئی پلاننگ نہیں کی

ارژنگ: آپ بیک وقت استاد، ڈرامہ نویس، سفرنامہ نگار، شاعر اور کالم نگار ہیں۔ آپ کے خیال میں آپ کی اصل پہچان کس حوالے سے ہے؟

عطاء الحق قاسمی: میرا خیال ہے کہ شاعری کے علاوہ باقی جتنی اصناف میں لکھتا ہوں اس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ میرے ٹی وی ڈرامے طنز و مزاح کی ذیل میں آتے ہیں ۔ میرے کالموں میں فکاہیہ عنصر نمایاں ہے اسی طرح میرے سفرناموں میں بھی یہی فضا آتی ہے۔ چنانچہ میرے خیال میں میری پہچان طنز و مزاح کے حوالے سے بنتی ہے۔

ارژنگ: کالم نگاری کی طرف آپ کا رجحان حادثاتی تھا یا باقاعدہ آپ کے ذوق شوق کی علامت کے طور پر سامنے آیا؟

عطاء الحق قاسمی: کالم نگاری کا آغاز میں نے فسٹ ایئر میں کیا جب ایم اے او کالج میں طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے اور یوں اگر دیکھا جائے تو آج میری کالم نگاری کی عمر ۴۰ سال ہو چکی ہے جس میں چونتیس سال میں نے صرف ،،نوائے وقت،، کے لئے کالم لکھا ہے۔ میں حادثاتی طور پر کالم نگار نہیں بنا بلکہ یہ تحفہ مجھے اپنے والد ماجد مولانا بہاؤ الحق قاسمی

کی طرف سے وراثت میں ملا۔ والد محترم ایک جید عالم دین ہونے کے علاوہ ایک پندرہ روزہ کے ایڈیٹر بھی تھے جس میں وہ خود فکاہیہ کالم بھی لکھتے۔ یوں یہ چیزیں میرے خون میں شامل ہیں۔

ارژنگ: نوائے وقت، کے ساتھ اس قدر شدید وابستگی کے پیچھے کیا کوئی نظریاتی وجہ ہے۔

عطاء الحق قاسمی: شاید اس لیے کہ میری پہلی تقرری بطور سب ایڈیٹر نوائے وقت میں ہوئی وہاں سے میں نے باقاعدہ کالم نگاری کا آغاز کیا اور آج تک میں اسی اخبار سے وابستہ ہوں کیونکہ بقول میر:

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

مجھے دوسرے اخباروں سے بہت بڑی آفرز بھی موصول ہوئیں مگر میرا دل نہیں مانتا تھا کہ میں صرف دولت کی خاطر اپنا اخبار تبدیل کروں حالانکہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ مگر یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔

ارژنگ: بقول ظفر اقبال:

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفرؔ
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

اس شعر کے تناظر میں یہ بتائیے کہ ایک ادیب یا کالم نگار کو کس حد تک نظریاتی ہونا چاہیے؟

عطاء الحق قاسمی: میں سمجھتا ہوں کہ ایک ادیب کی نظریاتی کمٹ منٹ معاشرے کے دیگر افراد سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم ہونی چاہیے۔ بہت سے ادیب اور دانشور، فاٹا گروپ کے ارکان کی طرح ہر حکومت کی سیاسی اور نظریاتی بیل گاڑی میں جتے نظر آتے ہیں۔ یہ ادب اور ادیب کی توہین ہے۔ جو ادیب قاری کو مسرت کے ساتھ ساتھ اسکی ذہنی تربیت کا اہتمام نہیں کرتا وہ ادیب نہیں،، مالشیا،، ہے۔

ارژنگ: موجودہ مجموعی ملکی صورت حال کے حوالے سے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمارا دانشور

طبقہ اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہا ہے؟
عطاء الحق قاسمی: ہمارا دانشور طبقہ بالکل اسی طرح آج بھی اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کر رہا ہے۔ جس طرح اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور ۱۹۴۷ء کی تحریک پاکستان میں عوام کی خواہشوں، ان کی منگوں اور ان کی آرزؤں سے کنارہ کشی اختیار کی تھی۔ بہت کم دانشور ایسے ہیں جو اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑے رہنا جانتے ہیں ورنہ چھوٹے چھوٹے مفادات گھٹیا خواہشیں اور جھوٹی انا انہیں اس رستے پر لے جاتی ہیں جو ایک دانشور کا رستہ نہیں ہوتا۔
ارژنگ: آزادیء صحافت کے حوالے سے آپ موجودہ حکومت کے کردار کو کس حوالے سے دیکھتے ہیں؟
عطاء الحق قاسمی: مجھے موجودہ حکومت سے بنیادی اختلاف ہیں۔ جن کا اظہار میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے آج تک پورے تواتر اور بلند آہنگی کے ساتھ کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن میرے نزدیک، ڈیول، کو اس کا ڈیو، ضرور دینا چاہیے۔ اس کے مطابق مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ اس حکومت نے پریس کو بہت حد تک آزادی دے رکھی ہے جس کی گواہی اخبارات کے صفحے بھی دیتے ہیں۔
ارژنگ: بین الاقوامی مشاعروں میں آپ کو بطور شاعر دعوت دی جاتی ہے ۔ جبکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اور جیسا کہ آپ نے اس گفتگو میں خود بھی اعتراف کیا ہے کہ آپ کی اصل شہرت اور مقام بحیثیت مزاح نگار ہے اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟
عطاء الحق قاسمی: اس میں میرا نقطہء نظر یہ ہے کہ مزاح نگار کے طور پر پہچان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے یا دوسرے لوگوں نے بطور شاعر میری پہچان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میں نے اندرون ملک اور بیرون ملک بے شمار مشاعرے پڑھے ہیں اور ہر مشاعرے میں میری شاعرانہ حیثیت کی بے پناہ پذیرائی ہوئی ہے جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں مجھ سے ملتی جلتی مثال منو بھائی کی بھی ہے جو ایک کالم نگار کے طور پر پہچانے جاتے ہیں مگر لوگ انہیں مشاعروں میں بطور شاعر بھی مدعو کرتے ہیں اور ان کا کلام ثابت کرتا ہے کہ وہ

بہت عمدہ شاعر بھی ہیں۔ ایک اور بات جو اس حوالے سے میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ منتظمین صرف ان شعراء کو اپنے مشاعروں میں مدعو کرتے ہیں جن کی عوام میں مانگ ہوتی ہے۔ تاہم اس سے ان شعراء کا دل کھٹا نہیں ہونا چاہیے جنہیں مشاعروں میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ عوامی مقبولیت یا عدم مقبولیت کسی کے بڑا یا چھوٹا شاعر ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

ارژنگ: مشاعروں میں شرکت کے حوالے سے کسی ادبی پرچے کی ادارت یا ادبی ایڈیشن کی انچارج شپ کس حد تک معاون ہو سکتی ہے؟

عطاء الحق قاسمی: جہاں تک ادبی ایڈیشن کا معاملہ ہے۔ اس کا بہتر جواب تو وہ دے سکتے ہیں جو کسی ادبی ایڈیشن کے انچارج ہیں مگر جہاں تک ادبی پرچے کا مدیر ہونے کا تعلق تو بے شمار ادبی پرچوں کے مدیر ایسے ہیں جو شاعر بھی ہیں مگر انہیں مشاعروں میں شرکت کا موقع نہیں ملتا۔ اس کی وجہ وہی ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مشاعرہ پڑھنا یا نہ پڑھنا کسی کے چھوٹے یا بڑے شاعر ہونے کی دلیل نہیں۔

ارژنگ: اپنے موجودہ مقام و حیثیت سے کس حد تک مطمئن ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: آپ کو سن کر حیرت ہوگی زندگی میں کسی بھی مقصد کے لئے میں نے کبھی کوئی پلاننگ نہیں کی۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اس کی رحمت اور اپنے والدین کی دعاؤں کی بدولت ہوں۔ میں نوائے وقت میں سب ایڈیٹر بھی حادثاتی طور پر بنا کالج میں لیکچر شپ بھی حادثاتی طور پر ملی اور ناروے میں بطور سفیر میرا تقرر بھی میری طلب کے بغیر ہوا بلکہ میں نے انکار کیا مگر جس طرح میں زندگی کے دوسرے مواقع پر وہ کچھ بنتا چلا گیا جس کی میں نے خواہش نہیں کی تھی۔ یہاں بھی وہی معاملہ درپیش ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو سفارت کے عہدے سے استعفیٰ دیتے ہوئے مجھے رتی بھر ملال محسوس نہیں ہوا۔ میں آج بھی اتنا ہی مطمئن اور خوش ہوں جتنا ہمیشہ سے تھا۔

ارژنگ: تھائی لینڈ اور ناروے میں بطور سفیر کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟

عطاء الحق قاسمی: جیسا کہ میں نے آپ کو ابھی یہ بتایا کہ اس عہد کے قبول کرنے کے سلسلے میں

میرے کچھ تحفظات تھے مگر جب مجھے سوا دو سال ناروے اور تھائی لینڈ میں بطور سفیر کام کرنیکا موقع ملا تو میں نے محسوس کیا کہ اگر میں یہ عہدہ قبول نہ کرتا تو شاید ایک بہت بڑے تجربے سے محروم رہ جاتا۔ بطور سفیر مجھے اس شعبے میں جھانکنے کا موقع ملا جس کا موقع بطور ادیب نہیں مل سکتا تھا اور یوں میرا Vision پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہوا جو میرے تخلیقی کاموں میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔

ارژنگ: بطور سفیر آپ جن تجربات مشاہدات سے گزرے ان کو کتابی شکل دینے کا کوئی ارادہ ہے اور کب تک ہے؟

عطاء الحق قاسمی: میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے تجربات کتابی صورت میں بیان کروں مگر یہ ایک خاصا محنت طلب اور نازک کام ہے انشاء اللہ کسی مناسب موقع پر اپنے یہ تجربات احاطہ تحریر میں لاؤں گا۔

ارژنگ: کافی دیر ہوگئی ٹی وی پر آپ کا کوئی ڈرامہ دیکھنے میں نہیں آیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

عطاء الحق قاسمی: میں اصل میں ڈرامہ اپنی خواہش سے کبھی نہیں لکھتا۔ میرے ڈرامے خواجہ اینڈ سن، شب دیگ، حویلی، اپنے پرائے، الیکشن الیکشن اور شیدا ٹلی ٹی وی والوں کے بے پناہ اصرار کے تحت لکھے گئے۔ ان دنوں پرائیویٹ پروڈکشن والوں نے مجھ پر یلغار کی ہوئی ہے تاہم میں ابھی تک کسی کے قابو میں نہیں آیا ہو سکتا ہے آئندہ سال کوئی ڈرامہ لکھوں مگر میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ارژنگ: کچھ خاندانی پس منظر، بچپن اور تعلیم وغیرہ کے بارے میں بتائیں؟

عطاء الحق قاسمی: میں یکم فروری 1973 کو امرتسر میں پیدا ہوا۔ میری انتہائی خوش بختی ہے کہ میرے والد ماجد مولانا بہاء الحق قاسمی تھے جو ایک نامور عالم دین اور کئی کتب کے مصنف تھے۔ ان کی ایک اہم تصنیف ''تذکرۃ الاسلاف'' ہے جو ہمارے بزرگوں کے بارے میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے اسلاف کی تاریخ گزشتہ ایک ہزار برس پر محیط ہے دوسری اہم کتاب ہے ''اسلام اور اشتراکیت'' یہ ابا جی کے ان مضامین کا

مجموعہ ہے جو ان کی چوہدری افضل حق کے ساتھ ایک علمی بحث پر مشتمل تھے۔ یہ مضامین بعدازاں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ والد محترم امرتسر ہی سے ایک پندرہ روزہ مجلہ ضیاء الاسلام بھی نکالتے تھے جس کے وہ خود مدیر بھی تھے اور اس میں ایک فکاہی کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ فکاہی کالم نگاری مجھے ورثے میں ملی ہے۔ میرے دادا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی ایک مشہور عالم دین اور امرتسر کے مفتی تھے۔ ان کے شاگردوں میں بہت بڑی بڑی شخصیات شامل ہیں جن میں امیر شریعت سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری اور جامعہ اشرفیہ کے بانی مفتی محمد حسن نمایاں ہیں۔ میرے دادا کے والد اور ان کے والد اسی طرح ہمارے خاندان میں ایک ہزار سال تک کوئی بزرگ ایسا نہیں گزرا جس کی علمی و دینی خدمات تاریخ میں ریکارڈ نہ ہوئی ہوں۔ ہمارے آباؤاجداد عرب سے آئے تھے اور ہم حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد میں سے ہیں۔ وہ لوگ عرب سے آ کر ہندوستان میں آگرہ میں آباد ہوئے اور وہاں سے کشمیر چلے گئے۔ یہ کوئی آٹھ سو سال قبل کی بات ہے۔ علم کا چراغ انہوں نے ہمیشہ ہی روشن رکھا۔ ہمارے اسلاف کے شاگردوں میں حضرت مجدد الف ثانی جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔ ہمارے خاندان کے بزرگوں میں دو افراد ایسے بھی ہیں جن کو دوسرے ممالک میں سفارت کاری کا شرف حاصل رہا۔ گویا سفارت کاری بھی مجھے ورثے میں ملی ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھے علم سے محبت عطا فرمائی۔ کشمیر میں آٹھ سو سال رہنے کے بعد میرے بزرگ امرتسر آ گئے۔ چنانچہ آپ یہ سمجھ لیں کہ پنجاب میں ہمارا خاندان گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے آباد ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری پیدائش امرتسر کی ہے۔ جب پاکستان قائم ہوا تو ہم لوگ ہجرت کر کے وزیرآباد آ گئے۔ وزیرآباد آنے کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ وہاں میری نانی اماں رہائش پذیر تھیں۔ میں نے پرائمری تعلیم وزیرآباد سے حاصل کی اور میٹرک کرنے کے دوران ہم لوگ ماڈل ٹاؤن شفٹ ہو گئے۔ وزیرآباد میں اباجی ایک سکول میں مدرس تھے۔ والد صاحب کے مرشد تھے مفتی محمد حسن جامعہ اشرفیہ والے اور مفتی صاحب کے مرشد میرے دادا تھے۔ اس طرح میرے والد اور مفتی محمد حسن کے درمیان دہرا رشتہ قائم تھا۔ مفتی صاحب نے میرے والد

صاحب کو حکم فرمایا کہ وہ جامعہ مسجد ماڈل ٹاؤن کی خطابت کے فرائض سنبھال لیں۔ والد محترم یہاں نہیں آنا چاہتے تھے لیکن چونکہ اُستاد کا حکم تھا اس لیے وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ماڈل ٹاؤن آ گئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہم بھی یہاں شفٹ ہو گئے۔ اس لیے میٹرک میں نے ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن سے کیا۔ بی اے ایم اے او کالج لاہور اور ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اورینٹل کالج سے حاصل کی۔ ماڈل ٹاؤن میں میرا حلقہ احباب طبقہ امراء کے آزاد خیال نوجوانوں پر مشتمل تھا۔ جبکہ میرے گھر کا ماحول نہایت علمی اور دینی تھا۔ مزید یہ کہ گھر میں امارات کی بھی کوئی جھلک نہ تھی۔ چنانچہ یہ دو متضاد حالات تھے جن سے مجھے گزرنا پڑا لیکن اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ میں ملا بنا نہ مسٹر بلکہ میانہ روی اختیار کرتے ہوئے وہ بنا جو آج سب کے سامنے ہوں۔

ارژنگ: یہ جو آپ نے کہا کہ آپ کا حلقہ احباب ماڈل ٹاؤن کے آزاد خیال نوجوانوں پر مشتمل تھا تو یہ بتائیے کہ ان میں کون لوگ شامل تھے اور ان دنوں آپ کی کیا مصروفیات رہتی تھیں؟

عطاء الحق قاسمی: جی میرا تمام دوست طبقہ امراء سے تعلق رکھتا تھا جو بڑے آزاد خیال لوگ تھے اور انہی کے ساتھ میرا تمام وقت گزرتا تھا۔ ایک بات جو بہت اہم ہے وہ میں بتاتا چلوں گا کہ اگرچہ میرے تمام دوست بہت متمول گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن میری تربیت میں ہمارے خاندان کی علمی و دینی خدمات نے وہ فخر و غرور پیدا کر دیا تھا کہ اس افتخار نے کبھی بھی مجھے مادی آسائشوں سے مرعوب نہیں ہونے دیا۔ میں اپنے امیر دوستوں کے ساتھ رہتے ہوئے کبھی بھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا اور اس کے باعث میری شخصیت کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچی۔ ان لوگوں کی کوٹھیاں، زرق برق لباس، کاریں اور دولت کی ریل پیل میرے لیے قطعی غیر اہم تھی۔ اگر میرے اندر یہ افتخار نہ ہوتا تو میری شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی۔ دوسری طرف میرے دوست بھی بہت اچھے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے میری مالی کم مائیگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ بھی جانتے تھے کہ یہ ایک غیور شخص ہے اس لیے ان کا طرزِ عمل بھی ہمیشہ مثبت رہا۔ ان دوستوں کے ساتھ گزرا ہوا وقت آج بھی سہانے خواب کی

طرح یاد آتا ہے۔ ان دنوں ہم لوگ سارا دن گھومتے پھرتے تھے۔ سیر سپاٹے کرتے اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ کبھی موڈ آتا تو مری نکل جاتے۔ کبھی پشاور چلے جاتے۔ اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ جب میں نے میٹرک کیا تو والد محترم نے کہا کہ وہ مجھے دینی تعلیم کے لیے جامعہ اشرفیہ میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ میں تو ایسا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ آپ کا خیال بہت اچھا ہے۔ میں خود بھی دینی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن میٹرک کے بعد اس کا وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا جو آپ چاہتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ پہلے بی اے کرلوں ورنہ تو ملاؤں میں ایک اور ملا کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح بڑی مشکل سے میں نے والد صاحب کو راضی کیا وہ مجھے بی اے کر لینے دیں۔ جب میں نے بی اے کرلیا تو انہوں نے کہا کہ چلو جامعہ اشرفیہ۔ اب میں نے جامعہ اشرفیہ کا ماحول دیکھا ہوا تھا۔ وہاں لڑکوں نے ٹنڈیں کرائی ہوئی اور ٹخنوں سے اُونچے پاجامے پہنے، پاؤں سے ننگے برے حالوں میں پھرتے تھے۔ میرے ذہن میں اس طرح کا نقش ثبت ہوا تھا کہ میں وہاں جانے سے خوفزدہ تھا۔ اب کی بار والد صاحب کو منانا بہت مشکل تھا اس لیے میں نے والدہ ماجدہ کی امداد بطور کمک حاصل کی۔ انہوں نے کہا کہ چلو تم ایم اے کرلو لیکن ایم اے کے بعد میں نے ضرور تمہیں وہاں داخل کرانا ہے۔ جب میں نے ایم اے کرلیا تو والد صاحب نے کہا کہ ایم اے کرنے کے بعد اب تمہارا جامعہ اشرفیہ جانا کچھ زیادہ مناسب نہیں اس لیے میں تمہیں مدینہ یونیورسٹی میں داخل کرا دیتا ہوں۔ اب چونکہ میں کسی حد تک خود مختار ہو گیا تھا اس لیے میں وہاں بھی نہ گیا۔

ارژنگ: گویا آپ دینی تعلیم سے دور بھاگتے رہے؟

عطاء الحق قاسمی: ایسی بات بھی نہیں۔ جہاں تک دینی تعلیم کا تعلق ہے تو آپ اس وقت بھی میری سٹڈی دیکھ رہے ہیں کہ اس میں کتنی زیادہ کتابیں ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میرے والد ماجد کے ذخیرہ کتب میں اس سے بھی زیادہ کتابیں تھیں اور ہر کتاب نہایت ہی اعلیٰ اور قیمتی اور دُنیا کے تمام مذاہب پر۔ میں نے آٹھویں جماعت سے ہی انکی لائبریری میں مطالعہ شروع کر دیا تھا اور اس وقت تک میں گویا ان کی پوری لائبریری گھول کر پی چکا تھا۔ چنانچہ

جہاں تک دینی علم اور معلومات کا تعلق تھا وہ مجھے خاصی حد تک حاصل تھی۔ اس کے علاوہ والد صاحب نے قرآن پاک کی تفسیر مجھے پڑھانا شروع کی تھی لیکن افسوس کہ میں نے چند پارے ہی پڑھے لیکن ان کا طریقہ تعلیم اس قدر آسان اور دلکش تھا کہ آج بھی قرآن پاک کی کوئی آیت پڑھیں تو اس کی تفسیر نہ ہی سہی لیکن بڑی حد تک اس کا مفہوم میں آپ کو بتا سکتا ہوں لیکن میں ذرا ترجمہ کی مدد لے لوں تو بہت اچھی طرح اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔

ارژنگ: ابھی آپ نے کہا کہ آپ نے والد صاحب کی پوری لائبریری پڑھ ڈالی تھی۔ جس میں تمام مذاہب پر کتب موجود تھیں تو یہ بتایئے کہ مذاہب کے تقابلی جائزے میں آپ نے کیا محسوس کیا یا اس مطالعے سے مختلف مذاہب عالم سے کیا اخذ کیا؟

عطاء الحق قاسمی: جی اس میں ہندومت کی کتب بھی میں نے پڑھیں۔ انجیل کے مختلف Vesion بھی میں نے پڑھے۔ اسلام کے مختلف مکاتب فکر کی کتب بھی پڑھنے کا موقع ملا جس میں غلام احمد پرویز، مولانا مودودی اور عبداللہ چکڑالوی جیسے علماء بھی شامل تھے تو ادیان کے مطالعے سے جس نتیجے پر پہنچا وہ ایک مثبت نتیجہ ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ تمام مذاہب کی روح ایک ہی ہے اور سب کا بنیادی تصور بھی ایک ہی ہے کہ آپ جو فصل بوئیں گے وہی کاٹیں گے۔ اس کے علاوہ خدا کا تصور بھی تمام مذاہب میں موجود ہے۔ حتیٰ کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ جو ہم ہندوؤں کو کہتے ہیں کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو ٹھیک ہے وہ واقعی بتوں کی پوجا کرتے ہیں لیکن حتمی طور پر وہ خدا ہی کو مانتے ہیں یعنی بھگوان کو اور اس کی پوجا کرتے ہیں اور مورتی کے بارے میں ان کا نظریہ ہے کہ انہوں نے خدا ہی کی ایک تجسیمی شکل بنائی ہے تا کہ عبادت میں ارتکاز رہے۔ بنیادی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ دُنیا کے تمام مذاہب خیر کی طرف ہی لوگوں کو بلاتے ہیں۔ مختلف راستے ضرور ہیں لیکن منزل ایک ہی ہے۔

ارژنگ: اب اس وسیع مطالعے کے بعد آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ مذہب اور فلسفے میں کیا تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے کو کہاں تک برداشت کرتے ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: میں نہیں سمجھتا کہ مذاہب، فلسفے اور سائنس کا آپس میں کوئی جوڑ یا مماثلت

ہے۔ یہ جوڑ لگانا سہی نہیں۔ میں تو اس بات کے بھی بہت خلاف ہوں کہ لوگ قرآن مجید میں سے آج کے مادی علوم تلاش کرتے ہیں۔ سائنسی تھیوریوں کا سراغ لگاتے ہیں۔ ایٹم بم کا فارمولا قرآن میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ قرآن حکیم سائنس کی کتاب ہے نہ فلسفے کی۔ یہ تو آپ کے اندر کی دنیا آباد کرتا ہے۔ آپ کے اندر روشنی پیدا کرتے ہیں۔ دیکھیں نا! سائنس کی تھیوریاں اور نظریات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ آج آپ قرآن سے ایک چیز نکال لیتے ہیں کل کو وہ سائنسی نظریہ غلط ثابت ہو جاتا ہے تو کیا نعوذ باللہ قرآن کو غلط ثابت کریں یا اس میں ترمیم کریں گے۔ قرآن مذہبی کتاب ہے اور اس کو وہی رہنے دیں جو یہ ہے۔ ایک اور ظلم ہمارے ہاں ہوتا ہے اور وہ ہے طب نبویؐ کے نام پر۔ یہ بتائیں کہ آنحضورؐ کی بتائی ہوئی کوئی دوا اگر کسی مریض کو دی جائے اور اس کو افاقہ نہ ہو تو کیا یہ اچھی بات ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس سے شفا ہو جاتی ہے تو کیا یہ عمل آنحضورؐ کے مرتبے میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ انہیں کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ نعوذ باللہ آپ انہیں حکمت کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے جو باتیں اپنے بڑے بوڑھوں سے سنیں کہ فلاں چیز کھانی چاہیے اور فلاں نہیں جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے وہی انہوں نے لوگوں کو بتائیں۔ دوسری بات یہ کہ وہاں عرب میں دو تین چیزیں ہی زیادہ ہوتی تھیں مثلاً کھجور، زیتون اور انجیر وغیرہ انہی میں سے ہر مرض کا علاج تلاش کیا جاتا تھا اور بڑے بوڑھے یہی چیزیں کھانے کو کہتے تھے۔ سو یہی بات وہاں تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہاں ایک ڈاکٹر صاحب ہیں وہ طب نبویؐ کے نام پر ذیابیطس کے مریضوں کو کھجوریں کھلا رہے ہیں چاہے مریضوں کا شوگر لیول کنٹرول سے باہر ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مذہب کی Exploition ہے اور کچھ بھی نہیں۔

ارژنگ: قاسمی صاحب! وہ بات درمیان میں ہی رہ گئی کہ آپ کے ماڈل ٹاؤن والے دوست کون تھے اور اب یہ کہاں ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: یہ بڑی دلچسپ بات ہے اور اتفاق ایسا بنا کہ ان سب دوستوں کا یہ پروگرام بن گیا کہ امریکا جایا جائے۔ ان سب کے پاس تو وسائل تھے اس لیے انہوں نے

مجھے کہا کہ تم بھی چلو۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں بھی چلتا ہوں۔ یہ لوگ ایک ایک کر کے امریکا چلے گئے۔ اس زمانے میں ویزہ بھی آسانی سے مل جاتا تھا۔ یہ بات ہے 60 کے عشرے کی۔ اب پیچھے میں اکیلا رہ گیا۔ میں اباجی کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ مان ہی نہیں رہے تھے۔ کیونکہ ان کو مجھ سے بے پناہ محبت تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنی محبت شاید ہی کسی کو ہوگی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آٹھویں جماعت تک وہ مجھے خود نہلاتے تھے۔ چنانچہ وہ مجھے جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ مجھے بھی ان سے بہت محبت تھی لیکن میں امریکہ بھی جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کی اس محبت کو Exploit کیا اور بالآخر ان کو قائل کر ہی لیا۔ اب پیسوں کا مسئلہ تھا۔ ہمارے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ میرے پاس ایک 50cc موٹر سائیکل تھی۔ وہ موٹر سائیکل 1500 روپے میں اپنے دوست چوہدری صفدر کو بیچی۔ اس طرح میں نے کچھ رقم ادھار لی۔ کچھ پیسے والد صاحب سے لیے اور کسی نہ کسی طرح سات ہزار روپے جمع کر لیے اور امریکہ کے لیے بائی روڈ چل پڑا۔ لاہور سے بائی روڈ پشاور، پشاور سے پی آئی اے کے ذریعے کابل اور کابل سے یورپ تک بائی روڈ۔ یہ میرا بہت دلچسپ سفر تھا جو میں نے اپنے سفرنامہ ''شوقِ آوارگی'' میں بیان کیا۔ یورپ سے بائی ایئر میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں میرے یہ سارے دوست تھے جو یہاں سے گئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی وہاں کام کیے تھے جو یہاں سے امریکہ جانے والے لوگ شروع میں کرتے ہیں۔ اتنی چھوٹی موٹی ملازمتیں حالانکہ یہ لوگ اچھے خاصے امیر گھرانوں کے تھے۔ میں نے بھی چھوٹی موٹی ملازمتوں سے آغاز کیا اور سال ڈیڑھ سال میں ایک اچھی جگہ ملازمت حاصل کر لی۔ یہ 1970ء کی بات ہے۔ وہاں ایک ہوٹل تھا Ramad Inn مجھے اس ہوٹل میں فوڈ اینڈ بیوریج منیجر کی ملازمت مل گئی۔ یہ ایک وائٹ کالر ملازمت تھی جس کے پیسے بھی معقول ملتے تھے لیکن صورت حال یہ ہوئی کہ ادھر سے مجھے والد محترم کے خط آتے رہتے تھے کہ واپس آؤ۔ میں ان کے خط کئی کئی روز نہیں کھولتا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے کیا لکھا ہوگا اور خط پڑھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال ایک روز میں نے فیصلہ کر لیا مجھے اس معاشرے میں نہیں رہنا۔ میرے دوستوں نے مجھے منع کیا لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا۔

اس لیے میں نے ٹکٹ کٹائی اور یورپ تک بائی ایئر آیا اور یورپ سے بائی روڈ پاکستان۔ میں بغیر اطلاع کیے اپنے گھر پہنچا اور جب ابا جی نے اچانک مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر آنے والی خوشی کی لہر میری زندگی کا حاصل ہے۔ اس طرح میں تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال بعد واپس گھر آ گیا۔ آپ نے دوستوں کا پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں کہ وہ سب مختلف عادات اور کردار کے لوگ تھے۔ وہ سب دوست وہیں رہ گئے۔ ان میں سے صرف دو ایسے تھے جو بہت عرصہ بعد واپس آئے۔ ایک منیر احمد شاہ تھے ان کا پس منظر بھی بہت مذہبی تھا۔ اس نے وہاں ایک لڑکی سے شادی کی جو نسلاً ڈچ تھی اور نام تھا اس کا ''خرید''۔ اس سے ایک بیٹا بھی ہے ان کا۔ یہ کوئی سولہ سترہ برس وہاں گزار کر واپس آیا تھا۔ آج کل لاہور ہی میں ہے اور اپنا بزنس کر رہا ہے۔ یہ دوست ایچی سن کالج سے پڑھا ہوا ہے۔ دوسرا دوست جو واپس آیا وہ ہے مسعود علی خان۔ یہ میرا سب سے عزیز دوست ہے۔ ان میں سے ایک سب سے دلچسپ دوست تھا۔ اس کی زندگی کی بجائے خود ایک افسانہ ہے۔ اس کا نام خالدی تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور یہ لوگ ماڈل ٹاؤن کے اے بلاک میں رہائش پذیر تھے۔ اس کی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی اور والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بڑی وسیع کوٹھی میں وہ اور اس کے بوڑھے والد رہتے تھے۔ یہ اپنے والدین کا بڑا لاڈلا تھا۔ اس لاڈ پیار کی وجہ سے اس میں ذرا Abnormality سی آ گئی تھی۔ مثال کے طور پر اگر اس کا موڈ بنا کہ اس نے تصویریں بنانا ہیں تو وہ کئی کئی مہینوں تک تصویریں ہی بناتا چلا جاتا تھا۔ اگر کبھی دل چاہا کہ گلاس اُلٹا کر اس پر روحیں بلانا ہیں تو سارا دن اور ساری رات یہ ہی کام ہوتا رہا ہے۔ اگر کتابوں کا شوق چڑھ آیا تو کئی کئی ماہ تک صرف مطالعہ ہی کرتا رہا ہے۔ اس حد تک کہ باتھ روم میں بھی مطالعہ کے لیے کتاب ساتھ لے جاتا تھا۔ بجلی چلی جائے تو موم بتی جلا کر مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ یہ دوست بھی وہیں تھا۔ میں نے امریکہ پہنچ کر سب سے پہلے خالدی کا پوچھا تو دوستوں نے بتایا کہ وہ بھی یہیں ہے اور اس نے شادی کر لی ہے ایک امریکی لڑکی کے ساتھ۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے ملواؤ تو میرا دوست مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ جب ہم اس کے فلیٹ پر پہنچے تو کال بیل دی لیکن جواب ندارد۔ البتہ اندر سے

کچھ چیزیں وغیرہ گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر بیل دی لیکن کوئی نہ آیا البتہ آوازیں آتی رہیں۔ کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا تو خالدی سامنے کھڑا تھا لیکن بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ۔ اتنے عرصے بعد مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔ اتنے میں اندر سے ایک بیلن اُڑتا ہوا نظر آیا اور اس کے سر پر لگا۔ اس نے پھر دروازہ بند کر لیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس کا اپنی بیوی سے جھگڑا چل رہا ہے۔ میرے دوسرے دوست نے کہا کہ میں اس لیے آنا نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری وجہ سے آنا پڑا ہے۔ یہ تماشا تو روز ہوتا ہے۔ خیر اگلے دن خالدی کا فون آیا اور اس نے کہا کہ تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ چنانچہ وہ آیا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ وہ مجھے بالکل اسی طرح ملا جس طرح ہم لاہور میں تھے۔ اسی پیار اور محبت کے ساتھ۔ اس کی بیوی بار بار پرس سے آئینہ نکالتی اور کہتی Khalid! How I look likes? وہ بھی فوراً جواب دیتا Honey! You are pretty تھوڑی دیر بعد وہ پھر آئینہ دیکھ کر پوچھتی Tell me, How I look like! وہ پھر کہتا You are pretty. I love you کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ مجھے ساتھ لے کر ایک ڈرائیون سینما میں لے گئے۔ وہاں میں فلم دیکھتا رہا ان دونوں کے درمیان یہ ہی چلتا رہا کہ How I look like? وہ پھر کہتا You are pretty. You are lovely میں بھی صرف سکرین پر تصویریں دیکھتا رہا لیکن میرے کانوں میں آوازیں صرف یہ ہی آ رہی تھیں۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لڑکی ابنارمل ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی زیادہ ابنارمل ہوگئی۔ چنانچہ خالدی نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور دوسری شادی کر لی۔ وہاں بھی کوئی مسئلہ پیدا ہوگیا اور شادی ناکام ہوگئی۔ پھر اس نے تیسری شادی کی ایک چینی لڑکی کے ساتھ۔ وہ لڑکی اسے ساتھ لے کر ہانگ کانگ آ گئی۔ جب میں تھائی لینڈ میں سفیر تھا تو ایک روز ہمارے ایک مشترکہ دوست مالک کا امریکہ سے فون آیا۔ اس نے بتایا کہ خالدی کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیسے تو اس نے بتایا کہ پہلے اس کو فالج ہوا۔ ایک روز پہلے اس کی بیوی اس کے کمرے میں گئی تو اس کا سر کمپیوٹر ٹیبل پر لٹکا ہوا تھا اور روح پرواز کر چکی تھی۔ مجھے سخت صدمہ ہوا۔ یہ میرے ان دوستوں میں سے تھا جن کے ساتھ ہم نے بہت

اچھا وقت گزارا تھا اور میں اسے کبھی بھول نہیں سکتا۔

ارژنگ: آپ نے اورینٹل کالج سے ایم اے کیا۔ یہ کب کی بات ہے؟

عطاء الحق قاسمی: میں نے داخلہ لیا تھا 1964ء میں اور دو سال بعد ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

ارژنگ: ان دنوں آپ کے اساتذہ کون تھے اور اس وقت میں اور آج کے حالات میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: ان دنوں جب لوگ ایم اے اُردو کرتے تھے۔ وہ واقعی ایم اے کرتے تھے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی اور مضمون میں داخلہ نہیں ملا تو اُردو میں داخلہ لے لیا۔ ان لوگوں کا مقصد واقعی اُردو میں ایم اے کرنا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں جس اُستاد نے مجھے نہایت متاثر کیا اور میں سمجھتا تھا ان جیسا اُستاد شاید اور کوئی نہیں ان کا نام تھا ڈاکٹر سیّد عبداللہ۔ وہ ایک گھنٹے کا لیکچر دیتے تھے اور لان میں ٹینٹ لگا کر سو ڈیڑھ سو لڑکے لڑکیاں ان کا لیکچر سنتے تھے۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج میں کلاس رومز میں بھی پردہ لگا ہوتا تھا اور لڑکے ایک طرف اور لڑکیاں بیٹھتے تھے اور آپس میں بات کرنے کی سخت پابندی ہوتی تھی۔ ہمارے ایک اُستاد تھے جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا وہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھے لیکن اُنہیں اپنی عمر کم کرنے شوق تھا۔ چنانچہ وہ کلاس میں لڑکیوں کے سامنے کسی لڑکے کو ڈانٹتے تو کہا کرتے شرم کرو یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ حالانکہ یہ لڑکیاں عمر میں ان کی پوتیوں کے برابر تھیں لیکن وہ انہیں بہنیں ہی کہا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کسی کو یہی کہا کہ یہاں میری بہنیں بیٹھی ہوئی ہیں تو پچھلے بنچوں سے کسی لڑکے نے کہا ''سر! اگر آپ کی بہنیں ہیں تو ہماری تو پھوپھیاں ہوئیں۔'' اس بات پر زبردست قہقہہ پڑا۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے یہ کہنا چھوڑ دیا۔ ان کے علاوہ میرے اساتذہ میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار شامل تھے۔ یہ سب بہت قابل شخصیات ہیں۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے علاوہ ایک اور اُستاد جس نے مجھے متاثر کیا وہ تھے سیّد وقار عظیم۔ وہ واقعی ایک عظیم آدمی تھے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ تدریس ایک بڑا فن ہے۔ اس فن پر سیّد عبداللہ اور سیّد وقار عظیم کو

جو دسترس حاصل تھی۔ وہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ ان کا کمال یہ تھا کہ وہ مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق مضمون کو بھی نہایت آسان زبان میں بیان کر دیتے تھے اور ہم لوگ جو اس وقت طالب علم تھے ان کی یہ باتیں بہت آسانی سے سمجھ آ جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ ہمارے ایک اور اُستاد بھی تھے جن کا کمال یہ تھا کہ وہ آسان ترین مضمون کو بھی مشکل ترین انداز اور زبان میں بیان کر دیتے تھے۔ ان کا نام لینا اب مناسب نہیں۔ خواجہ ذکریا صاحب سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میں ان کا شاگرد ہی نہیں دوست بھی ہوں۔

ارژنگ: آپ نے صحافت کا آغاز سفر امریکا کے بعد کیا؟

عطاء الحق قاسمی: جی نہیں۔ میں امریکا جانے سے قبل بلکہ اپنے دور طالب علمی ہی میں نوائے وقت میں کام کر چکا تھا۔ ان دنوں میں تعلیمی صفحہ کیا کرتا تھا۔ 1967ء میں میں نے نوائے وقت میں بحیثیت سب ایڈیٹر ملازمت کر لی۔ اسی دوران میں نے پروفیسر کرامت حسین جعفری پرنسپل ایم اے او کالج کا انٹرویو کیا۔ دوران انٹرویو انہوں نے مجھ سے کہا کہ بیٹا تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟ میں نے کہا جی عطاء الحق قاسمی۔ انہوں نے کہا کہ بہاؤ الحق قاسمی تمہارے کیا لگتے ہیں؟ میں نے بتایا کہ وہ میرے والد ہیں۔ اس پر انہوں نے اُٹھ کر مجھے گلے سے لگایا اور کہا کہ تم تو میرے بھتیجے ہوئے۔ میں تمہارے والد کے ساتھ ایم اے او کالج امرتسر میں پڑھتا تھا۔ انہوں نے استفسار کیا کہ تم ''ایجوکیشن'' میں آنا چاہتے ہو یعنی ایم اے او کالج میں۔ مجھے شروع ہی سے تدریس سے لگاؤ تھا۔ میں نے کہا کہ آنا تو چاہتا ہوں لیکن میرا امریکا جانے کا پروگرام بن رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ واپسی کب ہوگی؟ تو میں نے جواب دیا کہ ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس پر وہ بولے اچھا جب بھی واپس آؤ گے تو یہاں تمہارے لیے سیٹ خالی ہوگی۔ اس سے آپ دیکھیں کہ کیسے کیسے شفیق اُستاد ہوا کرتے تھے ان دنوں۔ میں دو سال بعد واپس آیا تو واقعی انہوں نے میرے لیے سیٹ رکھی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں نے ایم اے او کالج سے وابستگی اختیار کر لی۔ ابھی تین ماہ پہلے میں ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے گیا تو مجھے ایک شکستہ حال قبر نظر

آئی جو مکمل طور پر زمین میں دھنس چکی تھی۔ میں نے کتبہ پڑھا تو اس پر لکھا تھا ''پروفیسر کرامت حسین جعفری'' میرے دل کو دھچکا لگا۔ ہمارے ملک کا اتنا بڑا نام جس کی تعلیم کے میدان میں بے شمار خدمات اور قبر اس حال میں۔ میں نے گورکن سے پوچھا کہ اس قبر پر کوئی نہیں آتا؟ اُس نے بتایا کہ کبھی کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ چنانچہ میں نے اپنے محسن کی قبر کو دوبارہ درست کرایا۔ اب یہ قبر بڑی اچھی حالت میں ہے۔ جعفری صاحب کا احسان میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔

ارژنگ: آپ نے ایم اے او کالج کب جوائن کیا اور پھر وہی بات کہ اس وقت کے اور آج کے ایم اے او کالج میں کیا فرق ہے؟

عطاء الحق قاسمی: میں ایم اے او کالج سے وابستہ ہوا 1971ء کے آخر میں۔ باقی فرق کوئی زیادہ نہیں پڑا۔ اس وقت لڑکوں کے نیفے میں چاقو ہوتے تھے اور اب پستول ہوتے ہیں۔ اب میں آپ کو دو باتیں بتاتا ہوں۔ ان سے آپ اندازہ لگائیں۔ ایک مذاق کی بات ہے اور دوسری سنجیدہ۔ ایک مرتبہ مجھے اعجاز بٹالوی صاحب کا رُقعہ ملا۔ انہوں نے ایک لڑکے کے داخلے کی سفارش کی تھی۔ ان کا یہ رقعہ بڑا دلچسپ تھا۔ اُنہوں نے لکھا تھا ''قاسمی صاحب! حامل رُقعہ ہذا کا خیال ہے کہ انسان کو علم ضرور حاصل کرنا چاہیے خواہ اس کے لیے ایم اے او کالج ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ تو ہو گئی مذاق کی بات لیکن اس سے قطع نظر ایم اے او کالج کی تعلیم کے میدان میں بہت خدمات ہیں۔ اس کالج نے تھرڈ ڈویژن حاصل کرنے والے ان طالب علموں کو اپنے دامن میں جگہ دی جن کو اور کوئی کالج قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان میں سے بہت سے لڑکے ایسے ہیں جنہوں نے آگے چل کر اپنا اور کالج کا نام روشن کیا۔ جہاں تک ایم اے او کالج کے نتائج کا تعلق ہے تو میں نے ایک بار کہا کہ ایک بار گورنمنٹ کالج کے طلباء کو یہاں بھیج دیں اور یہاں کے طلباء کو وہاں بھیج کر نتائج کا موازنہ کریں تو پتہ چل جائے گا کہ کون سا کالج بہتر ہے۔ ہمارا تعلیمی عملہ بہت اچھا ہے لیکن ہم نے ہمیشہ کم نمبروں والے طلباء کو داخلہ دیا۔ اصل میں کالج میں یہ خرابی ہے کہ اس کا محل وقوع بہت غلط ہے۔ یہ کالج عین اس سڑک پر واقع ہے جو سیکرٹریٹ کو جاتی ہے۔ لڑکا کلاس روم

سے باہر قدم رکھتا ہے تو روڈ پر ہوتا ہے۔ کلاس رومز بالکل سڑک کے ساتھ ہیں۔ جب میں وہاں پڑھتا تھا تو ٹریفک کے شور کے باعث پڑھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہاں یہی صورت حال ہے۔

ارژنگ: آپ نے ایم اے او کالج کب چھوڑا بحیثیت اُستاد؟

عطاء الحق قاسمی: ناروے سے واپسی پر میری ٹرانسفر ایف سی کالج ہوئی تو میرا اور ایم اے او کالج کا ساتھ ختم ہوا ہے۔ سفارت کے دوران میں ڈیپوٹیشن پر تھا۔ اس کے علاوہ میں نے تدریس چھوڑی نہ نوائے وقت چھوڑا۔ یہ دونوں میری زندگی کے بڑے Passion ہیں۔

ارژنگ: ذکاہی تحریر کا عنصر تو آپ کو وراثت میں ملا ہے لیکن ڈرامہ نگاری کی طرف آپ کیسے مائل ہوئے؟

عطاء الحق قاسمی: دیکھئے دو چیزیں اہم ہوتی ہیں انسان میں۔ ایک تو وہ جو جینز میں آئے اور دوسری جو ماحول سے ملے۔ علم تو میری جینز میں تھا ہی۔ اس سے تو مفر ممکن ہی نہیں۔ دوسرا ہے ماحول۔ ہمارے گھر کا ماحول بھی اسی قسم کا تھا مثلاً ابا جی جب بھی شہر سے باہر جاتے تو پوچھتے کہ تمہارے لیے کیا لاؤں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا شوق ہوتا ہے جو اس کے فطری رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ میرا فطری رجحان شعر و ادب کی طرف ہی تھا۔ اس لیے میں ان سے کہا کرتا تھا کہ وہ میرے لیے کہانیوں کی کتابیں لائیں۔ ایک چیز تو تھی یہ اور دوسری بات یہ کہ میں نے آٹھویں جماعت ہی سے ادب میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس کے علاوہ بھی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ میں بیٹھے بیٹھے میز یا کسی اور چیز پر طبلہ بجایا کرتا تھا۔ گویا ردھم سے آشنائی تھی۔ یہ بھی شاعری سے لگاؤ کا اظہار تھا۔ چنانچہ میں سکول کے بینڈ میں ڈرم بجایا کرتا تھا۔ جب ابا جی کو یہ بات پتہ چلی تو مجھے بینڈ چھوڑنا پڑا۔ ویسے اب بھی میں میوزک کی کوئی بیٹ بجا لیتا ہوں۔ یہ چیزیں فطرتاً میرے مزاج کا حصہ ہیں۔ سکول میں ناصر زیدی میرا کلاس فیلو تھا اور ہمارے فارسی کے اُستاد تھے مسٹر اختر حسین تاباں۔ وہ ہمیں مخاطب کر کے کہا کرتے تھے ''لکھ لو میری بات یہ ریوڑیاں بیچا کرو گے تم لوگ۔ کرو گے کچھ نہیں کیونکہ تم

لوگوں کے لچھن ہی ایسے ہیں۔'' صد افسوس! کہ اُستاد محترم کی یہ بات سچ ثابت نہ ہوئی۔ ورنہ لچھن ہمارے ایسے ہی تھے۔ سکول اور کالج میں دلچسپ بات یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ حصہ نثر کا ہے۔ جب کہ اس کا آغاز میں نے شاعری سے کیا تھا اور شاعری بھی مزاحیہ۔ گویا مزاح میری ادب دوستی کی بنیاد ہے۔ ویسے ایک سخت دینی گھرانے کا فرد ہونے کے ناتے یہ بات میرے لیے بھی حیران کن ہے لیکن یہ ایک فطری رجحان ہے۔ کالج کے زمانے میں بھی میں نے دوستوں کی ہجو لکھی۔ میرا پہلا کالم جو ہفت روزہ شہاب میں چھپا میں نے فرسٹ ایئر میں لکھا تھا۔ ایم اے تک میں ہجو یہ شاعری کرتا رہا۔ ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی لیکن ذرا کم۔ بعد میں میری شاعری سنجیدہ ہوتی گئی اور نثر کا رجحان بڑھتا گیا۔

ارژنگ: پاک ٹی ہاؤس نصف صدی سے زائد عرصے سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک کا کام دے رہا ہے۔ کیا آپ کا بھی اس سے کوئی تعلق رہا ہے؟

عطاء الحق قاسمی: جی ہاں میں بہت عرصے تک ٹی ہاؤس جاتا رہا ہوں۔ بعد میں بھٹو صاحب کے دور میں ٹی ہاؤس دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں اور دانشوروں میں بھی وہ تحمل اور بات کہنے اور سننے کا وہ حوصلہ اور برداشت نہیں رہی جو ان میں ہونی چاہیے تھی۔ جب میں وہاں جایا کرتا تھا تو بڑے لوگ وہاں آیا کرتے تھے جن میں انجم رومانی، شہرت بخاری، انتظار حسین اور اعجاز بٹالوی جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمیں بھی بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا لیکن ایک بات میں بہت شدت سے محسوس کرتا تھا کہ جو گفتگو میں حلقہ ارباب ذوق میں ایک سال قبل سنتا رہا تھا وہی ایک سال بعد بھی ہو رہی تھی۔ بعد میں حلقے بھی دو بن گئے ایک ادبی اور ایک سیاسی۔ ادبی کہتے تھے کہ ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور سیاسی کہتے تھے کہ سیاست ہی سب کچھ ہے۔ میرے نزدیک دونوں ہی غلطی پر تھے کہ ان دونوں کو ایک ہی توازن میں ہونا چاہیے۔ ادب اور سیاست الگ نہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہیں۔ چنانچہ 77ء کے بعد جانا کم ہو گیا۔

ارژنگ: ہمارے ہاں ادبی گروہ بندی میں بھی دو گروپ ہیں یعنی قاسمی گروپ اور وزیر آغا گروپ آپ ان میں سے کس سے متاثر ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: دیکھیں بظاہر تو بات کسی اور طرح لگتی ہے لیکن اندر سے ٹٹولیں تو ممکن ہے کہ وہ آدمی اس طرح کا نہ ہو جس طرح کا وہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نہیں سمجھتا کہ میں کبھی غیر نظریاتی گروہ کا حصہ بنا ہوں۔ میری بڑی عجیب طرح کی گروہ بندی ہے یعنی میں بیک وقت احمد ندیم قاسمی جو ترقی پسند ہیں اور صحافت میں جناب مجید نظامی جو ایک دوسرے دھارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجیب الرحمٰن شامی جو اپنا ایک الگ اندازِ فکر رکھتے ہیں۔ نعیم صدیقی جو جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، سے تعلق رکھتا ہوں اور میرا واحد نقطہ جو میرے پیش نظر رہا ہے وہ ہے پاکستان اور پاکستانیت۔ میرے نزدیک احمد ندیم قاسمی ایک اعلیٰ درجے کے روشن خیال، ترقی پسند اور پاکستان سے محبت رکھنے والے شخص ہیں۔ اسی طرح صحافت میں ان لوگوں سے متاثر ہوں جو پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں چاہے وہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے۔ میرے نزدیک دایاں بازو اور بایاں بازو بے معنی بات ہے۔ میرے سامنے دو ہی باتیں ہوتی ہیں Pro Pakistan یا Anti Pakistan میرا وزن ہمیشہ اس پلڑے میں ہوتا ہے جو Pro Pakistan ہے یا میں سمجھتا ہوں کہ وہ پاکستان کا حامی ہے، مخالف نہیں۔

ارژنگ: قاسمی صاحب! میرا سوال اپنی جگہ بدستور موجود ہے۔

عطاء الحق قاسمی: میں نے عرض کیا نا کہ میں ادبی گروہ بندی کو مانتا نہیں۔ اگر میں ایسی گروہ بندی میں شامل ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے علمی مرتبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دوں جو میں نے آج تک نہیں کیا۔ میں ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا ایک بلند مرتبہ نقاد ہیں اور بہت بڑے Scholar ہیں۔ البتہ بحیثیت مجموعی جس میں ترقی پسندی کے لیے ان کا جیل جانا، ان کا ایک بلند پایا شاعر ہونا، ایک بہت بڑا افسانہ نگار ہونا، امروز کا ایڈیٹر ہونا اور نئی نسلوں کے بہت سے لوگوں کو پروان چڑھایا ہے۔ اس لحاظ سے قاسمی صاحب کی شخصیت اتنی بڑی بن جاتی ہے کہ ان کا کسی سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

ارشِ نگ: آج کل شاعری میں کچھ نئے تجربات کیے جا رہے ہیں جیسے آزاد اور مکالماتی غزل وغیرہ آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟

عطاء الحق قاسمی: دیکھئے جو گروہ بند لوگ ہوتے ہیں وہ اس طرح کی آراء کو جو آپ علمی طور پر دیتے ہیں زندگی موت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ میں اس طرح کے بکھیڑوں میں نہیں پڑتا۔ اصل میں ہمارے ہاں اصل تحقیقی لوگ کم ہو گئے ہیں اور اپنے لکھے ہوئے لفظ کی پائیداری پر یقین نہیں۔ اس لیے یہ لوگ تاریخ ادب میں خود کو کسی نہ کسی حیثیت میں زندہ رکھنے کے لیے ایسے سہارے تلاش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ایسے علمی تجربات ہونے چاہئیں لیکن ان کو زندگی موت کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔

ارشِ نگ: آپ کے اسفار کا آغاز تو امریکہ کے سفر سے ہوا لیکن سفرنامہ نگاری کا آغاز کب ہوا؟

عطاء الحق قاسمی: اسی سفر امریکہ سے واپسی کے فوراً بعد سفرنامہ نگاری کا آغاز بھی ہو گیا۔ میں نے نوائے وقت میں پہلا سفرنامہ لکھنا شروع کیا لیکن دو چار قسطوں کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ اخبار اس کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اگرچہ ان دنوں لکھنے کی بھی بڑی آزادی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ اخبار کے لیے ایک بوجھل چیز ہے اس لیے اس کو بند کر دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے ایک بھرپور قسط لکھی اور احمد ندیم قاسمی کو دے آیا۔ اس وقت میرے ان سے کوئی مراسم نہیں تھے۔ اس بات سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کس طرح انہوں نے نئے لوگوں کو تیار کیا۔ یہ قسط دینے کے بعد میں بھول گیا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ جا کر ان سے پوچھتا دوست ذکر کرتے تو اُن سے پوچھتا کہ آپ نے کہاں پڑھا تو وہ بتاتے کہ قاسمی صاحب نے سنایا ہے۔ جب ان سے ملنے جاؤ وہ تمہارا سفرنامہ کھول کر بیٹھے ہوتے ہیں اور تمہارے جملے سنا سنا کر خود بھی محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتے ہیں۔ اس پر مجھے حوصلہ ہوا اور ان سے ملنے چلا گیا۔ وہ سراپا تحسین تھے۔ انہوں نے یہ سفرنامہ قسط وار فنون میں شائع کر دیا۔ میں بڑا سست آدمی ہوں۔ جب میں لکھنے سے تھک جاتا تو ان سے کہتا کہ اب بس کریں میں اور قسط نہیں دے سکتا تو وہ کہتے کہ اچھا اس بار فنون

شائع نہیں کریں گے۔ اسی سے اندازہ لگائیں کہ انہوں نے نئے لکھنے والوں کو کس طرح حوصلہ دیا اور ان کو نکھارا ہے۔ انہی دنوں مستنصر حسین تارڑ کا سفر نامہ ''نکلے تیری تلاش میں'' سیارہ ڈائجسٹ میں چھپ رہا تھا اور میرا شوق آوارگی فنون میں چھپ رہا تھا لیکن کتابی صورت میں یہ سفر نامہ بہت بعد میں آیا۔ اصل میں جب میں نے دیکھا کہ قاسمی کسی صورت بھی مجھے چھوڑنے والے نہیں اور میں لکھتے لکھتے تھک جاتا تھا اس لیے میں نے ان سے جھوٹ بولا کہ قاسمی صاحب اب تو صرف چند ابواب باقی ہیں۔ اگر میں نے یہ بھی فنون میں دے دیے تو پھر کتاب نہیں بکے گی۔ اس پر انہوں نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ اس کے بعد میں سات برس تک اسے نہ لکھ سکا۔ پھر یہ ہوا کہ جو سفر بعد میں کیے ان کے سفر نامے پہلے آ گئے اور جو سفر سب سے پہلے کیا تھا اس کا سفر نامہ بہت بعد میں آیا۔ ان سفر ناموں میں آسٹریلیا کا سفر ''دُنیا خوبصورت ہے'' یورپ کا ''گوروں کے دیس میں'' پھر بھارت کا ''دلی دور است'' وغیرہ آئے۔ ذاتی طور پر مجھے ''شوقِ آوارگی'' سب سے زیادہ پسند ہے۔

ارژنگ: گویا پہلے پیار کی طرح پہلا سفر ہی سب سے زیادہ پسند ہے؟

عطاء الحق قاسمی: بالکل یہ ہی بات ہے۔ میرا پہلا سفر نامہ پہلا پیار ہی تو ہے۔

ارژنگ: نثر نگاری میں آپ نے سفر نامہ لکھا۔ کالم نگاری کی۔ ڈرامہ نگاری میں نام کمایا لیکن کبھی افسانہ کی طرف توجہ نہیں دی۔ کیوں؟

عطاء الحق قاسمی: میں نے اپنا افسانہ کبھی کسی ادبی پرچہ میں نہیں چھپوایا لیکن ہوتا یہ آیا ہے کہ میرے بے شمار نقادوں نے میری توجہ اس طرف دلائی کہ تم بنیادی طور پر افسانہ نگار ہو۔ کیونکہ تمہارے بہت زیادہ کالم ایسے ہیں کہ جنہیں شارٹ سٹوریز یا افسانے شمار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً میرا ایک کالم ہے ''طوطے ہی طوطے'' پھر ایک اور کالم ہے ''الہ دین کے جن کا زوال'' یہ ایک ایسے کالم ہیں جنہیں لوگ افسانے کہتے ہیں لیکن میں انہیں کالم کہتا ہوں۔ چونکہ انہیں اخبار میں چھپنا ہوتا تھا اس لیے میں نے جو کچھ بھی لکھا ہوتا تھا اسے کالم کا عنوان دے کر بھجوا دیتا تھا۔ حالانکہ وہ کالم کے ذیل میں آتے تھے بلکہ خالص افسانے تھے۔ اسی طرح میرا ایک کالم چھپا ہے وہ درحقیقت دو سو فیصد افسانہ یعنی شارٹ سٹوری ہے۔ اس کا

نام ''شینڈ لیمپ'' یعنی فانوس۔ اگر میں اسے کبھی بھی ادبی پرچے میں بھیج دوں تو وہ افسانے کے طور پر چھاپ لے گا لیکن میں انہیں کالم کی جگہ چھپواتا ہوں تاکہ لاکھوں لوگ اسے پڑھیں۔ یہ تو ہوئی ایک بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نے چند افسانے لکھ رکھے ہوئے ہیں جو باقاعدہ طویل افسانے ہیں۔ میں نے ان کو رکھ چھوڑا ہے کہ کچھ عرصہ بعد ان کو دوبارہ دیکھوں گا۔ اگر پسند آئے تو ٹھیک ورنہ پھاڑ کر پھینک دوں گا۔

ارژنگ: صحافت میں کالم نگاری کے علاوہ آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: میں نے 67ء میں نوائے وقت میں کام شروع کیا۔ میں اس میں سب ایڈیٹر بھی رہا۔ اس کے علاوہ میں نے سنڈے میگزین میں فیچر بھی لکھے۔ جیسے ریاض بٹالوی صاحب ''مشرق'' میں فیچر لکھا کرتے تھے۔ اسی طرح میں ''نوائے وقت'' میں فیچر لکھتا تھا۔ انہی دنوں میں نے ایک بار ہیجڑوں پر ایک فیچر لکھا تھا جو بہت پسند کیا گیا تھا۔

ارژنگ: قاسمی صاحب! اب آتے ہیں آپ کے ایک اور مورچے کی طرف یعنی سفارت کی طرف۔ یہ بتائیے کہ آپ کب سے کب تک سفیر کے طور پر فرائض سرانجام دیتے رہے؟

عطاء الحق قاسمی: اس کا عرصہ بنتا ہے دو سال۔ 1997ء سے 1999 تک۔ جانے کی تاریخ تو ٹھیک سے یاد نہیں لیکن غالباً جون یا جولائی 97ء اور واپس آیا ہوں 28 اکتوبر 99ء کو۔

ارژنگ: کن کن ممالک میں؟

عطاء الحق قاسمی: پہلے ناروے اور پھر تھائی لینڈ۔ تقریباً دو سال ناروے میں اور پھر تین ماہ تھائی لینڈ میں۔

علیم ناصری

○ ادب برائے ادب بری چیز نہیں لیکن ادب برائے زندگی بڑی چیز ہے۔

○ میرے نزدیک غزل شاعر کے فکر وفن کا پیمانہ ہے۔

○ جولوگ اپنی روایت پر چلنے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ جدت کے نام سے غیروں کی نقالی کرتے پھرتے ہیں۔

علیم ناصری گزشتہ ۶۵ سالوں سے شعر کہہ رہے ہیں مگر نام ونمود سے بے نیاز ہیں۔ دور جوانی کا کلام،، حباب رقصاں،، نظم وغزل پر مشتمل ہے۔ ،قندیل محراب، ان کی اسلامی موضوعات پر مشتمل نظموں کا مجموعہ ہے۔ بانگ سرافیل، جہادیہ نظموں پر مشتمل ہے۔

نعتیہ مجموعہ ''طلع البدر علینا'' کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ شاعری میں ان کا بنیادی کام،، شاہنامہ بالاکوٹ، تحریک جہاد بالاکوٹ کی منظوم داستان ہے جو چار حصوں میں تقریباً ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے دو حصے شائع ہو چکے ہیں جبکہ دوسرے دو حصے زیر طبع ہیں۔ معروف شخصیتوں کی رحلت پر لکھی گئی نظموں کا مجموعہ متاع دیدہ ،بھی اشاعتی مراحل میں ہے۔ بچوں کے لئے نظموں کا مجموعہ،، سورج چاند ستارے، بھی شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں بے شمار تنقیدی مضامین اور ریڈیائی تقاریر ان کے قلم کا اثاثہ ہیں۔ نعت نگاری پر بھی نہایت عمدہ تنقیدی جائزہ تحریر کر چکے ہیں۔ زبان خامہ کی خامیاں، کے نام سے ایک کتاب زیر قلم ہے۔ ایک دور میں ادبی مجلّہ ماہنامہ، فانوس، ہفت روزہ، الاعتصام، کے مدیر رہے اور ادبی موضوعات اور ملک کی سیاسی صورت حال پر کئی ادارے

اور کتابوں پر جاندار تبصرے ان کے قلم سے نکل کر اہل علم وادب سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

چٹان: شاعری کی ابتداء کب ہوئی اور اس کے محرکات کیا تھے؟

علیم ناصری: مڈل سکول سے شاعری کا آغاز ہوا کوئی محرک نہیں، خداداد صلاحیت کے مطابق نظم وغزل کی مشق جاری رکھی۔ ہائی سکول میں علمی استعداد کے اضافے اور ذاتی شوق مطالعہ سے فن شعر پر گرفت پہلے سے مضبوط ہوتی گئی۔

چٹان: شاعری میں کس سے اصلاح لی؟

علیم ناصری: کسی سے نہیں، نہ ادب وشعر کا ماحول میسر آیا۔ فوج میں بھرتی ہو کر میدان جنگ دیکھا اور اپنی سی شاعری کرنے کی ترنگ ساتھ رہی۔ اوزان پر گرفت عطائے ایزدی تھی فوج سے واپسی کے بعد سول ملازمت کی۔ اسی دوران میں فنی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔ اساتذہ کے کلام اور مولانا ماہر القادری کے رسالے ،، فاران ،، میں تبصرہ کتب پڑھتے پڑھتے اپنی اصلاح بھی ہوتی رہی۔ شعور بھی عمر کے ساتھ بڑھتا رہا اور زبان وبیان کا مطالعہ بھی ہوتا رہا۔ تمام بڑے شعراء کو اپنا استاد سمجھتا ہوں البتہ مولانا ماہر القادری مرحوم کو غائبانہ اور بالواسطہ استاد کہا جا سکتا ہے۔

چٹان: آپ کا ذہنی رجحان کس صنف سخن کی طرف ہے؟

علیم ناصری: نظم کی طرف اب زیادہ تر نعت نگاری میں انہماک ہے۔

چٹان: کلام کی اس قدر تاخیر سے اشاعت کا سبب؟

علیم ناصری: کلام کی اشاعت کے فن سے نابلد رہا ہوں۔ نمود ونمائش سے پرہیز بھی اس کا سبب ہے نیز میں اپنے تئیں قابل ذکر شعراء میں بھی شمار نہیں کرتا۔

چٹان: بڑا شاعر ہونے کی خصوصیات کیا ہیں؟

علیم ناصری: وہی خصوصیات کہ کلام میں ندرت اور بلندی اور فکر ونظر میں وسعت ہو۔ بڑا شاعر وہی ہے جس کا کلام بڑا ہے۔

چٹان: اکثر کہا جاتا ہے کہ فلاں ادیب یا شاعر کی رحلت سے ادب میں خلا پیدا ہو گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اس سے ادب کا ارتقاء رک جاتا ہے؟

علیم ناصری: ہر مرنے والا اپنے وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ اس لئے خلا کی بات مشیت الٰہی کی شان میں گستاخی ہے۔ اہل قلم و اہل علم (جو رخصت ہو چکے)، سب اپنی اپنی صلاحیتوں اور اپنے اپنے حصے کا کام کر گئے ہیں۔

چٹان: نثر نگاری میں آپ کس سے متاثر ہیں؟

علیم ناصری: مولانا ابوالکلام سے متاثر ہوں اور بہت سے دوسرے اچھے ارباب قلم بھی موجود ہیں۔

چٹان: آپ زیادہ تر نظم لکھتے ہیں۔ غزل کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

علیم ناصری: غزل کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ایک غزل میں کئی نظمیں سمائی ہوئی ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک غزل شاعر کے فکر و فن کا پیمانہ ہے۔ غزل میں اس سے بڑی اور کیا خصوصیت ہوگی کہ اس میں نظم کے بیشتر مضامین سما جاتے ہیں۔ یہ شاعر کی تمام واردات قلب کے اظہار کا ذریعہ ہے۔

چٹان: آج کی غزل کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

علیم ناصری: بہ استثنائے چند آج کی غزل زیادہ تر غزل کے اصل معیار سے فروتر ہے۔ غزل کا خاص اسلوب ہے۔ الفاظ میں شائستگی، شستگی، لطافت اور جذبہ و فکر کی گہرائی غزل کے لازمی عناصر ہیں۔ ان خصوصیات کے بغیر غزل مکمل نہیں ہوتی۔

چٹان: آپ کے پسندیدہ شعراء؟

علیم ناصری: پسندیدگی پارٹی بازی اور پارٹی سازی کا نام ہے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔

چٹان: قیام پاکستان کے بعد آپ کن شعراء کو ادب کی اعلیٰ سطح پر سمجھتے ہیں؟

علیم ناصری: اصل بات یہ ہے کہ اقبال کی لے اتنی توانا اور ان کی شاعرانہ فکر اس قدر ہمہ گیر تھی کہ اس کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکا۔ تاہم قیام پاکستان کے بعد جن شعراء نے شاعری کو زندہ رکھا، ان مرحومین میں فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، احسان دانش، سیف الدین سیف، ناصر کاظمی۔ بعد میں شکیب جلالی کی جدید رنگ و آہنگ غزل نگاری اپنی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس طرح چند ایک نام اور ہیں۔ اردو غزل اور نظم میں ان شعراء کے مقام و مرتبہ سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اب احمد ندیم قاسمی ہیں۔ شعر ادب کی ہر

جہت میں ان کی بے پناہ خدمات ہیں۔اس طرح نعیم صدیقی کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہو ں جنہوں نے اپنی شاعری میں تحریکی فکر کو اجاگر کیا اور اقبال کے پیغام و مقصدیت کو اپنے طرز میں مزید نمایاں کیا۔ایسے ہی عبدالعزیز خالد اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔اساطیری ادب میں ان کے منظوم ڈرامے خاصے کی چیز ہیں۔غزل میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں اور نعت میں ان کے بہت سے مجموعے ان کی نعت گوئی کے مخصوص رنگ کے ترجمان ہیں۔ جدید غزل گوئی کو وسعت بخشنے والے شعراء میں منیر نیازی اور احمد فراز کا بھی اپنا اپنا اسلوب ہے۔اسی طرح افتخار عارف کی غزل اور نظم بھی اپنے عہد کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔بہر حال ہر ایک کا اپنا انداز ہے، اپنا نظریہ ہے۔نظریے سے اختلاف ہوسکتا ہے، شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ کرنا میرے نزدیک ادبی نالائقی ہے۔

چٹان: نئے لکھنے والوں پر اکثر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں مطالعے کا فقدان ہے۔کیا آپ بھی یہی سمجھتے ہیں؟

علیم ناصری: دیکھنا تو یہ ہے کہ مطالعہ کی جہت کیا ہے نئے لکھنے والے جو کچھ لکھ رہے ہیں اور جس صنف میں لکھ رہے ہیں، کیا اس پر عبور رکھتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ ایسا بہت ہی کم ہے ۔غزل کہنے والے غزل کے مزاج کو سمجھے بغیر لکھتے جارہے ہیں۔فن شعر سے نابلد حضرات غزل کیا، نظم بھی لکھتے ہیں تو نظم کی فنی ضروریات اور اس کی مجموعی خوبیوں سے ناآشنا ہیں۔ میرے خیال میں جس صنف سخن میں کوئی بھی لکھ رہا ہوں، اس کا بھرپور ادراک ہونا اس لیے ضروری ہے ورنہ بے اثر اور بے معنی تخلیقات کا عمل جاری رہے گا۔لوگ آہستہ آہستہ شعر و ادب سے جس قدر بددل ہو چکے ہیں، اس کو کار بے کاراں سمجھ کر یکسر نظر انداز کر دیں گے۔ اسی لئے نئے کیا، ہمارے بعض پرانے لکھنے والوں میں بھی مطالعے کا فقدان ہے۔وجہ وہی ہے کہ یار لوگ نام و نمود اور حصول زر کی دوڑ میں مصروف ہیں۔کمپاؤنڈروں نے ڈاکٹروں کی دکانیں کھول رکھی ہیں۔مروجہ نظام تعلیم کی اونچی ڈگریاں بھی خداداد شاعرانہ صلاحیتوں اور حصول فن شعر کے بغیر اچھی شاعری کی ضمانت نہیں ہوسکتیں۔

آج کا ہائیکو اور نثری نظم کے بعد آزاد غزل کا بہت چرچا ہے۔کیا یہ تجربہ کامیاب

رہے گا؟

علیم ناصری: جولوگ اپنی روایت پر چلنے کی اہلیت نہیں رکھتے وہ جدت کے نام سے غیروں کی نقالی کرتے پھرتے ہیں۔ یہ ہائیکو وغیرہ اسی دریوزہ گری کا شاخسانہ ہے۔ یہ ہمارے شعروادب کے مزاج کو بگاڑنے کی شرارتیں ہیں۔ لہو لگا کر شہید کہلانے کے داعی ہیں۔ آزادغزل کا تجربہ کرنے والے فنی اعتبار سے بانجھ پن کا شکار ہیں۔ ان کے تخلیقی فن کا عمل مکڑی کا وہ جالا ہے جو کسی جگہ زیادہ دیر تک نہیں رہتا۔ آخر کار صاف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بے آباد اور ویران مقامات میں اس کو جگہ ملتی رہتی ہے۔ اور صورت احوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں ویرانی کا عالم بڑھتا جارہا ہے۔

چٹان: شاید نثری شاعری بھی اسی ذیل میں آتی ہے؟

علیم ناصری: نثری شاعری تو ہمارے پرانے ادب میں مقفی اور مسجع عبارت آرائی کہلاتی تھی مگر اس کو نظم کوئی نہیں کہتا تھا۔ نثری نظم لکھنے والوں پر تو علامہ اقبال کی وہ نظم صادق آتی ہے جس میں شیر ایک خچر سے پوچھتا ہے کہ تو کون ہے اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا جواب یہ تھا کہ۔

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار، شاہی اصطبل کی آبرو

چٹان: زندگی میں کون سادور آپ کے لئے مشکل ترین دور تھا؟

علیم ناصری: ہر قسم کے مشکل دور برداشت کرتا آیا ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ الہیٰ ہم پر وہ مشکلات نہ ڈالنا جو برداشت سے باہر ہوں۔

چٹان: زندگی کا نصب العین؟

علیم ناصری: نصب العین یہی ہے کہ خود راہ راست پر رہوں اور دوسروں سے خیر طلب رہوں۔

چٹان: خواتین کی آزادی کے بارے میں آپ کا موقف؟

علیم ناصری: پاکستان میں خواتین کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں؟ بازاروں میں تو ہم عورتوں کو ہی، خریدار، دیکھتے ہیں اور بیاہ شادیوں کے تمام کاروبار عورتوں

کی ہی مرضی سے ہو رہے ہیں۔ عورت کی غلامی کا پراپیگنڈا مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ تاہم ہم اسلامی حوالے سے اس آزادی کے قائل نہیں جو یورپ نے عورتوں کو بخشی ہے۔

چٹان: پاکستان میں تنقید کے موجودہ معیار سے آپ مطمئن ہیں؟

علیم ناصری: پاکستان میں تنقید شخصیات سے تعلقات کے پیمانے پر ہوتی ہیں، ادب پر تو غالباً تنقید کا یہاں رواج ہی شروع نہیں ہوا۔ اس لئے اس پر اطمینان کیسے ہوگا؟ شاعری کا میدان ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اردو زبان ہی نہیں جانتے۔ اور فن شعر سے بھی نابلد ہیں۔ خود نعت گوئی میں لوگ قرآن و حدیث اور سیرت رسول ﷺ سے بالکل کورے ہیں۔ راستے گم ہیں اور صحرا میں بگٹٹ بھاگ رہے ہیں۔ (معذرت خواہ ہوں)

چٹان: نوجوانوں کی شاعری میں محسوسات کا عمل کس حد تک ہے؟

علیم ناصری: دونوں طرح کی شاعری چل رہی ہے۔ کچھ لوگ محسوسات کی شاعری کرتے ہیں مگر اکثریت انکی ہے جو قلم فرسائی میں قلم شکنی تک پہنچنے میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔

چٹان: اکیسویں صدی کا ادب کیسا ہونا چاہئے؟

علیم ناصری: میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ اکیسویں صدی کیا چیز ہے جس کے خوف سے ہم لوگ اتنے پریشان ہیں۔ کیا ۲۰۰۱ء کی یکم جنوری، نیا سورج، ڈھال کر لانے والی ہے؟ کیا ہم دسمبر ۲۰۰۰ء کی شام کو بولی جانے والی زبان اگلی صبح کو بھول چکے ہوں گے؟ یا اکیسویں صدی کوئی ایسا قلعہ ہے جو ہمارے سامنے نمودار ہونے والا ہے جس میں ہم اپنے موجودہ چہرے مہرے اور لباس کے ساتھ داخل ہونے سے روک دیئے جائیں گے۔ ہماری قوم جن قدروں کی حامل ہے، انہیں پر قائم رہے گی۔ ہمیں انگریز یا امریکن نہیں بن جانا، البتہ ٹیکنالوجی اپنے وسائل کے مطابق آگے بڑھتی رہے گی۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو ہم اپنی روایت سے ناتا نہیں توڑ سکتے۔ ہائیکو وغیرہ لکھ کر ہم جاپانی یا انگریز نہیں کہلا سکتے، نقال ہی رہیں گے۔ کیا ہم نے اپنی زبان کی شاعری میں غزل، نظم رباعی وغیرہ کے تمام امکانات کو پورا کر لیا ہے کہ دوسرے ممالک اور زبانوں کی شاعری میں مروج اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے؟ یا کیا جاپان والوں نے غزل یا رباعی کہنے کی کوشش

شروع کر دی ہے؟ ہر گز نہیں وہ لوگ بہروپئے بننا پسند نہیں کرتے اور نہ اپنی زبانوں کو بگاڑنے کا جرم کرتے ہیں، اکیسویں صدی اہل مغرب کے باپ کی جاگیر نہیں، پوری دنیا کے لئے ماہ سال کے اگلے دور کا نام ہے اور بس۔

چٹان: موجودہ ادب میں میڈیا کا کردار کیا ہے؟

علیم ناصری: میڈیا نے ادیبوں اور شاعروں کی گروپ بندی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ بونوں کو قد آور بنانے کے لئے میرے نزدیک میڈیا نہایت عمدہ ورکشاپ ہے

''نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی''

چٹان: کچھ ترقی پسند تحریک کے بارے میں کہنا چاہیں گے؟

علیم ناصری: ترقی پسند تحریک نے نظم میں جدید رجحانات پیدا کئے اور افسانہ اور ناول میں نچلے طبقے کے لوگوں کو بطور خاص موضوع بنایا لیکن دینی اور اخلاقی قدروں کو اس سے بہت نقصان پہنچا کیونکہ اس کا پراپیگنڈا اور اصل ماسکو پرستی تھی اور ان لوگوں کے تخلیقی کام میں فحش گوئی کے ساتھ فاحش گوئی بھی لازمی عنصر بن گئی تھی۔ یہ تحریک خود دم توڑ گئی مگر اس کے جراثیم آج کے ادب میں موجود ہیں۔

چٹان: حال ہی میں آپکا نعتیہ شعری مجموعہ، طلع البدر علینا، شائع ہوا ہے۔ آپ کے نزدیک آج کی نعتیہ شاعری کس معیار پر ہے؟

علیم ناصری: نعت گوئی مدح و ثنائے پیغمبر ﷺ ہے۔ اس کو کسی ترازو میں تولنے کی کوشش نہ فرمایئے۔ اس کا دوسروں کی نظروں میں معمولی شعر بھی میرے نزدیک عظیم الشان ہے۔ معیار کے پیمانوں کو نعت کے مقدس پیکر سے دور ہی رکھئے۔ اصل چیز تو سچا جذبہ ہے اور بالخصوص وہ عمل ہے جو ایک نعت گو کے فکر و عمل میں تضاد کا باعث نہ ہو۔

چٹان: ادب میں گروہ بندی کس حد تک جائز ہے۔؟

علیم ناصری: گروہ بندی ایک فطری امر ہے۔ آپ کسی کو اس کے نظریات سے علیحدگی پر مجبور نہیں کر سکتے۔ نظریاتی ہم آہنگی ہی گروہ بندی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان گروہوں میں کون درست ہے اور کون غلط::؟

چٹان: مزاحمتی ادب میں مثبت رویے، آپ کے نزدیک؟

علیم ناصری: مزاحمتی ادب بھی ایک فطری امر ہے۔ جب کسی طرف سے جارحیت (Aggression) ہوگی تو اس کے مقابلے میں مزاحمتی تدبیر (Defensive Policy) اختیار کی جائے گی۔ نظریاتی ادب وشعر ہی دراصل مزاحمتی ادب کہلاتا ہے۔ جاگیر یا صاحب ملک وجاہ کی طرف سے جب غریب غرباء پر جبر وستم آزمایا گیا تو اس کے خلاف جو فریاد کی لے اٹھی، وہ مزاحمتی ادب ہی تھا۔ وہ زار شاہی کے خلاف ہو یا شگاگو کے ارباب اقتدار کے خلاف۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے اسی رنگ میں آغاز کیا تھا مگر آگے چل کر اسکا رخ ایک مخصوص نظریئے کی طرف پھر گیا اور اس میں وہ توانائی نہ رہی جو اس کی اٹھان میں تھی۔ اس تحریک نے جب مذہب کے خلاف جارحانہ انداز اختیار کیا تو مزاحمت میں اسلامی ادب نے حفاظتی بند کا کام کیا۔ یہ فطری سلسلہ ہے جو ہر دور میں سامنے آتا ہے۔

چٹان: نوجوان شعراء وادباء کے لئے کوئی پیغام؟

علیم ناصری: ہمارے نوجوان شاعر اور ادیب اس وقت بہت کام کر رہے ہیں۔ ان میں بہت اچھے شاعر، افسانہ نگار، انشائیہ نگار اور کالم نگار ہیں۔ شاعروں کے بہت سے شعری مجموعے آچکے ہیں بلکہ مسلسل آرہے ہیں جن میں کچھ تو بہت معیاری ہیں اور اکثر فکر وفن میں بہت کمزور ہیں۔ اصل وجہ وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ یہ لوگ ادب وشعر کے مسلمہ دفاتر کا مطالعہ نہیں کرتے۔ ہمارے شاعر دور نہ جائیں، حالی کی کتاب، مقدمہ شعر و شاعری، اور حسرت موہانی کی کتاب، نکات سخن، ہی کو پڑھ لیں تو انہیں اندازہ ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں میرا پیغام یہی ہے کہ فکر وفن کو ملحوظ رکھیں اور زیادہ سے زیادہ مطالعہ کریں۔ اساتذہ کا کلام اور بڑے نثر نگاروں کی کتابوں پر نظر ڈالیں۔ ممکن ہو تو فنی تنقیدی مضامین پڑھیں، اس سے ان کی خاصی رہنمائی ہوگی۔ نیز اپنے کلام کو اخلاقی قدر سے مزین کریں۔ ادب برائے ادب، بری چیز نہیں لیکن، ادب برائے زندگی، بڑی چیز ہے۔

عامر بن علی

① ہمارے ہاں لوگ پورا سچ سننے کے عادی نہیں ہیں۔
② ادب زبانوں کا محتاج نہیں۔ تخلیق اپنے لیے صنف اور زبان خود متعین کرتی ہے۔
③ سچا ادب لکھنے کے لیے سچا معاشرہ ضروری نہیں ہے۔

نوجوان شاعر عامر بن علی کا تعلق میاں چنوں سے ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے لاطینی امریکہ میں مقیم ہیں۔ عامر بن علی کے اب تک دو شعری مجموعے، یاد نہ آئے کوئی، اور سرگوشیاں، چھپ کر نہ صرف عوام سے مقبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں بلکہ عصر حاضر کے نمائندہ ناقدین ادب و اساتذہ فن سے بھی اپنا آپ منوا چکے ہیں۔ بقول منو بھائی کے اس کی شاعری سبک، مدہم اور نرم و نازک جذبات و خیالات سے مزین ہے۔ اس کی نظموں سے ہمیں اپنے آپ کو تلاش کرنے والی نوجوان نسل کو تلاش کرنے اور اسے سمجھنے اور پیار کرنے کی دعوت ملتی ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ اس نسل کی مدد کے بغیر کچھ بھی آگے نہیں چل سکے گا۔

چٹان: ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب میں سے کون سے فنی نظریے کے قائل ہیں؟

عامر بن علی: میرے خیال میں بڑا ادب تو وہی ہوتا ہے جو انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہو۔ کرۂ ارض پر انسانی حیات کے ارتقاء اور ترویج و ترقی کے لیے جو بھی چیز تخلیق کی جائے بلاشبہ اس ادب سے بہتر ہے جس کا مطمع نظر فقط ادب کی ترویج و ترقی ہو۔ ادب کی خدمت اور ادب کی ترقی بھی ایک اچھا مقصد ہے۔ مگر انسانی معاشرے اور انسان کی زندگی میں بہتری کی غرض سے جو ادب تخلیق کیا جائے وہ بلاشبہ ارفع و اعلیٰ مقاصد کا حامل ہے۔

چٹان: اکیڈمی ادبیات پاکستان مقتدرہ قومی زبان اور ادب کی ترویج کے لیے قائم کیے گئے دیگر سرکاری اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

عامر بن علی: غریبوں کے بچے عموماً بچپن میں ہی بہت میچور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے والدین سے ایسی فرمائش نہیں کرتے جنہیں وہ پورا کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ غریب ممالک میں عوام اور فنکاروں کا اندازِ فکر بھی غریب والدین کی اولاد جیسا ہوتا ہے۔ ہم سرکاری اداروں سے زیادہ توقعات ہی وابستہ نہیں کرتے لیکن اپنے محدود وسائل میں ادب کے فروغ کے متعلق ادارے جو بھی کوشش کر رہے ہیں میری نظر میں وہ قابلِ قدر ہیں۔

چٹان: شعر کہنے کی جانب کیسے راغب ہوئے؟

عامر بن علی: مجھے نہیں پتہ کہ میں اس طرف کیسے آ گیا۔ سائنس اور بزنس کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے شعر کہنا ایک مختلف سی بات لگتی ہے مگر اس کے باوجود یہ ہے کہ فطری طور پر میرا رجحان شروع سے ہی شعر و ادب کی طرف رہا۔ ایک نامعلوم سی بے چینی ذات کا مستقل حصہ تھی۔ جس کو اظہار کے لئے کچھ ذریعہ یا دوسرے لفظوں میں راستہ چاہئے تھا۔ اس کا ایک پیرایہ نثر تھی لیکن شعر میری فطرت کے زیادہ قریب تھا اس لئے اس کی طرف رجحان بڑھتا گیا اور اب تو یوں لگتا ہے جیسے شاعری میری ذات کا حصہ ہے۔

چٹان: آپ کا پہلا شعری مجموعہ کب آیا اور اس کا تجربہ کیسا رہا؟

عامر بن علی: غالباً دو اڑھائی سال پہلے میرا پہلا شعری مجموعہ، یاد نہ آئے کوئی، چھپ کر منظر عام پر آیا۔ یہ نظموں اور غزلوں پر مشتمل تھا۔ اور الحمد اللہ میں اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کا خاص شکر گزار رہوں کہ ادب کے ناقدین اور عوام دونوں نے اس مجموعے کو خاص پذیرائی بخشی۔ جس کا واضح ثبوت صرف چھ ماہ میں اس کے ایڈیشن کا ختم ہو جانا تھا۔ اس حوالے سے میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔

چٹان: کیا کسی اور صنف میں لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

عامر بن علی: جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ شاعری میری فطرت کے زیادہ قریب ہے اس لئے میرا زیادہ رجحان شاعری کی طرف ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے

نثر بالکل نہیں لکھی۔ نثر کے حوالے سے انشاء اللہ تعالیٰ میری دو کتابیں عنقریب منظر عام پر آئیں گی ان میں سے ایک بیرون ملک سیاحت کے حوالے سے سفرنامہ ہے اور دوسرا افسانوں کا مجموعہ ہے۔

چٹان: آپ نے تین اصناف ادب کا ذکر کیا ہے جن میں آپ لکھتے ہیں آپ ان میں سے کس صنف ادب میں اپنی پہچان کروانے کے متمنی ہیں؟

عامر بن علی: جہاں تک پہچان کروانے کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ اپنی پہچان کروانا میری تخلیق کا مقصد نہیں۔ میرے نزدیک تخلیق خواہ شاعری ہو یا نثر کتھارسس کا ذریعہ ہے۔ ہاں ان باتوں سے ہٹ کر اگر آپ پوچھیں تو پھر میں کہوں گا کہ شاعری میری پہلی اور آخری محبت ہے۔

چٹان: آپ کا رجحان نظم کا طرف زیادہ ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ غزل کی نسبت نظم کا مستقبل زیادہ روشن ہے؟

عامر بن علی: میرے نزدیک صنف ایک ضمنی چیز ہے۔ اصل شے معیار ہے۔ دیگر لفظوں میں۔

جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

زندہ چیز وہ رہے گی جو معیاری ہوگی خواہ وہ غزل ہو، رباعی ہو یا نظم۔

چٹان: ادبی قد کاٹھ بڑھانے کے لئے کسی خاص گروہ سے وابستگی کس حد تک ضروری ہے؟

عامر بن علی: سہاروں کی ضرورت کمزور اور نکمے لوگوں کو ہوتی ہے اصل میں کامیابی کا تعلق صلاحیتوں سے ہے نا کہ تعلقات، سفارش، یا گروپ بندیوں سے کوئی بڑا ہو سکتا ہے۔ ان ہتھکنڈوں سے وقتی طور پر تو فائدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقل طور پر کامیابی کے لئے اپنی بنیادوں کا مضبوط ہونا ایمانداری، محنت اور لگن انتہائی ضروری ہے۔

چٹان: کیا سچا ادب لکھنے کے لئے کسی خاص ماحول یا آزادی کا ہونا ضروری ہے؟

عامر بن علی: ادیب اپنے اردگرد کے ماحول سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ سچا ادب لکھنے کے لئے سچا معاشرہ ضروری ہے۔ جھوٹ ظلم اور منافقت کے ماحول میں سچا ادب لکھنا اگرچہ ناممکن تو نہیں البتہ کسی حد تک مشکل ضرور ہے۔

چٹان: کیا وہ ماحول اور آزادی آپ کو میسر ہے جس کے آپ متمنی ہیں؟

عامر بن علی: ہاں کسی حد تک آپ کہہ سکتے ہیں لیکن مکمل طور پر نہیں۔ ویسے بھی ہمارے ہاں لوگ پورا سچ سننے کے عادی نہیں ہیں۔

چٹان: آپ کے آئیڈیل کون ہیں۔

عامر بن علی: شاعری میں، میں فیض احمد فیض کو پسند کرتا ہوں ویسے تمام ذہین اور خوبصورت لوگ میرے آئیڈیل ہیں۔

چٹان: آج تک کتنے عشق کیے ہیں؟

عامر بن علی: عشق کرنا تو دور کی بات ابھی تک میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ عشق ہے کیا۔

چٹان: آپ اتنی اچھی پنجابی بولتے ہیں کبھی پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

عامر بن علی: فیض صاحب سے بھی کسی نے یہی سوال کیا تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ چونکہ استاد دامن پنجابی میں شاعری کر رہے ہیں۔ اس لئے میری ضرورت نہیں، مگر میرے نزدیک ایسا نہیں میں سمجھتا ہوں کہ ادب زبانوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ تخلیق اپنے لئے صنف اور زبان کا تعین خود کرتی ہے۔ اس میں ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا کہ مجھے پنجابی نے اکسایا ہو۔ ہاں کبھی زندگی میں ایسا ہوا تو پھر پنجابی ضرور لکھوں گا۔

چٹان: کیا آپ نے کبھی کسی سے اصلاح بھی لی ہے؟

عامر بن علی: باقاعدہ اصلاح تو میں نے کسی سے بھی نہیں لی۔ مگر شاعری کے بارے میں میں نے سیکھا بہت سے لوگوں سے بہت کچھ ہے۔ شہرت بخاری، احمد ندیم قاسمی، منو بھائی، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور اسلم کولسری جیسی عظیم شخصیات سے فیض یاب ہونے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے۔ بہرحال میں شاعری میں اصلاح لینے کو برا ہرگز نہیں سمجھتا۔ یہ ایک خوبصورت ادبی روایت ہے اسے قائم رہنا چاہیے۔

چٹان: آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

عامر بن علی: خوابوں پر یقین رکھنے کے باوجود عملی آدمی ہوں۔ اس لئے ادب برائے زندگی کا قائل ہوں۔

چٹان: آپ عام زندگی میں بڑے ہنس مکھ دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے یہ رویہ اپنی تحریروں

میں کیوں نہیں اپنایا؟

عامر بن علی: غم خالصتاً ایک ذاتی اثاثہ ہے۔اس میں سوائے دوستوں کے کسی کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔

چٹان: نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

عامر بن علی: نثری نظم کا اپنا ایک مزاج اور فکری اسلوب ہے۔ میرے خیال میں صرف رجعت پسند لوگ اس کی مخالفت پر بضد ہیں۔

چٹان: خواتین شاعرات میں سے کن کی شاعری سے متاثر ہیں؟

عامر بن علی: پروین شاکر کی شاعری اب بھی دل کو چھوتی ہے۔اس کے بعد جتنی بھی موجودہ شاعرات ہیں ان سب میں بشریٰ اعجاز کا نام سرفہرست ہے۔خاص طور پر ان کی نئی پنجابی کتاب بھلیکھا کے حوالے سے بات کروں گا۔اس میں انہوں نے چونکا دینے والی شاعری کی ہے۔

علی چوہدری

① ترقی پسند ممالک بلاشبہ ایک عظیم تحریک تھی۔
② بیشتر ادیب وصحافی حقیقی مسائل پر بہت کم قلم اُٹھاتے ہیں۔
③ شادی عشق کا انجام یا منزل قطعاً نہیں۔

علی چوہدری اردو زبان کی انٹرنیٹ پر سب سے بڑی اور موٴثر ویب سائٹ (Web site) کے خالق ہیں انکی ویب سائٹ ''اردو پوائنٹ'' کے یومیہ قارئین کی تعداد ۱۰ لاکھ سے زیادہ ہے۔ انتہائی مقبول کالم نگار اور بے حد متحرک صحافی ہیں۔ لیکن ادبی اور صحافتی گروپ بندیوں سے بہت دور ہیں۔ نوعمر ہونے کے باوجود اپنی فکر اور کام کے حوالے سے انتہائی سنجیدہ ہیں۔

ارژنگ: اردو پوائنٹ، ویب سائیٹ، کی تخلیق کا خیال کیسے آیا؟

علی چوہدری: بنیادی طور پر میرا تعلق انفارمیشن ٹیکنالوجی سے تھا۔ بدقسمتی سے انٹرنیٹ پر کوئی بھی معیاری اردو ویب سائیٹ نہیں تھی۔ جو موجود تھیں وہ بھی برائے نام۔ ایسے حالات میں مجھے یہ خیال آیا کہ کم ازکم انٹرنیٹ پر اردو زبان میں ایک ویب سائیٹ ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نظریہ پاکستان کا دفاع کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی قارئین کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ یہ دور میڈیا وار (Media War) کا دور ہے۔ ہمارے دشمن ملک انڈیا کی انٹرنیٹ پر بے شمار سائٹیں موجود تھیں کوئی بھی پاکستانی اور اردو سائیٹ نہ ہونا ایک قابل تشویش بات تھی جس نے مجھے،، اردو پوائنٹ،، کی تشکیل وتخلیق کے لیے متحرک کیا۔

ارژ نگ: آپ نے مغربی طرز تعلیم اور مغرب کے زیر اثر ماحول میں تعلیم پائی یہ اردو سے آپ کو لگاؤ کیسے ہوا؟

علی چوہدری: بچپن میں ہی میری اردو انتہائی کمزور تھی اور میں اردو سے بھاگتا تھا۔ حتیٰ کہ کالج کی حد تک بھی یہی حالت رہی۔ اردو کی طرف میرے رجحان کی وجہ اردو کی چاشنی و وسعت سے زیادہ جذبہء حب الوطنی تھا جس نے مجھے ،، اردو پوائنٹ ،، کی تخلیق کے لیے ابھارا۔ شروع میں تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ اس قدر مقبول ہو جائے گی لیکن لوگوں کی دلچسپی اور دلجوئی نے میرا سفر آسان بنا دیا۔

ارژ نگ: لکھنے کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

علی چوہدری: پڑھنے پڑھانے کا شوق تو مجھے بچپن ہی سے تھا لیکن لکھنے کے بارے میں کبھی بھی سنجیدہ نہ سوچا تھا۔ جب میں نے ،، اردو پوائنٹ ،، کی بنیاد رکھی تو مجھے بڑی شدت سے کسی بولڈ Bold لکھنے والے کی کمی محسوس ہوئی۔ کالج کے زمانے میں لکھتا رہا اور دوستوں نے پسندیدگی کا اظہار بھی کیا لیکن اس عمل میں باقاعدگی نہ تھی۔ لہٰذا میں نے باقاعدہ طور لکھنا شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

ارژ نگ: سنا ہے آپ شاعری بھی کرتے ہیں؟

علی چوہدری: مسکراتے ہوئے۔۔۔ میں باقاعدہ شاعر تو نہیں ہوں لیکن کبھی کبھی کوئی شعر ہو جاتا ہے ویسے شاعری پڑھتا بہت زیادہ ہوں اور شاعری سے لگاؤ بھی انتہائی درجے کا ہے۔

ارژ نگ: کیا ہمارے علمی، ادبی، اور ثقافتی ادارے آپ کے خیال میں کوئی تعمیری کام کر رہے ہیں۔؟

علی چوہدری: ہمارے معاشرے کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں کوئی بھی شخص دوسرے سے مطمئن نہیں ہے ادبی، ثقافتی ادارے اپنی حد تک کچھ کچھ کر رہے ہیں لیکن ان کا آپس میں رابطہ نہیں ہے۔ جیسے گزشتہ دو تین سال میں گورنمنٹ کمپیوٹر پر نیا ،، اردو فاؤنٹ تخلیق کرنے والوں کے باہمی عدم تعاون کی وجہ سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے جو کہ بلاشبہ ایک قومی المیہ ہے۔ میرے خیال میں ایسے واقعات نہیں ہونے چاہئیں۔

ارژنگ: ترقی پسند تحریک کے متعلق آپ کے کیا خیالات ہیں؟
علی چوہدری: ترقی پسند تحریک بلاشبہ ایک عظیم تحریک تھی اور اس کے اردو ادب پر بہت زیادہ احسانات ہیں۔ اس تحریک نے ادب کو مقصدیت سے نوازا اور ادیبوں کا ایک متحرک اور بامقصد رویہ Role طے کیا۔ ترقی پسند تحریک کو دوبارہ متحرک کیا جانا چاہیے۔
ارژنگ: آپ کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں۔ آپ کمپیوٹر پروگرامر بھی ہیں کالم نگار بھی اور صحافی بھی آپ کو اپنی شخصیت کی کون سی جہت زیادہ پسند ہے۔
علی چوہدری: کالم نگاری مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔
ارژنگ: معاشرے کو سدھارنے میں ایک ادیب کا کیا کردار ہونا چاہیے؟
علی چوہدری: ادیب جو بھی لکھتا ہے وہی لوگوں کا ایمان بن جاتا ہے۔ لوگ اسی بات کو حق اور حقیقت گردانتے ہیں اس لیے ادیب کا کردار انتہائی اہم ہے۔ ادیب کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ مثبت رہے، اپنی سوچ میں، اپنی تخلیق میں اور اپنے کردار میں۔ مزید یہ کہ کالم نگاروں اور صحافیوں کو چاہیے کہ وہ صرف سیاست کے پیچھے ہی نہ پڑے رہیں۔ ہماری قومی زندگی کے اور بھی بے پناہ اہمیت کے حامل موضوعات اور مسائل موجود ہیں ان پر بھی بات ہونی چاہیے بدقسمتی سے ہمارے بیشتر ادیب وصحافی حقیقی مسائل پر بہت ہی کم قلم اٹھاتے ہیں۔ سماجی موضوعات پر لکھنے والوں کا بہت بڑا فقدان موجود ہے۔ میرے خیال میں ادب و صحافت کا بنیادی موضوع سیاست کی بجائے سماج اور اس سے منسلک مسائل ہونا چاہیے ملک میں بڑھتی ہوئی غربت، جہالت، فحاشی اور طبقاتی کشمکش ہمارے اصل مسائل ہیں اور بے روزگاری اور افراط زر پر بھی لکھنے والے لوگ ہونے چاہیں۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ادباء وصحافیوں کو حقیقی مسائل سے نظر چرانے کے لیے کبھی تو روپے پیسے کا لالچ دیا جاتا ہے اور کبھی ان کو دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ایک سچا ادیب وہی ہے جو اپنے کام کو ایک مقدس فرض سمجھ کر، دھونس دھاندلی سے بے پروا ہو کر پوری ایمانداری سے انجام دیتا رہے۔
ارژنگ: کبھی کسی سے عشق کیا اور انجام؟

علی چوہدری: مسکراتے ہوئے۔۔۔! عامر صاحب کیوں گھر سے نکلوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ جذبہ تو سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔۔۔ ہونا چاہیے۔ عشق ہونا چاہیے۔

انسان بہت بدل جاتا ہے۔ عشق بڑی اچھی چیز ہے، انسان کو بڑا اچھا بنا دیتی ہے۔

جہاں تک انجام کا سوال ہے تو شادی عشق کا انجام یا منزل قطعی نہیں ہے۔ شادی ہو یا نہ ہو عشق میں اس کی حیثیت ثانوی ہے بنیادی نہیں۔ عشق تو چلتا رہتا ہے۔ چلتا رہا ہے، چلنا چاہیے۔

ارژنگ: محفلوں سے اتنا دور کیوں رہتے ہیں؟

علی چوہدری: بھائی اصل میں محفلوں میں گروہ بندیاں ہوتی ہیں اور میں گروہ بندیوں سے بھاگتا ہوں۔ محفلوں میں جانے سے آدمی کا کردار متنازعہ ہو جاتا ہے اور میں اس چیز کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ میرے نام کے ساتھ کسی خاص سیاسی پارٹی یا ادبی گروہ کا نام آئے۔ بنیادی اور اہم بات تو تخلیق و تعمیر ہے اور وہ میں الحمد اللہ پورے جوش و جذبے سے کرنے میں مشغول ہوں۔

ارژنگ: اس وقت کون کون سے مسائل درپیش ہیں؟

علی چوہدری: مسائل تو پیش آتے رہے ہیں لیکن مستقل مسئلہ فنانس کا ہے چونکہ ہمارے اخراجات بہت زیادہ ہیں لیکن انٹرنیٹ کی لوگوں میں مناسب تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہماری آمدنی کے ذرائع انتہائی محدود ہیں۔ لیکن امید ہے کہ جس رفتار سے لوگوں میں انٹرنیٹ کی تعلیم آ رہی ہے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

ارژنگ: کیا حکومت آپ سے کوئی تعاون کر رہی ہے؟

علی چوہدری: بالکل بھی نہیں حکومت کسی بھی سطح پر کوئی بھی تعاون نہیں کر رہی ہمارے قارئین کی یومیہ تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہے لیکن آج تک حکومت نے ہمیں کوئی اشتہار تک نہیں دیا۔

ارژنگ: مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟

علی چوہدری: میں چاہتا ہوں کہ اردو پوائنٹ کو اتنا مضبوط اور موثر ادارہ بنا دیا جائے کہ جب

بھی کوئی پاکستان یا اردو پڑھنے والا انٹرنیٹ کھولے تو سب سے پہلے اُردو پوائنٹ کو دیکھے اور پڑھے انشاء اللہ اسی سال ہم ہر صوبے میں اپنے صوبائی دفتر کھول رہے ہیں پھر اس کے بعد ڈویژن کی سطح پر بھی آفس کھولنے کا ارادہ ہے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ موثر بنایا جا سکے۔ اور ہر پاکستانی اردو پوائنٹ میں اپنی شمولیت محسوس کرے۔

ارژنگ: ادیب ساتھیوں کے لیے کوئی پیغام؟

علی چوہدری: پیغام تو نہیں درخواست ہے۔ انتہائی گزارش ہے کہ ادیب دوست اپنی گروہ بندیاں اپنے تک ہی رکھیں انہیں عوام کے سامنے نہ لائیں۔ عوام آپ کو بہت عظیم اور معتبر خیال کرتے ہیں لیکن ذاتی نوعیت کی بیان بازیوں کی وجہ سے لوگ پورے ادبی طبقے کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ادیبوں کو چاہیے کہ وہ سیاستدانوں کی طرح ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی نہ کریں اور تن من سے تخلیقی کام سرانجام دیں جو کہ ایک ادیب کا حقیقی فریضہ ہے۔

فخر زمان

- میں غالباً دُنیا کا واحد رائٹر ہوں جس کی پانچ کتابیں بیک وقت پابندی کا شکار ہوئیں۔
- پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں قومی ہیں۔
- پنجابی کی بات کرنے سے ملکی سالمیت کو کوئی خطرہ نہیں۔

ارژنگ: ادب کی طرف کیسے آئے؟

فخر زمان: اصل میں جب میں گجرات کالج میں پڑھتا تھا تو سب سے پہلے اُردو لکھنا شروع کیا۔ یہی افسانہ اور شاعری وغیرہ جو کالج کے ادبی میگزین میں چھپ جاتی گریجویشن بلکہ ایم اے تک میں نے اُردو یا انگریزی میں لکھا۔ اس کے بعد پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ میرا پہلا اُردو شعری مجموعہ ''زہراب'' 1969ء میں چھپا۔ اس کے تین چار سال بعد ریڈیو کی پروڈیوسر مرحومہ زریں نگار ملک نے ریڈیو کے لیے پنجابی ڈرامہ لکھنے کے لیے کہا میں نے کہا کہ میں تو پنجابی میں بالکل نہیں لکھتا لیکن ان کے اصرار پر مجھے پنجابی ڈرامہ لکھنا پڑا جو ریڈیو پر چلا اور اتفاق سے بے حد مقبول بھی ہوا۔ پھر اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے پنجابی میں لکھنا چاہیے جس کے بعد پھر میں نے پنجابی میں مسلسل لکھا جس میں کچھ ٹی وی ڈرامے بھی لکھے۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس سے پہلے میں پنجابی صوفی شعراء، امرتا پریتم، موہن سنگھ اور شریف کنجاہی وغیرہ کو کافی حد تک پڑھ چکا تھا۔

ارژنگ: اب تک آپ کی کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں؟

فخر زمان: اب تک میری چھبیس کے قریب کتابیں چھپ چکی ہیں۔ان میں شعری مجموعے ''زہراب''، ''راستے کی دھول''، ''ٹی وی ڈرامے''، ''دیواریں'' سفرنامہ ''گردش میں پاؤں'' اور ترجمہ کالعدم تحریریں اُردو کی کتابیں ہیں۔ پنجابی میں ''کسو ویلے دی ونگار''، ''بندی وان'' اور ''بے وطنا'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ ''چڑیاں دا چنبہ'' اور ''ون دا بوٹا'' ریڈیو ڈراموں کے مجموعے ہیں۔اس کے علاوہ میرے پنجابی ناولوں کے انگریزی ترجمے بھی چھپے ہیں۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران جون 78ء میں میری پانچ کتابوں ''بندی وان''، ''ست گواچے لوگ''، ''اِک مرے بندے دی کہانی'' پنجابی ناول اور پنجابی شعری مجموعے ''ونگار'' اور ''کسو ویلے دی ونگار'' پر پابندی عائد کر دی گی۔جس کے خلاف میں نے ہائیکورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کر دی۔ یہ مقدمہ اٹھارہ سال چلتا رہا۔ بالآخر 1998ء میں یہ پابندی اُٹھالی گئی۔ میں غالباً دُنیا کا واحد رائٹر ہوں جس کی پانچ کتابیں بیک وقت پابندی کا شکار ہوئیں۔اس کیس میں اعتزاز احسن جو کہ میرے بہت اچھے دوست اور عزیز بھی ہیں میرے وکیل تھے۔انہوں نے ساری دُنیا کے ادب کے حوالے سے بڑی محنت سے سو صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت رٹ پٹیشن تیار کی۔ یہ رٹ پٹیشن اب باقاعدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے۔

ارژنگ: آپ کی کتابیں کس بنیاد پر پابندی کا شکار ہوئیں؟

فخر زمان: جب ضیاء الحق آیا تو میں بھٹو کا سینیٹر تھا اور پیپلز پارٹی کا سرگرم شخص سمجھا جاتا تھا۔اسی وجہ سے میری کتابوں پر پابندی عائد کر دی گئی لیکن اس پابندی کا نتیجہ یوں نکلا کہ یہ کتابیں ہندوستان میں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو کر چھپ گئیں۔

ارژنگ: آخری کتاب کب لکھی؟

فخر زمان: میری اب تک کی آخری کتابی پنجابی ناول ''کم ذات'' کو چار سال ہو گئے ہیں۔ جبکہ ''زوال دی گھڑی'' کو تین سال ہو گئے ہیں۔اب میں دو کتابیں ایک پنجابی ناول جو کہ میرا چھٹا پنجابی ناول ہوگا اور دوسری ''پنجاب اور پنجابیت'' کے نام سے سات آٹھ سو صفحات پر مشتمل اُردو کی کتاب عنقریب چھپ جائے گی۔ ''پنجاب اور پنجابیت'' میں میں نے پنجاب کی تاریخ و زبان ثقافت کے حوالے سے جو غلط فہمیاں ہیں ان کو دور کرنے کی

کوشش کی ہے۔اس ملتے جلتے موضوع پر ''پنجاب کا مقدمہ'' کے نام سے حنیف رامے بھی ایک کتاب لکھ چکے ہیں لیکن میرے خیال میں بجائے فائدے کے اس کتاب نے پنجاب کو نقصان پہنچایا ہے۔ ''پنجاب اور پنجابیت'' میں نے پنجاب کے حوالے سے غلط فہمیوں کو بڑے لاجیکل انداز سے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کی اشاعت کے بعد میری خواہش ہے کہ دیگر صوبوں کے ان لیڈران کو جو پنجاب کے حوالے سے غلط فہمیوں کا شکار ہیں کتاب کی تقریب رونمائی میں بلا کر اظہار خیال کر دوں۔ دیگر لفظوں میں انہیں کہوں گا کہ اس کتاب کا جواب دیجیے۔

ارژنگ: عالمی پنجابی کانفرنس کا خیال کیسے آیا اور اس کے کیا مقاصد ہیں؟

فخر زمان: عالمی پنجابی کانفرنس لاہور میں 1984ء میں پنجابی زبان کے ادیبوں، دانشوروں اور سکالروں کی طرف سے منعقد کی گئی تھی۔ جبکہ مجھے اس کا پہلا چیئرمین بنایا گیا۔ اس تنظیم کے بنیادی اہداف میں پنجابی زبان، ادب، کلچر کی ترقی کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کے بارے میں مغالطوں کو دور کرنا اور پنجاب کی تاریخ کے روشن پہلو کو اُجاگر کرنا تھا۔اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صدیوں سے جو بحران پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے اسے ختم کر کے نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا جائے۔عالمی پنجابی کانفرنس کے زیر سایہ منعقد ہونے والی پہلی بین الاقوامی کانفرنس 1986ء میں ہوئی۔ جبکہ دوسری کانفرنس 1992ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ دونوں کانفرنسوں میں تمام دنیا سے آنے والے سینکڑوں مندوبین نے شرکت کی۔ 1986ء اور 1992ء میں جاری کیے جانے والے اعلان ناموں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ پنجابی زبان کو پرائمری سطح پر ذریعہ تعلیم کا درجہ دیا جائے۔اس کانفرنس میں ایک زبان کی بالادستی سے انکار کرتے ہوئے تمام پاکستانی زبانوں کی وکالت کی گئی۔اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں قومی ہیں۔جبکہ اُردو رابطے کی زبان ہے۔ پنجابی زبان، پاکستان، بھارت، کینیڈا، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، ناروے، ڈنمارک، سویڈن، ہالینڈ، عرب امارات، ملائیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ وغیرہ میں کروڑوں لوگوں کی زبان ہے اور اسے دُنیا بھر کی زبانوں میں دسواں درجہ حاصل ہے۔بد قسمتی سے پاکستان میں اسے بیورو کریسی، بالا دست طبقہ اور ایک زبان کے علمبرداروں کی سازشوں کی

وجہ سے اس کا جائز مقام نہیں دیا جا سکا۔ پنجابی زبان کی اہمیت کو نظرانداز کرنے والے شاؤنسٹ اپنے پرانے ناسٹلجیا کی دلدل سے ہی باہر نہیں آ سکے اور لسانی بالادستی کی برخود غلط ذہنیت رکھتے ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبانوں کی ترقی مخالفین، شاؤنسٹ اور نام نہاد دانشوروں کے منفی ہتھکنڈوں پر مبنی نوآبادیاتی ذہنیت ہے جس کے ذریعے وہ ملک کی سلامتی کے لیے مسلسل خطرہ ہیں۔ چنانچہ ہر محبِّ وطن پاکستانی کا جو دھرتی کی زبانوں سے محبت کرتا ہے فرض منصبی ہے کہ وہ پاکستانی زبانوں کے خلاف کام کرنے والوں اور اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے خواہش مندوں کے مذموم مقاصد کے خلاف اپنے ملک کے طول وعرض میں بولی جانے والی زبانوں کو تسلیم کروانے کی جدوجہد میں حصہ لے۔ عالمی پنجابی کانفرنسیں اسی جہت میں ٹھوس اقدام ہیں۔

ارژنگ: عالمی پنجابی کانفرنس 2001ء اور عالمی پنجابی کانفرنس کے قیام کے حوالے سے کچھ بتائیے۔

فخر زمان: 2000ء میں چندی گڑھ بھارت میں عالمی پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس ہر لحاظ سے ایک کامیاب کانفرنس تھی اور لاہور میں منعقد ہونے والی گزشتہ کانفرنسوں کا پیغام آگے پہنچانے میں بڑی مددگار ثابت ہوئی۔ لاہور میں 13 تا 16 اپریل 2001ء کو عالمی پنجابی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دُنیا بھر سے آنے والے 15 ممالک سے 100 سے زائد مندوبین نے شرکت کی جن میں بھارت سے آنے والے 150 مندوبین بھی شامل تھے۔ اعلان نامہ لاہور میں دوسرے نکات کے علاوہ پنجابی زبان کو پرائمری سطح پر ذریعہ تعلیم بنائے اور صوبائی مقننہ میں پنجابی زبان اختیار کیے جانے کی بھرپور حمایت کی گئی۔ لاہور میں منعقد ہونے والی یہ کانفرنس برصغیر میں لسانی بنیاد پر ہونے والی یہ سب سے بڑی کانفرنس تھی۔ اخبارات، رسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے قومی اور بین الاقوامی دونوں سطح پر اس کی بھرپور تشہیر کی۔ اس تاریخ ساز کانفرنس نے بھارت اور پاکستان کے مابین امن کی ضرورت پر بہت زور دیا اور تمام متنازعہ مسائل خاص طور پر مسئلہ کشمیر کو باہمی گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے پر زور دیا۔ اس کانفرنس کی کامیابی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ رجعت پسند، انتہا پسند، شاؤنسٹ ادبی بنیاد پرست اور خالصیت پسند اپنا حسد اور بغض

کسی طرح بھی نہ چھپا سکے۔ لاہور کانفرنس 2001 کے بعد مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی پنجابی تنظیموں نے عالمی پنجابی کانگریس کے نام سے ایک مقتدر تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا جو تمام دُنیا میں پنجابی زبان ادب، کلچر اور تاریخ کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کی واحد نمائندہ تصور کیا جائے۔

ارژنگ: ان کانفرنسوں کے حوالے سے اب تک آپ کو کیا کامیابیاں ملی ہیں؟

فخر زمان: میں سمجھتا ہوں کہ اب تک ہم اس حوالے سے جتنی کانفرنسیں منعقد کروا چکے ہیں اس کے نتیجے میں پنجابی زبان اور کلچر فروغ ایک گلوبل تحریک بن چکی ہے۔ ہم نے دُنیا میں بسنے والے پنجابیوں خواہ ان کا تعلق پاکستان سے ہو یا ہندوستان سے یا وہ دُنیا کے کسی بھی ملک میں رہتا ہوان سب کو اپنی زبان اور کلچر کی حفاظت کے لیے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا ہے اور پہلی دفعہ یہ تحریک بن کر سامنے آئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمیں نہ صرف پاکستان بلکہ باہر بھی عزت ملی ہے۔

ارژنگ: عالمی پنجابی کانفرنس لندن کے حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے یہ کامیاب تھی؟

فخر زمان: کسی بھی کانفرنس کی کامیابی کا معیار اس کا اعلان نامہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ایک بڑی کامیاب کانفرنس تھی جس میں بارہ ملکوں سے تقریباً 250 مندوبین شریک ہوئے جس میں بڑے اچھے مقالے پڑھے گئے۔ اس میں پیش کیے گئے کلچرل پروگرام بہت اچھے تھے۔ آخر میں اس کا اعلان نامہ بھی بہت زوردار تھا۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کہوں گا کہ الحمدللہ لندن کانفرنس بڑی کامیاب کانفرنس تھی۔ ہاں البتہ انتظامی امور کے حوالے سے ہمیں شکایات کا سامنا کرنا پڑا۔ دراصل لندن میں انتظامات کے سلسلے میں جس شخص امین ملک کو صدر بنایا گیا وہ اس ذمہ داری کا اہل نہیں تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک نالائق آدمی تھا اور ذہنی طور پر بھی وہ نابالغ شخص تھا۔ ادیب اور شاعر بھی وہ پوراسا تھا۔ بس یہ ایک ہماری غلطی تھی کہ ایک نکمے شخص پر اتنی بھاری ذمہ داری ڈال جس کا خمیازہ ہمیں دوستوں کی شکایات کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ بہرحال یہ ساری خامیاں امین ملک کے کھاتے میں جاتی ہیں۔

ارژنگ: یہ بھی سننے میں آیا کہ کانفرنس میں ایسے بندے بھی وہاں گئے جن کا پنجابی زبان و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جبکہ اس کے برعکس ڈاکٹر شہباز ملک اور ڈاکٹر یونس احقر

جیسے اہم پنجابی دانشوروں کو نظر انداز کر دیا گیا؟

فخر زمان: ڈاکٹر یونس احقر پنجابی شاعری کا بڑا نام ہے اور میرے بڑے اچھے دوستوں میں ہیں۔ وہ چونکہ سرکاری ملازم ہیں اس لیے وہ کچھ مجبوریوں کی بنا پر لندن کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے اور جہاں تک ڈاکٹر شہباز ملک کی بات ہے تو اس شخص کو میں سرے سے ادیب ہی نہیں مانتا۔ اس کی ادب کی اپروچ انتہائی فرسودہ ہے۔ وہ جماعت اسلامی کا کارندہ ہے۔ اس نے پنجابی ڈیپارٹمنٹ اور پنجابی زبان و ادب کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ کسی ترقی پسند ادیب کو وہ رائٹر نہیں مانتا۔

ارژنگ: پنجابی کے حوالے سے آپ کا دائرہ کار کہاں تک پھیلا ہوا ہے؟

فخر زمان: پنجابی کانفرنس کے حوالے سے ہمارا دائرہ کار صرف ادبی کانفرنس تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں تاریخ اور سیاسی مقصد بھی شامل ہونا چاہیے اور وہ یقیناً روشن خیالی پر مبنی ہونا چاہیے۔ کیونکہ صوفیاء کے کلام میں کوئی بنیاد پرستی ملازم یا فرسودگی شامل نہیں ہوتی۔ ان کانفرسوں کے ذریعے ہم فرسودہ روایات کے حامی یا ان کے نمائندوں کو جو کالم نگار ہوں یا میڈیا سے تعلق رکھنے والوں کو بتایا ہے کہ پنجابی کی بات کرنے سے ملکی سلمیت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ ملکی سلمیت کو خطرہ ان لوگوں سے ہے جو بطور صحافی آئی ایس آئی سے فنڈ لیتے ہیں یا جب فوجی حکومت آتی ہے تو فوجی اداروں میں اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ انہی نظریہ پاکستان کے ٹھیکیداروں کی وجہ سے مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور انہی کی وجہ سے قائداعظم نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا تھا۔ ایک زبان کی اجارہ داری اور باقی زبانوں کے خلاف بات کرنا نظریہ پاکستان کے حوالے سے کوئی بات نہیں۔ پاکستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ سب کی سب قومی ہیں۔ اُردو قومی زبان کے علاوہ ایک رابطے کی زبان بھی ہے اور اس کے علاوہ اس کو سرکاری حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس لیے ہمارے لیے محترم ہے۔ یوں بھی اردو ایک خوبصورت زبان ہے۔ میں خود بھی اردو لکھتا اور بولتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ایسی صورتحال میں دیگر زبانوں کی بات کرنا کوئی منفی بات یا نظریہ پاکستان کے خلاف ہے۔ ہمارا اختلاف صرف تب ہوتا ہے جب خود پنجابی اُردو کی حمایت میں پنجابی کو نظر انداز کرتا ہے۔ پنجابی زبان کا سب سے بڑا دشمن

بذات خود پنجابی ہے۔ میں نے آج تک کسی سندھی کو یا کسی بلوچ کو اپنی زبان کے خلاف بات کرتے نہیں سنا۔ اس کے برعکس پنجابی میں 9 ہزار ایم اے پنجابی بیکار بیٹھے ہیں۔ انکو نوکری نہیں مل رہی۔ سات کروڑ کی اسمبلی میں آپ پنجابی میں بات نہیں کر سکتے۔ پنجابی کا صرف پرچہ ''بھلیکھا'' نکلتا ہے وہ بھی ان کی ہمت ہے۔ پتہ نہیں کیسے نکال لیتے ہیں۔ انڈیا میں پنجابی اخبار ''اجیت'' آٹھ لاکھ کی تعداد میں بکتا ہے۔ جبکہ ہم خود ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمارے مخالفین اپنا کام دکھا رہے ہیں۔ جب تک ہمارے درمیان اتحاد نہیں ہوتا اور ہم خود قائل نہیں ہوتے تب تک کافی مشکلات پیش آئیں گی۔ ہم اینٹی پنجابی کا رویہ بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ارژنگ: بطور چیئرمین اکادمی ادبیات آپ نے پنجابی زبان کے لیے کیا کیا؟

فخر زمان: میں جب اکادمی ادبیات کا چیئرمین بنا تو وہاں اردو کے علاوہ باقی زبانوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں نے پہلی دفعہ بشمول پنجاب کے تمام پاکستانی زبانوں میں مزاحمتی نظموں کے تراجم چھاپے۔ پھر گوجرانوالہ کے عبدالغنی شوق کی ہیر چھاپی۔ اس کے علاوہ کچھ پنجابی اداروں کی گرانٹ بڑھائی۔ اکادمی کا ایک اصول تھا کہ بہترین کتاب پر اُردو کو چالیس ہزار اور پنجابی کو بیس ہزار روپے دیے جاتے تھے۔ میں نے کہا کہ پنجابی کو بھی چالیس ہزار دینا چاہیے۔ ایک پنجابی ڈکشنری چھاپنے کا پروگرام بھی تھا لیکن انہی دنوں ہماری حکومت ختم ہو گئی۔ میرے بعد جو صاحب آئے نہ ہی انہوں نے اور نہ ہی موجودہ صاحب نے اس حوالے سے کچھ کیا۔ میرے بعد دونوں اصحاب کی ترجیحات میں قومی زبانیں نہیں ہیں۔ کمال فن ایوارڈ صرف اُردو کو دیا گیا۔ جبکہ پنجابی میں احمد راہی اور شریف کنجاہی جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ سنا ہے کہ میرے بعد تو وہاں پنجابی زبان و ادب کا نام لینا بھی بڑی مصیبت بن چکا ہے۔ واضح رہے کہ اکادمی ادبیات صرف اردو کا ادارہ نہیں ہے۔ اس میں پاکستان کی تمام زبانیں شامل ہیں۔ میں نے جب ملک کی ساری زبانوں میں کتابیں چھاپیں تو اس کے بعد اسمبلی کے اجلاس میں سینیٹر جمیل الدین عالی نے مجھ سے پہلا سوال جو کیا وہ یہ تھا کہ فخر زمان سے پوچھا جائے اس نے اکادمی ادبیات کے چیئرمین کے حوالے سے پاکستان کی علاقائی زبانوں کو پاکستان کی قومی زبان کے برابر کیوں کھڑا کر دیا ہے۔ پھر

انہوں نے اپنا یہی سوال اپنے کالم میں بھی اُٹھایا۔

ارژنگ: مستقبل کے حوالے سے آپ کا لائحہ عمل کیا ہے؟

فخر زمان: جیسا کہ میں نے بتایا دنیا بھر میں مقیم پنجابی اپنی مادری زبان کو تسلیم کروانے کے عمل میں کئی طرح کے مسائل کا شکار ہیں۔ لاہور کانفرنس 2001 نے اس سلسلے میں یادگار کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں پنجابی لوگ اپنی زبان کے سلسلے میں تشخص کے بحران پر قابو پانے اور زبان کو درپیش مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہیں۔ پاکستانی پنجابی بار اپنے پنجابی ہونے، صوفی ورثے، ثقافتی پس منظر، روشن تاریخی روایات پر فخر محسوس کر رہے ہیں اور ایک زبان کے نام نہاد نظریے کو مسترد کر رہے ہیں۔ وہ اپنی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں اور پنجابی زبان و ثقافت کا منہ توڑ جواب دیں گے۔ پاکستان میں بسنے والے پنجابی دقیانوسیت پسند عناصر مغرور اور افسر شاہی سے نپٹنے کے لیے ہر دم تیار ہیں۔ WPC نے فیصلہ کیا ہے کہ گلوبل پنجابی تحریک کی رفتار کو اگلے چار برسوں 2005ء میں آٹھ کانفرنسوں کے ذریعے تیز کیا جائے جن ممالک میں یہ کانفرنس منعقد ہوگی۔ ان میں بھارت (دسمبر 2002) کینیڈا (مئی 2003) ملائیشیا (دسمبر 2003) ڈنمارک (مئی 2004) امریکہ (دسمبر 2004) ناروے (مئی 2005) شامل ہیں۔ ہالینڈ، سنگاپور اور تھائی لینڈ میں اگلے مرحلے میں کانفرنسیں منعقد ہوں گی۔ پاکستان میں چوتھی کانفرنس دسمبر 2005ء میں منعقد ہوگی اور یوں کانفرنسوں کے پہلے مرحلے کا اختتام اور دوسرے مرحلے کا آغاز ہوگا۔ جلد ہی عالمی پنجابی کانگریس کا ویب پیج بھی پنجابی زبان، ادب اور تاریخ کے فروغ کے لیے تیار کیا جائے گا۔

فرحت عباس شاہ

○ یہاں تو اندھیر نگری ہے چور لٹیرے شاعر اور ادیب بنے بیٹھے ہیں۔

○ جس طرح شہید زندہ ہوا کرتا ہے اس طرح زندہ ہوتے ہوئے بھی کچھ لوگ مردہ ہوا کرتے ہیں۔

○ بیشتر پروڈیوسر شاعر ایسے ہیں جو جوا کھیلتے ہیں تا کہ کسی طرح غالبؔ کی صف میں شامل ہو جائیں۔

فرحت عباس شاہ کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے نہایت مختصر عرصے میں اپنے قارئین کا وسیع حلقہ پیدا کر لیا ہے۔ اپنے پہلے شعری مجموعے ''شام کے بعد'' سے ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے فرحت عباس شاہ کے اب تک بیسیوں شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ فرحت عباس شاعری کے علاوہ تنقید بھی لکھتے ہیں۔ صاف سچی اور کھری بات منہ پر کہنے کی عادت ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے کثیر چاہنے والوں کے ساتھ بڑی تعداد میں مخالفین بھی ہیں جو انہیں ادبی پھڈے باز جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ نام نہاد، سکہ بند، روائتی ادیبوں، دانشوروں اور نقادوں کے مخالفانہ رویوں سے دلبرداشتہ ہو کر میدان چھوڑ جاتے اب تک اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی تخلیق کا سفر بھی تیزی سے جاری ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں حالات سے لڑنے کا طریقہ بھی آتا ہے شعر کہنے کا سلیقہ بھی۔

چٹان: آپ نے شاعری کو ہی وسیلہ اظہار کیوں بنایا؟

فرحت عباس شاہ: میں تنقید بھی لکھتا ہوں اور کچھ دوسرے فنون لطیفہ سے بھی گہری دلچسپی ہے لیکن فطری میلان شاعری کی طرف زیادہ ہے۔ ایسا قدرتی طور پر ہوا اس میں میری شعوری کوشش شامل نہیں۔

چٹان: آپ کے نزدیک ادب میں سنیارٹی کا معیار کیا ہے؟

فرحت عباس شاہ: تخلیقی کام اور وابستگی۔ جس کا تخلیقی کام زیادہ ہو جس کی ادب کے ساتھ کمٹ منٹ زیادہ لمبی ہو اس بنیاد پر اس کی سنیارٹی کا تعین ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر عمر کو مدنظر رکھا جاتا ہے اور پھر کئی بار نہیں رکھا جاتا یعنی طویل العمری کو سنیارٹی کی بنیاد بنانے والے بذات خود کئی دفعہ چھوٹی عمر کے لوگوں کی سنیارٹی کو تسلیم کرتے ہیں۔ لہٰذا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ عمر کے بجائے تخلیقی کام کی ورتھ کو سنیارٹی کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔

چٹان: کیا مقدار کی زیادتی معیار کو متاثر کرتی ہے؟

فرحت عباس شاہ: اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اعلیٰ ادب یا اعلیٰ تخلیق کم لکھے جانے یا زیادہ لکھے جانے کی محتاج نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں نے بہت کم لکھا ہے اور بہت بوگس لکھا ہے اور کچھ لوگوں نے بہت زیادہ لکھا ہے اور بہت اچھا لکھا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چٹان: ادب میں سیاست بازی کے رجحانات کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟

فرحت عباس شاہ: جو لوگ ادب میں سیاست کر کے مفادات اٹھاتے ہیں وہی اس سیاست کے ذمہ دار ہیں اور سیاست کا فائدہ بھی انہی لوگوں کو ہوتا ہے۔

چٹان: اب تک آپ کی کافی کتابیں چھپ چکی ہیں کیا وجہ ہے کہ آپ کو کوئی نیشنل ایوارڈ کیوں نہیں مل سکا؟

فرحت عباس شاہ: اس کی وجہ نیشنل ایوارڈ دینے والوں کو پتہ ہو گی میں نے کبھی اس بارے میں غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

چٹان: کیا یہ ایوارڈز میرٹ پر دیئے جاتے ہیں؟

فرحت عباس شاہ: میرٹ پر ملتے تو احمد ندیم قاسمی پانچ لاکھ کا انعام اپنے آپ کو کیسے

دیتے۔ ان کی بیٹی کو انعام کیسے ملتا جب کہ وہ ایوارڈز دینے والی کمیٹی کے منصف اعلیٰ تھے۔ کسی عدالت میں جب کوئی مقدمہ لگتا ہے تو مدعی اور مدعا علیہ کو پورا حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر اس کے جج کے ساتھ فریقین میں سے کسی کا دور دراز کا بھی تعلق یا رشتہ ہو تو دوسرا فریق درخواست دائر کر کے عدالت تبدیل کروالے حتیٰ کہ جب بچوں کے امتحانات ہوتے ہیں تو امتحانی سنٹر میں متعین کئے جانے والے نگرانوں سے لکھوایا جاتا ہے کہ کہیں ان کا کوئی رشتہ دار عزیز تو امتحان نہیں دے رہا اگر ایسا ہو تو اس نگران کو اس امتحانی سنٹر سے ہٹا لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں بہت ساری ایسی مثالیں ہیں کہ کسی سلیکشن کمیٹی یا انصاف کمیٹی میں مصنفین میں کسی ایک کا کوئی عزیز رشتہ دار امیدوار نکل آیا تو اس مصنف نے بذات خود رضا کارانہ طور پر کمیٹی کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ لیکن ہمارے ادیبوں کی بددیانتی اور سینہ زوری کی انتہا دیکھیں کہ کمیٹی کے منصف اعلیٰ کو سب سے بڑا انعام دے دیا گیا اور اس نے قبول کر لیا پھر ایک انعام اس کی بیٹی کو دے دیا گیا۔ اس نے بھی قبول کر لیا۔ یہاں تو اندھیر نگری ہے۔ چور لٹیرے شاعر اور ادیب بنے بیٹھے ہیں اب میں ایوارڈ کے بارے میں کیا تجزیہ پیش کروں۔

چٹان: یہ کمیٹی کس نے بنائی تھی؟

فرحت عباس شاہ: اکادمی ادبیات کے چیئرمین نذیر ناجی نے بنائی ہوگی، ادیبوں کی خرید و فروخت آج کل وہی کر رہے ہیں۔

چٹان: کچھ عرصہ پہلے آپ کی غزلوں کی ایک کیسٹ مارکیٹ میں آئی تھی ادبی تاریخ میں شاید یہ پہلا تجربہ تھا کہ کسی شاعر نے اپنی آواز میں اپنا کلام ریکارڈ کروایا ہو یہ تجربہ کیسا رہا اس کے بعد آپ کی کوئی نئی کیسٹ بھی تکمیل کے مرحلے میں ہے؟

فرحت عباس شاہ: اس کے بعد میری چار پانچ کیسٹیں اس طرح کی آئیں ہیں۔ شاعری میں اس طرح کام کرنے کا میرا شوق ہے۔ اس میں ردعمل یا رسپانس کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ بس مجھے ایسے کاموں سے خوشی ملتی ہے۔

چٹان: آپ نے حلقہ ارباب ذوق اور دیگر ادبی حلقے ہوتے ہوئے اپنا الگ فورم بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

فرحت عباس شاہ: ہم جب آج سے دس سال پہلے پاک ٹی ہاوس میں آنا شروع ہوئے تو دیکھا کہ ایک اجلاس ہے یہاں حلقہ ارباب ذوق اس پر کچھ نامراد اور غیر تخلیقی لوگ قابض ہیں۔ وہ لوگ تنقیدی اجلاسوں میں ایسے لوگوں کو شیڈول کرتے ہیں جن سے کوئی سگریٹ کی ڈبی، پان، بوتل یا چائے کی امید ہوتی تھی۔ خاص طور پر جینوین شاعر ادیبوں کو نظر انداز کرتے تھے خاص طور پر نئے آنے والے بغلیں جھانکا کرتے ان کی تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہم نے اس صورتحال کو محسوس کیا اور اپنا ہفتہ وار اجلاس شروع کیا پھر ہم نے دیکھا کہ پاکستان میں ملکی سطح پر ادیبوں کی صرف دو تنظیمیں یا ادارے ہیں اور وہ بھی دونوں سرکاری ہیں۔ ایک مرا ہوا ادارہ پاکستان رائٹرز گلڈ اور دوسرا کچھ زیادہ ہی زندہ ادارہ اکادمی ادبیات سو ہم نے پاکستان رائٹرز کونسل کی بنیاد رکھی۔ ہماری کونسل خاص طور پر نوجوانوں کی کونسل ہے۔ ہمارے سینئر ادیبوں نے حکومتوں کے ہاتھ مضبوط کر کے مفادات حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تخلیقی سطح پر بھی درجہ دوم کا کام کیا ہے۔ اکادکا لوگوں کو چھوڑ کر ہمارے پیشتر سینئر تھرڈ کلاس ادیب اور شاعر ہیں۔ سچی بات ہے کہ ہمیں تو اپنے موجود سینئرز میں سے منیر نیازی اور ڈاکٹر انیس ناگی کے سوا کوئی سچا اور میجر شاعر ادیب نظر نہیں آتا۔ منیر نیازی اور انیس ناگی کے دم قدم سے ہماری ادبی دنیا آباد ہے۔ ورنہ پیشتر لوگ تو مر چکے ہیں میرے نزدیک اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور انتظار حسین مردہ ادیب اور شاعر ہیں بس انہیں دفنانا باقی ہے جس طرح شہید زندہ ہوا کرتا ہے اسی طرح کچھ لوگ زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہوا کرتے ہیں۔

چٹان: خواتین کی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فرحت عباس شاہ: خواتین نے اچھی شاعری بھی کی ہے۔ اپنی بھی کی ہے اور مانگے کی بھی ہے۔ نوشی گیلانی تو سرے سے شاعرہ ہی نہیں صرف چور ہے۔ اور یہ ظلم منور جمیل نے کیا ہے اللہ منور جمیل کی مغفرت فرمائے لیکن آپ دیکھئے کہ زیادہ دیر یہ جھوٹ چل نہیں سکا۔ اب نوشی ساری زندگی بھی لوگوں کو قسمیں اٹھا اٹھا کر کہے گی کہ میں شاعرہ ہوں تو بات نہیں بنے

گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شاعری کے ساتھ ساتھ کرتا ہے پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب شاعری اس کے ساتھ ساتھ کرتی ہے۔

چٹان: منور جمیل اور نوشی گیلانی کے درمیان متنازعہ غزلوں کے حوالے سے عدالت نوشی کے حق میں فیصلہ دے چکی ہے ایسی صورت میں نوشی کو چور شاعرہ کہہ کر کیا آپ توہین عدالت کے مرتکب نہیں ہو رہے؟

فرحت عباس شاہ: عدالت کا فیصلہ اپنی جگہ لیکن وقت نوشی گیلانی کے خلاف فیصلہ دے چکا ہے اور وقت سے زیادہ منصف کون ہوسکتا ہے۔

چٹان: آپ کے حوالے سے تخلیق پسند تحریک کے بارے میں سننے میں آیا ہے۔ یہ کیسی تحریک ہے؟

فرحت عباس شاہ: ہم نے ادب سے لے کر معاشرے تک میں غیر تخلیقی لوگوں اور رویوں کو آگے آگے اور نمایاں دیکھا ہے اس کے ردعمل میں اپنی اس تحریک کا آغاز کیا ہے ہماری خواہش ہے کہ ہمارے معاشرے اور ادب میں تخلیقی لوگ نمایاں ہوں۔

چٹان: الیکٹرانک میڈیا ادب کی ترویج کے حوالے سے کہاں تک اپنا کردار نبھا رہا ہے؟

فرحت عباس شاہ: یہ کمرشل ادارے ہیں یہ ادبی حوالے سے اطمینان بخش کیسے ہوسکتے ہیں۔ ان کی مجبوریاں ہیں یہ تو بیچارے اپنا کام نہیں کر سکتے۔ بیشتر پروڈیوسر شاعر ایسے ہیں جو جوا کھیلتے ہیں تاکہ کسی طرح غالب کی صف میں شامل ہو جائیں باقی کچھ ایسے بھی ہیں جو طوائفوں کی خدمت گزاری میں لگے رہتے ہیں البتہ نیک اور باصلاحیت لوگ بھی ہیں۔

فرحت زاہد

○ منٹو اور عصمت چغتائی کے بعض افسانے ایسے ہیں جنہیں نوجوان لڑکیاں لڑکے نہ ہی پڑھیں تو اچھا ہے۔

○ پاکستانی ادیبوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اُن کے نخرے برداشت کیے جائیں۔

○ امریکہ میں ادب کے فروغ کے لیے پاکستانی سفارت خانے کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔

ارژنگ: اپنے بارے میں کچھ بتائیے؟

فرحت زاہد: میں بچپن ہی سے عام بچوں سے مختلف تھی۔ جن دلچسپیوں میں میرے بہن بھائی یا کزنز حصہ لیتے تھے میں ان سے پرہیز کرتی تھی۔ میری طبیعت ذرا ان سے الگ تھی اور میرے خیال میں یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے تھا۔ یہ بھی بتا دوں کہ میرا تعلق بہاولپور سے ہے۔ میرے والد وہاں ریلوے کنٹریکٹر تھے اور وہ یوپی سے ہجرت کر کے وہاں آئے تھے۔ میری پیدائش بہاولپور کی ہے۔ بی اے میں نے بہاولپور ڈگری کالج سے کیا۔ اس کے بعد ایم اے انگلش کے لیے اسلامیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا لیکن تعلیم کے دوران میری شادی ہوگئی جس کے بعد باقاعدہ تعلیمی سلسلے کو ترک کرنا پڑا۔

ارژنگ: لکھنے کی طرف کیسے آئیں؟

فرحت زاہد: بچپن ہی سے ہمارے گھر میں ادبی رسالے نقوش، فنون اور ادب لطیف چھپ

کر آئے تھے جن کو میں گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھی۔ شاید اسی دوران کہیں لکھنے لکھانے کے جراثیم نے میرے اندر پرورش کے لیے جگہ بنالی لیکن اس کا ادراک مجھے ایک سال بعد ہوا کہ میں لکھ سکتی ہوں یا مجھے بھی لکھنا چاہیے۔

ارژنگ: ابھی آپ نے جن ادبی جریدوں کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ آپ ان کو گھر والوں سے چھپ چھپ کر پڑھا کرتی تھیں۔ کیا آپ کے گھر میں ادب پڑھنے پر پابندی تھی یا پھر ان جریدوں میں کوئی قابل اعتراض مواد چھپتا تھا؟

فرحت زاہد: آپ کی دونوں باتیں درست ہوسکتی ہیں۔ وہ ایسے کہ ہمارا گھرانہ ایک کٹر مذہبی قسم کا گھرانہ تھا۔ جس میں خاص طور پر خواتین کو دینداری اور امور خانہ کی طرف دھیان دینے کو کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ چونکہ دور طالب علمی میں ایسے جریدے پڑھنے سے پڑھائی کا حرج بھی ہوتا ہے اس لیے گھر والوں کی طرف سے ایسی قسم کی کتابیں یا رسالے پڑھنے کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی۔ یوں بھی ان جرائد میں عصمت چغتائی اور منٹو کے افسانے چھپتے تھے اور باوجود اس کے کہ وہ ادبی شاہپارے اور حقیقت کے ترجمان تھے آج بھی سمجھتی ہوں کہ منٹو اور عصمت چغتائی کے بعض افسانے ایسے ہیں جن کو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں نہ ہی پڑھیں تو اچھا ہے۔

ارژنگ: حالانکہ خود آپ نے وہ افسانے چھپ چھپ کر پڑھے؟

فرحت زاہد: اس لیے ہی تو یہ بات کہہ رہی ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نوجوانی کی عمر دراصل نادانی کی عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں آدمی کسی بات کی گہرائی میں جائے بغیر اس مسئلے کو صرف اُوپری سطح سے دیکھتا ہے۔ بعد میں عمر کے ساتھ ساتھ جب انسان تجربات کی بھٹی سے گزرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ حقیقت گمان سے بالکل مختلف ہوتی ہے لیکن عموماً آدمی کو حقیقت کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب وہ عمر کا کافی حصہ گزار چکا ہوتا ہے۔

ارژنگ: آپ کا مطلب بچوں پر پابندیاں ہونی چاہئیں؟

فرحت زاہد: ہرگز نہیں۔ آپ بچوں کو اعتماد میں لے کر ان کو پیار محبت سے بھی سب کچھ سمجھا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح پرورش پانے والے بچے معاشرے کے بہترین اور کارآمد انسان بن سکتے ہیں۔

ارژنگ: با قاعدہ طور پر پہلی دفعہ کب لکھا؟

فرحت زاہد: میں شروع سے ہی بورڈنگ میں ہوں۔ وہاں میری کافی لڑکیوں کے ساتھ کافی اچھی دوستی تھی۔ غیر شعوری طور پر میں اپنی دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں کوئی مصرعہ کہہ جاتی تھی۔ میری اکثر سہیلیاں کہتی تھیں کہ تمہاری باتوں میں ردھم ہے۔ تم لکھنے کی طرف دھیان دو۔ انہی دنوں کالج میں قائداعظم کی سوسالہ تقریب کے سلسلے میں کالج میگزین کے لیے میں نے ایک نظم کہی جسے ہماری اُردو کی لیکچرار میڈم شمشاد نے بے حد پسند کیا اور وہ نظم میگزین میں چھپنے کے لیے منظور ہوگئی۔ بس یہیں سے میری ہمت بندھی اور مجھے حوصلہ ملا کہ مجھے مزید لکھنا چاہیے۔

ارژنگ: مشاعروں اور ادبی جرائد میں کب چھپنا شروع کیا؟

فرحت زاہد: یہ بڑی بعد کی بات ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ ہمارا گھر مذہبی تھا۔ لہٰذا مشاعروں کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس زمانے میں بہاولپور ریڈیو اسٹیشن کے پروڈیوسر عقیل اشرف تھے۔ جو اَب کراچی میں ہوتے ہیں۔ وہ نئے ٹیلنٹ کی تلاش میں مختلف جگہوں کا چکر لگایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ہمارے کالج بھی کئی دفعہ آئے۔ خود میرا بھی جی چاہتا تھا کہ میں مشاعرے پڑھوں لیکن مجھے صرف پڑھائی کی اجازت تھی۔ یہ بھی بتا دوں کہ میں بڑی ذہین سٹوڈنٹ تھی۔ میں تھرو آؤٹ اسکالرشپ ہولڈر تھی۔ لکھنے کا سلسلہ بھی ساتھ چلتا رہا لیکن لکھ کر میں اپنے پاس رکھ لیتی تھی۔ باقاعدہ نہ تو کسی مشاعرے میں سنایا اور نہ ہی کہیں چھپنے کے لیے دیا۔

ارژنگ: اس حوالے سے کب سامنے آئیں؟

فرحت زاہد: یہ غالباً 1981ء کی بات ہے۔ 79ء میں میری شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد جب میں یو اے ای میں چلی گئی کیونکہ میرے شوہر وہاں آرمی میں تھے۔ ان دنوں وہاں ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مرحوم سلیم جعفری اس سلسلے میں کافی متحرک تھے۔ دُبئی، ابوظہبی میں آئے دن ادبی تقریبات، مشاعرے اور میلے ہوتے رہتے تھے۔ میرے میاں زاہد صاحب خود بھی شاعر تھے اور ان کے تایا شیخ یحییٰ خان بھی شاعر تھے۔ ان کو ایسی تقریبات میں شرکت کے دعوت نامے ملتے رہتے تھے۔ اسی طرح کی کسی محفل میں، میں

نے بھی اپنا کلام سنایا جس کی سامعین نے کافی حوصلہ افزائی کی۔ خاص طور پر ع س مسلم نے مجھے کافی حوصلہ دیا۔ پھر ان کے کہنے پر میں نے باقاعدہ مشاعروں میں جانا شروع کر دیا۔

ارژنگ: کتاب چھپنے کی نوعیت کب آئی؟

فرحت زاہد: میری پہلی کتاب ''لڑکیاں اُدھوری ہیں'' کے نام سے چھپی جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔

ارژنگ: ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' یہ نام کیسے تجویز کیا؟

فرحت زاہد: کتاب میں میری ایک نظم ہے ''پھلواری'' اس میں یہ لائن ہے۔

''پھول اور شگفتوں پر تتلیاں تو آتی ہیں
تتلیاں ضروری ہیں
خواب گر نہ دیکھیں تو
لڑکیاں ادھوری ہیں''

ارژنگ: ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' یہ کہنے کی آپ کو ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

فرحت زاہد: لڑکیوں کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں جو ناروا پابندیاں ہیں اسے سامنے رکھ کر میں نے یہ ایک احتجاج ریکارڈ کرایا ہے۔

ارژنگ: امریکہ میں آپ کی ادبی مصروفیات کیا ہیں؟

فرحت زاہد: لکھنے لکھانے کے علاوہ یہاں سے جو لوگ امریکا جاتے ہیں ان سے ہمارا بہت ملنا ملانا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم نے وہاں ''کاروان فکروفن'' کے نام سے ایک تنظیم بنا رکھی ہے جس کے چیئرمین وکیل انصاری ہیں۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام ہم اب تک وہاں کافی لوگوں کو مدعو کر چکے ہیں۔

ارژنگ: یہاں سے جن لوگوں کو آپ اپنے ہاں مدعو کرتے ہیں وہ آپ کے لیے کس قسم کے مسائل پیدا کرتے ہیں؟

فرحت زاہد: اصل میں یہاں سے جانے والے کافی توقعات لے کر جاتے ہیں۔ جبکہ امریکہ میں جو زندگی کی مصروفیات ہیں وہاں کئی مجبوریاں ہمارے آڑے آ جاتی ہیں۔ پاکستانی ادیبوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ان کے نخرے برداشت کیے جائیں۔

پاکستانی شاعر اور ادیب البتہ ایسے گھٹیا پن سے پرہیز کرتے ہیں۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کی وہاں کیا صورت حال ہے؟

فرحت زاہد: وہاں بھی گروہ بندیاں ہیں لیکن سب اپنے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہاں پر ہماری تنظیم کے علاوہ حلقہ فنون ادب، حنیف اخگر، حمیرا رحمان، ظفر میموریل سوسائٹی، ریحانہ قمر، نیر آپا اور شکاگو میں فاروقی صاحب ہیں۔

ارژنگ: امریکہ میں اُردو ادب کے بارے میں عمومی رویہ کیسا ہے؟

فرحت زاہد: امریکن ادب سوسائٹی اُردو ادب سے خاصی دور ہے۔ اس کی وجہ میوزک اور فلم ہے۔ اُردو ادب وہاں ابھی متعارف نہیں ہوا۔ اس حوالے سے وہاں بہت زیادہ کام کی ضرورت ہے۔ ساؤتھ ایشین لینگویجز کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے لیکن یہ زیادہ تر ہندی کے فروغ کے لیے کام کرتا ہے۔ اُردو کے فروغ کے لیے وہاں کوئی ادارہ تاحال قائم نہیں ہے۔ بنیادی طور پر یہ سفارت خانے کا کام ہے لیکن ایمبیسی صرف اس حد تک کام کرتی ہے کہ وہ کسی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر آ جاتی ہے۔ امریکہ میں اُردو ادب کے فروغ کے لیے پاکستانی سفارت خانے کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ اُمید کی ایک کرن پاکستان مشن کے منصور سہیل کا نام میں ضرور لوں گی۔ یہ کافی اچھے آدمی ہیں۔ ان سے اس سلسلے میں کافی توقعات وابستہ ہیں۔

ارژنگ: اتنے طویل عرصے بعد پاکستان آنا کیسا لگا؟

فرحت زاہد: بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ خاص طور پر لاہور آ کر بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ میرا ایک ہفتہ قیام کا پروگرام تھا لیکن یہاں آئے ہوئے مجھے دو ہفتے ہو گئے ہیں۔

ارژنگ: یہاں کے ادیبوں کے حوالے سے کچھ کہیں گی؟

فرحت زاہد: پروین عاطف ہی کی بات کروں گی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ فرحت زاہد تمہارے آنے پر پورا لاہور یوں لگ رہا ہے جیسے یہاں باہر کھڑا ہے۔ لاہور کے ادیب اور شاعر بڑے زندہ دل کمٹڈ اور ذہین ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ اُردو ادب کا مستقبل لاہور کے ادیبوں کی وجہ سے روشن ہے۔

قمر رضا شہزاد

○ خدا ہر اچھے شاعر کو اس صورت حال سے بچائے کہ وہ اپنے ہی دوستوں کا نشانہ بنے۔

○ ادب ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی ترجیحات میں کبھی نہیں رہا۔

○ آج میں جو کچھ ہوں وہ جناب احمد ندیم قاسمی کے سبب سے ہوں۔

سوال: شاعری کا خیال کیسے آیا؟

یہ تو شاید میں واضح نہ کر سکوں کہ کب مجھے شاعری کا خیال آیا۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد ادبی کتابیں دیکھیں۔ میرے والد صاحب ادیب یا شاعر تو نہیں تھے مگر انہیں مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگلش اور اُردو لٹریچر کی کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ جو اب میری لائبریری کا حصہ ہے۔ پڑھنا شروع کیا تو انہی کتابوں سے آغاز ہوا۔ پھر سکول کے زمانے میں میرے ایک اُستاد شوکت حسین مرحوم جو اگرچہ سائنس پڑھاتے تھے مگر ادبی ذوق کے حامل تھے۔ انہیں اساتذہ کے سینکڑوں شعر یاد تھے۔ ہر ہفتے بزمِ ادب کا اجلاس ہوتا تھا جہاں طلباء کے مابین بیت بازی کا مقابلہ ہوتا تھا۔ میں ان مقابلوں میں نہایت شوق و ذوق سے شریک ہوتا۔ غالباً یہی وقت تھا جب میں نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ مقابلے کے دوران جب کسی حرف پر کوئی شعر یاد نہ آتا تو خود ہی شعر گھڑ کر سنا دیا کرتا تھا۔

کالج کے زمانے میں بین الکلیاتی مشاعروں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ان

دنوں طلبا کی اکثریت اُستاد شعراء سے غزلیں اور نظمیں لکھوا کر مشاعروں میں شریک ہوتی تھی۔ جبکہ میں خود بھی غزل یا نظم کہتا تھا۔ اوّل انعام میرے حصے میں شاید اس لیے بھی آتا کہ اکثر طلباء غزلیں اور نظمیں پڑھتے پڑھتے بے وزن کر دیتے تھے جبکہ میں بالکل درست پڑھتا تھا۔ اگرچہ میں علم عروض کا ماہر نہیں ہوں مگر مجھے ایک کمال ضرور حاصل ہے کہ میرا وجدان شعر کے وزن کے معاملے میں اتنا حساس ہے کہ جب میں شعر نہیں بھی کہتا تھا تو مختلف مقامات پر چھپے ہوئے بے وزن شعر مجھے اذیت میں مبتلا کر دیتے تھے اور میں ان کی اصلاح کر کے انہیں وزن میں کر دیا کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے زمانے تک میرا شاعر بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو ناول نگار یا افسانہ نگار بننا چاہتا تھا۔ مجھے کہانیاں اچھی لگتی تھیں۔ اپنے سکول کے زمانے میں میں نے بچوں کی کہانیاں بھی لکھیں جو بچوں کے رسائل میں شائع بھی ہوئیں۔

مگر بالآخر میرے اندر کے شاعر نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں شاعری کی طرف آ گیا۔

سوال: ادبی سفر کیسا رہا؟

جواب: جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے کہ شاعر ہونا میرے ایجنڈے میں کہیں نہیں تھا لیکن جب شعر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تو پھر ہمہ وقت شاعری میرے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے آبائی شہر کبیر والہ میں اُستاد شاعر بیدل حیدری، خادم رزمی، وفا حجازی اور نور اسماعیل جیسے بڑے نام قیام پذیر تھے۔ بیدل حیدری اور وفا حجازی کے مابین معاصرانہ چپقلش اپنے عروج پر تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے خلاف باقاعدہ ہجویہ کلام تحریر کیا جاتا تھا۔ بیدل حیدری کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ تھا۔ جبکہ وفا حجازی شعروں پر اصلاح نہیں دیتے تھے۔ بیدل صاحب نے پاکستان بننے کے بعد انڈیا سے ہجرت کر کے لاہور کو اپنا مسکن بنایا اور وہاں سے ۵۶ کی دھائی میں کبیر والہ آئے جبکہ وفا حجازی قیام پاکستان کے فوراً بعد امرتسر سے ہجرت کر کے کبیر والہ آباد ہوئے۔ بظاہر ان دونوں کی معاصرانہ چپقلش سے ادبی ماحول میں ایک کشیدگی تھی مگر اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ کبیر والہ جنوبی پنجاب میں ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ دونوں شاعر ایک دوسرے

کے مقابلے میں ایک ہی دن مشاعرے منعقد کرتے تھے اور بیرونِ شہر سے اپنے اپنے شاعر دوستوں کو بلاتے تھے۔ کبیر والہ کے ادب ذوق افراد کو ہر دو شاعر اپنی طرف کھینچتے تھے اور یوں یہاں کے عام شہریوں میں بھی ادب کا ذوق وشوق پیدا ہوا۔ دوسرے شہروں سے بیدل حیدری کے تلامذہ کی آمد بھی یہاں کے ادبی ماحول میں گہما گہمی پیدا رکھتی تھی۔ اس گہما گہمی کے نتیجے میں تخلیق شعر کے لیے ایک مسابقت کی فضا قائم ہوئی۔ بیدل حیدری کے باقاعدہ شاگردوں میں ارشاد جالندھری، اختر شمار، شکیل سروش، ناصر بشیر اور مظہر بخاری وہ اہم نام ہیں جو آج بھی ادبی میدان میں سرگرمِ عمل ہیں۔ جب کہ ایسے بھی بہت سے شاعر ادبی منظر پر موجود ہیں جو بیدل حیدری کے باقاعدہ شاگرد تو نہیں تھے مگر جنہوں نے بیدل حیدری کی تنگ دستی سے فائدہ اُٹھایا اور شاعری میں نام کمایا ان پردہ نشینوں کا تذکرہ پھر کسی وقت کے لیے چھوڑتا ہوں۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو محکمہ شماریات میں ایک ملازمت مل گئی جس کی بدولت تقریباً ۲ سال لیہ قیام پذیر رہا۔ لیہ اگر چہ ادبی مراکز سے دور دراز جنوبی پنجاب کا ایک نسبتاً پسماندہ ضلع تھا لیکن یہاں کے ادبی ماحول میں ڈاکٹر خیال امروہوی، نسیم لیہ غافل کرنالی اور شہباز نقوی جیسے اہم شاعر تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ نسیم لیہ ایک مجلسی آدمی تھے۔ وہ لیہ کی میونسپل لائبریری میں لائبریرین تھے۔ اُن کی لائبریری تو خیر ادبی محافل کا مرکز تھی ہی مگر ہر شام وہ صابر ہوٹل پر بھی ادبی محفل جماتے۔ تمام احباب جمع ہونا شروع ہو جاتے اور رات گئے تک یہ نشست جاری رہتی۔ وقتاً فوقتاً اُردو اور سرائیکی مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا۔ جس میں گرد ونواح کے شاعر بھی شریک ہوتے تھے۔ اس حوالے سے یہ خطہ کافی فعال تھا۔ میرے لیے یہ ماحول بہت سازگار تھا۔ یہاں میں نے سرائیکی زبان میں بھی شاعری شروع کی۔ یہاں سے ساہیوال ٹرانسفر ہوا تو ایک مختلف ادبی ماحول میرے سامنے تھا۔ یہ مالی طور پر آسودہ ادیبوں اور شاعروں کا شہر تھا۔ اُن دنوں جعفر شیرازی، گوہر ہوشیار پوری، حاجی بشیر احمد بشیر، اکرم خان قمر اور محمود علی محمود جیسے تخلیق کار یہاں موجود تھے۔ سٹیڈیم ہوٹل اور اکرم کلیم کے ہوٹل سیر دان میں ادباء اور شعراء جمع ہوتے تھے۔ جعفر شیرازی مرحوم کے پاکستان بھر کے ادیبوں اور شاعروں سے رابطے تھے۔ وہ

یہاں کی مقامی انتظامیہ سے مل کر کل پاکستان مشاعروں کا انعقاد بھی کرتے۔ ایسے ہی کسی مشاعرے میں پہلی مرتبہ ظفر اقبال نے میری غزلیں سنیں تو انہوں نے مجھے گلے لگالیا اور بعد ازاں میری شاعری پر ''نئے شاعر کے ظہور'' کے عنوان سے ایک تفصیلی کالم تحریر کیا اور یہ کسی بڑے شاعر کی طرف سے شاید میری شاعری کا پہلا باقاعدہ اعتراف تھا۔

ساہیوال آیا تو پھر لاہور جیسے بڑے ادبی مرکز سے میرا رابطہ ہو گیا۔ وہاں علی اکبر عباس نے میری شاعری سنی تو پی ٹی وی کے بڑے مشاعروں میں شرکت کا موقع مل گیا۔ لاہور میں اُن دنوں جن ہم عمر شاعروں سے میری دوستی ہوئی اور حلقہ قائم ہوا اُن میں ڈاکٹر جاوید انور، عباس تابش، علی اصغر عباس، اعجاز نقوی، زاہد مسعود، افضال نوید، ضیاء الحسن جیسے احباب تھے۔ فنون کا دفتر ٹھکانہ ہوا۔ وہاں مجھے احمد ندیم قاسمی کی شفقتیں اور محبتیں حاصل ہوئیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ آج میں جو کچھ ہوں وہ جناب احمد ندیم قاسمی کے سبب ہوں۔ انہوں نے مجھے مسلسل فنون میں شائع کیا۔ جس کی بدولت مجھے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل ہوئی۔

سوال: ادبی سفر میں مشکلات۔

جواب: دیکھیں جی کسی بھی نئے شاعر کو اپنے ادبی سفر کے آغاز میں سب سے بڑی مشکل جو پیش آتی ہے وہ بطور شاعر اپنی حیثیت کو منوانا۔ کیونکہ اگر وہ اچھا شاعر ہے تو اُس پر پہلا الزام ہی یہ عائد کیا جاتا ہے کہ یہ شاعر نہیں ہے بلکہ کسی استاد شاعر سے غزلیں لکھواتا ہے۔ یقیناً مجھے بھی یہ مشکل پیش آئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنی شاعری کے اوائل عرصہ میں اُردو اکیڈمی ملتان کے تنقیدی اجلاس میں اپنی چند غزلیں پیش کیں۔ غزلیں تو پسند کی گئیں مگر چند احباب کی طرف سے یہ آوازیں بھی سننے کو ملیں کہ یہ غزلیں کسی سے لکھوائی گئی ہیں۔ اسی طرح بہاولپور کے مشاعرے میں غزل سنائی تو بہت داد ملی۔ مشاعرے کے بعد کھانے پر ایک بزرگ نے فرمایا کہ آپ نے جو غزل سنائی تھی وہ بہت عمدہ تھی لیکن وہ غزل آپ کی نہیں ہے۔ جس پر میں نے کہا کہ آپ کے یہ الفاظ بھی میری تعریف ہیں۔ کیونکہ میں تو جانتا ہوں یہ غزل میری ہے۔ بعد ازاں کی مشکلات شاید اتنی اہم نہیں ہیں۔ یعنی

مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ نام مقام کا جھگڑا میڈیا پر پذیرائی نہ ہونا یہ وہ تمام معاملات ہیں جو اُس وقت مشکل بنتے ہیں جب آپ کی ترجیحات میں یہ سب کچھ شامل ہو۔ اگر آپ کی ترجیح شاعری ہے تو پھر شاید یہ کچھ بھی نہیں اور خدا کے فضل و کرم سے میرا مسئلہ صرف شاعری ہے۔ یعنی یہی خواہش کہ شاعری ہوتی رہے۔ البتہ اس ضمن میں ایک مشکل ایسی بھی ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔ آپ جن دوستوں کے ساتھ تخلیقی سفر کا آغاز کرتے ہیں اگر وہ کسی وجہ سے ادبی میدان میں آگے بڑھنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو بعض اوقات اُن کی فرسٹریشن، حسد اور ردعمل آپ کے لیے مسائل پیدا کرتا ہے۔ خدا ہر اچھے تخلیق کار کو اس صورتِ حال سے بچائے کہ وہ اپنے ہی دوستوں کا نشانہ بنے۔

سوال: آپ ادبی مراکز سے دور رہ کر مرکزی دھارے میں کیسے شامل ہوئے۔

جواب: اگر میں ادبی مراکز سے دور رہ کر ادب کے مرکزی دھارے میں ہوں تو شاید اس کی بنیادی وجہ تو میری شاعری ہی ہو سکتی ہے جو ادبی مراکز تک پہنچی تو اُس نے وہاں رہنے والے سینئر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے مسلسل مجھے فنون میں شائع کیا۔ اسی طرح انڈیا میں شمس الرحمٰن فاروقی نے شب خون میں میری شاعری کو جگہ دی اور آج آصف فرخی صاحب ''دنیا زاد'' میں میرا کلام بڑے اہتمام سے شائع کرتے ہیں۔ یہ وہ ادبی جرائد ہیں جہاں شائع ہونے کے لیے ایک خاص شعری معیار درکار ہے۔ اسی طرح امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی نے قدم قدم پر میری پذیرائی کی۔ شاکر حسین شاکر اور طاہر نسیم میرے دو ایسے ادبی دوست ہیں جن کے احسانات کا بدلہ میں کبھی چکا نہیں سکتا۔ انہوں نے ہر مقام پر عملاً میرے لیے ایسے حالات پیدا کیے جہاں بطور شاعر مجھے آسانیاں میسر آ سکیں۔ عامر بن علی اور نوید حیدر ہاشمی مجھے اپنے بڑے بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں اور کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جہاں میرے فن کو پذیرائی مل سکے۔ شعیب صادق کا پیار میرا اثاثہ ہے۔ اسی طرح رضی الدین رضی، نوازش علی ندیم، ذاکر حسین ضیائی، افضل گوہر، اختر رضا سلیمی، شکیل جاذب، ناصر علی، شاہد ذکی، کاشف مجید، احمد کامران، افضل خان، حسنین اصغر تبسم، منیر راہی، علی معین، احمد عطا اللہ، خالد مسعود اور بہت

سے دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے جن کی محبتوں کے طفیل میں آج اس مقام پر ہوں۔
سوال: ادب کے فروغ میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے کیا کردار ادا کیا۔
جواب: مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ادب ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی ترجیحات میں کبھی نہیں رہا کسی زمانے میں اخبارات کے ادبی ایڈیشن کسی نہ کسی حد تک ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ مگر اب اکثر اخبارات نے ادبی صفحات ہی شائع کرنا بند کر دیے ہیں یا پھر ادب کے لیے جگہ کم کر دی ہے اور اگر الیکٹرانک میڈیا کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی پی ٹی وی قومی دنوں یا مذہبی تہواروں کے موقع پر مشاعروں کا اہتمام وانصرام کر دیتا ہے اور وہ بھی شعراء کی ایک مخصوص فہرست سے باہر نہیں جاتا۔ البتہ انٹرنیٹ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اُس نے فی الوقت دنیا بھر میں بسنے والے ادیبوں اور شاعروں کی تشنگی کو کسی حد تک کم کر دیا ہے۔ فیس بک ایک ایسا ذریعہ ہے جہاں دُنیا بھر کی ادبی خبریں، ادیبوں اور شاعروں کی مصروفیات، تازہ ترین تخلیقات اور اُن پر ردِ عمل فوری طور پر سامنے آ جاتا ہے لیکن اس میں بھی ایک قباحت ہے کہ رطب و یابس کی بہتات ہے۔ اچھے کلام کی تلاش میں کافی سر کھپانا پڑتا ہے۔
سوال: مشاعروں کا ادب کے فروغ میں کیا کردار ہے؟
جواب: مشاعرے کبھی ہماری تہذیبی روایت کا حصہ تھے اور شاعری کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہونے والے سامعین اور کلام سنانے والے شاعر دونوں اس کے آداب سے واقف تھے۔ اچھے اشعار پر کھل کر داد دی جاتی اور کمزور اشعار پر خاموش رہا جاتا تھا۔ مگر اب سب کچھ بدل گیا ہے۔ اکثر مشاعرے ادبی سے زیادہ معاشی Activity میں تبدیل ہو گئے۔ تقاضوں کے حصول کے لیے جس انداز میں منتظمین کی منتیں کی جاتی ہیں وہ انتہائی شرم ناک ہے۔ مشاعروں میں شریک ہونے کے لیے ہر طرح کا حربہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جب سے غیر ملکی مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا ہے صورتِ حال اور بھی افسوس ناک ہو گئی ہے۔ بہت سے ایسے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں جہاں میزبانوں نے بڑی مشکل سے مہمانوں کو اپنے گھر سے نکالا اور آئندہ کے لیے

مشاعروں سے توبہ کی۔ بیرونِ ملک بہت سے باکمال شعراء بھی مقیم ہیں اور وہ وہاں عمدہ تقریبات کا اہتمام بھی کرتے ہیں مگر انہیں بھی پروفیشنل شاعروں نے تاراج کیا ہوا ہے۔ جن کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر مشاعرے میں شرکت کریں خدا ہم پر رحم فرمائے۔

سوال: ہمارے ادبی ادارے ادب کے فروغ میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: جہاں تک ہمارے ادبی اداروں کا تعلق ہے اکادمی ادبیات پاکستان مقتدرہ قومی زبان، مجلس ترقی ادب اور نیشنل بک فاؤنڈیشن ادب کے فروغ کے لیے اپنے وسائل میں کوشاں ہیں۔ ویسے بھی اس وقت ان اداروں کے بیشتر سربراہان کا تعلق ادب سے ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہمارا ادیب اور شاعر بھی بددیانت ہو جائے تو ادارے کیا کر سکتے ہیں۔ ادیبوں کے معاملات میں میرٹ قائم رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اُن پر اس قدر دباؤ ڈال دیا جاتا ہے کہ ناانصافی خود بخود ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر اکادمی ادبیات وقتاً فوقتاً ادیبوں اور شاعروں کو بیرون واندرون ملک دوروں کے مواقع فراہم کرے تو اثر ورسوخ رکھنے والے شاعر اور ادیب کسی کو آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ اس طرح کتابوں کی اشاعت اور کانفرنسوں میں شمولیت کا معاملہ ہو تب بھی یہ لوگ کسی نہ کسی انداز میں صاحبانِ اختیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سوال: آپ نے نظم بہت کم کہی ہے کیا آپ نظم کے خلاف ہیں؟

جواب: جی نہیں میں بالکل نظم کے خلاف نہیں ہوں۔ اصل میں یہ آپ کے مزاج پر منحصر ہے۔ آپ کہاں سہولت محسوس کرتے ہیں۔ میرے لیے شاید غزل زیادہ آسان ہے سو میں غزل کہتا ہوں۔ میں نے نظمیں بھی کہی ہیں جو خالصتاً میری ذاتی وارداتوں کی کہانیاں ہیں۔ ممکن ہے کسی وقت میں ان میں دوسرے لوگوں کو شریک بھی کرنا چاہوں۔ تو پھر ان کا بھی ایک مجموعہ شائع کردوں گا۔

منیر نیازی

○ تنقید تخلیقی جوہر مانگتی ہے ہمارے ہاں کوئی خاص تخلیقی جوہر والا نقاد پیدا نہیں ہوا۔
○ شاعری میں ہم نا معلوم سے کوئی چیز معلوم میں لاتے ہیں۔
○ تنقید مداری کا کھیل نہیں۔

ارژنگ: شعر کس لیے کہتے ہیں؟
منیر نیازی: کچھ پتہ نہیں ہے کہ شعر کس لیے اور کیوں کہتا ہوں۔
ارژنگ: ہمارے ہاں ناقدین کے کردار سے مطمئن ہیں؟
منیر نیازی: میرے خیال میں ہمارے ہاں ناقدین مکمل طور پر علم سے بے بہرہ ہیں۔انہیں اپنے فن تنقید کی الف ب سے بھی واقفیت نہیں ہے پچھلے باون سالوں میں اورینٹل کالج میں جو تنقیدی رویے پڑھائے جا رہے ہیں یہ اب تک ان سے باہر نہیں نکلے جب کہ اس دوران دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔تنقید تخلیقی جوہر مانگتی ہے لیکن ہمارے ہاں کوئی خاص تخلیقی جوہر والا نقاد پیدا نہیں ہوا۔کسی شخص نے تنقید کا نیا معیار قائم نہیں کیا۔نقاد طے شدہ اصولوں سے باہر ہو تو اس کو رد کر دیتے ہیں۔مغرب میں بھی تنقید ہوتی ہے لیکن ان کا مقصد تخلیق کے حسن و قبیح پر بحث کرنا اور مرکزی خیال کو ڈسکس کرنا ہوتا ہے جو کہ اصلاح و تخلیقی کام ہے۔ ہمارا نقاد یہیں پر غلط ہے۔یہاں دوسرے لوازمات کو پرکھا جاتا ہے حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیکھا جائے کہ شاعر نے کون سا نیا خیال پیش کیا ہے اس کی یہ تخلیق تخیلاتی جمود کو

توڑنے میں کامیاب ہوئی ہے یا نہیں۔ ہمارا نقاد ہائیکو، ماہیا، غزل اور نظم کو ایک معیار پر پر کھتا ہے اور یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا کہ شاعر نے خیال پر کس حد تک زور دیا ہے۔ لیکن ہمارے نقاد کو یہ زحمت کرنا ہوگی اور گہرائی میں جانا ہوگا۔ تعصب کے بغیر بے لاگ فنی تنقید کرنا ہوگی کیونکہ تنقید مداری کا کھیل نہیں ہے۔

ارژنگ: ناقدین کے رائے میں آپ نظم کے شاعر ہیں۔ آپ اس رائے سے متفق ہیں؟

منیر نیازی: میں شعر کہتے وقت شعوری کاوش نہیں کرتا اور نہ کوئی خاکہ ترتیب دیتا ہوں کہ مجھے غزل کہنی ہے یا نظم۔ اس میں یوں ہوتا ہے کہ مجھے انسپریشن (Inspiration) ہوتی ہے اور میں لکھتا ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ میں جو لکھنے جا رہا ہوں وہ حکمرانوں کے جبر کے بارے میں ہو یا اس میں غربت و امارات کے ٹکراؤ کا ذکر ہو۔ میں آزاد ہوں۔ مجھے جو چیز انسپائر کرتی ہے اسی کے بارے میں لکھتا ہوں میں پابند ہو کر نہیں لکھ سکتا۔ فیض صاحب ترقی پسند دور کے بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی تخلیقات پر سوشلزم کا سایہ محسوس کیا جا سکتا ہے کیونکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو لکھنے کے دوران ان کا فرض یاد رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انجمن ترقی پسند کے مقاصد کو اپنی تخلیقات کے ذریعے آگے بڑھایا۔

ارژنگ: تو اس لحاظ سے کیا تمام ترقی پسند شعراء کا کلام توارد کے زمرے میں آتا ہے؟

منیر نیازی: توارد چوری کے زمرے میں آتا ہے۔ میں ترقی پسند شعراء کے کلام کو سرقہ اور توارد کے زمرے میں نہیں لاتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ موضوعاتی شاعری اس ذیل میں نہیں آتی جو گہری شاعری ہوتی ہے جب کہ ترقی پسندوں کی تمام تر شاعری موضوعاتی ہے۔ شاعری میں ہم نامعلوم سے کوئی چیز معلوم میں لاتے ہیں۔ ہیگل، مارکس وغیرہ کے فلسفے کی بنیادیں بھی اس شاعری کی مرہون منت ہیں جو کہ ڈوب کر کی گئی ہے۔

ارژنگ: آپ نے اپنے پنجابی کلام کے اردو ترجمے بھی لکھے ہیں۔ کیا یہ شعوری کوشش نہیں؟

منیر نیازی: جی ہاں میں نے اپنے پنجابی کلام کے اردو ترجمے کیے ہیں۔ یہ شاعری میں خود پر طاری جمود کو توڑنے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ میں ان تراجم سے انصاف نہیں کر سکا۔ میرے کچھ نظموں کے تراجم دوسرے شعراء نے بھی کیے ہیں کئی جگہ یہ

تراجم مجھ سے بہتر ہیں۔

ارژنگ: آپ نے نثر میں دو مختصر پنجابی ڈرامے بھی لکھے جو کافی سراہے گئے۔ باقاعدہ کبھی ڈرامہ لکھنے کا خیال نہیں آیا؟

منیر نیازی: اپنے بچپن میں بزرگوں سے سنے قصوں میں سے دو کو میں نے ڈرامے کی صورت نثر میں لکھا جسے کافی سراہا بھی گیا۔ ان قصوں کو میں نے منظوم بیان کرنے کے بجائے نثر میں اس لیے لکھا کیونکہ میرا خیال ہے اگر میں انہیں شعر میں بیان کرتا تو وہ مصنوعی لگتے۔ جہاں تک باقاعدہ ڈرامہ نہ لکھنے کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ کہوں گا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ جب میں لکھنے بیٹھنے لگتا ہوں مجھے کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ بس ایسی ہی کسی کیفیت میں مجھ سے وہ ڈرامے لکھے گئے۔ دوسرا ویسے بھی مجھے عام کام پسند نہیں جب کہ ڈرامہ ایک عام صنف ہوگئی ہے۔ جس کو دیکھو ڈرامہ لکھ رہا ہے۔

ارژنگ: آپ کے خیال میں ادبی اخبارات، رسائل، اور ادبی ایڈیشن ادب کی کس حد تک خدمت کر رہے ہیں؟

منیر نیازی: ادب کی خدمت تو ایک طرف الٹا یہ سراسر پراگندگی پھیلا رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ ادبی ایڈیشنوں و رسائل کے انچارج وہ لوگ بن گئے ہیں جو ذہنی اور شعری سطح پر نالائق اور نکمے ہیں۔ ہاں البتہ اگر میرٹ پر ان ادبی ایڈیشنوں کے انچارج مقرر کیے جائیں تو صورتحال بہتر ہو سکتی ہے۔ مگر ایک تخلیقی ذہن کا آدمی ان جھنجھٹوں میں نہیں پڑے گا۔

ارژنگ: اپنے اب تک کے کام سے مطمئن ہیں؟

منیر نیازی: میں قسمت، مقدر اور مقسوم کا قائل ہوں۔ میرے حالات نے مجھے شاعر بنا دیا۔ میں ہشیارپور کا مہاجر ہوں۔ میں نے منٹگمری (ساہیوال) میں بکسٹال بنایا، سات رنگ کے نام سے مجلہ نکالا، ارژنگ پبلشرز کے نام سے پبلشنگ ادارہ قائم کیا۔ اب سوچتا ہوں کہ اگر ان چکروں میں نہ پڑتا تو شاید مالی لحاظ سے آسودہ ہوتا۔ میں گھر سے کسی اور کام کے لیے نکلا تھا لیکن میرے راستے میں شاعری آگئی یہ کام مجھے پسند آگیا۔ اب تک میری سولہ کتابیں آچکی ہیں۔ میں نے بہت لکھا ہے لیکن مجھے تسکین نہیں ہوتی مجھے اور لکھنا ہے۔ گھر کے گورکھ

دھندوں سے فرصت نہیں ملتی لیکن اس کے باوجود لکھنا میری مجبوری ہے جلد ہی میرا نیا شعری مجموعہ ''دُھوپ کا چوکور ٹکڑا'' منظر عام پر آ رہا ہے۔

ارژنگ: سرکاری ادبی اداروں کے کردار سے مطمئن ہیں؟

منیر نیازی: بالکل نہیں، کچھ لوگوں نے اپنی سیاسی وابستگیوں اور اثر رسوخ استعمال کر کے یہ ادارے بنوائے ہیں اور اب یہ لوگ گدھوں کی طرح ان پر قابض ہو کر ان کو نوچ رہے ہیں۔

ارژنگ: ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں کیا رائے ہے اور یہ کہ آپ کا تعلق کس گروہ سے ہے؟

منیر نیازی: ہم ایک منتشر صورت حال میں رہ رہے ہیں۔ قیاس میں زندہ رہنے کے لیے گروہ بندی ضروری ہے۔ اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ میرا کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ دیگر شعبوں کی طرح اس شعبے میں بھی ایک مافیا سرگرم ہے۔ یہی وجہ ہے پرائڈ آف پرفامنس اور ستارہ امتیاز جیسے تمغوں کی فراوانی ہے یقین جانیے اس صورتحال میں مجھے اپنے ستارہ امتیاز پر شرم آنے لگی ہے۔

ارژنگ: خواتین شاعرات میں سے کس نے متاثر کیا؟

منیر نیازی: ہمارے ہاں بے شمار شاعرات لکھ رہی ہیں۔ ان میں شمیم اختر اورکزئی، فاطمہ حسن اور فہمیدہ ریاض کی نظمیں متاثر کرتی ہیں۔ غزل میں شبنم شکیل اور شاہدہ حسن بہتر غزل لکھ رہی ہیں۔

منو بھائی

- ٹی وی ڈرامہ ابھی کمرشل بریک کے دور میں ہے۔
- موجودہ پاکستان قائداعظم، علامہ اقبال اور قائدعوام ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں ہے۔
- میرے والد نے بھگوت گیتا اور ماموں شریف کنجاہی نے قرآن مجید کا پنجابی ترجمہ کیا۔

س: اپنی زندگی کے ابتدائی سفر کے متعلق کچھ بتائیں۔

منو بھائی: میری پیدائش ۶ فروری ۱۹۳۳ء کی ہے۔ یہ وہی دن ہے جب جرمنی میں ہٹلر کی چانسلر شپ ہوئی۔ میرا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس سے ہے۔ میرے والد ریلوے میں ملازم تھے۔ اُس دور میں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ تحریک آزادی ابھی باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوئی تھی لیکن لوگوں میں شعور بڑھ رہا تھا۔ میرے دادا امام مسجد تھے لیکن اُن کا پیشہ کتابوں کی جلد بندی تھا۔ امامت اُن کا پیشہ نہیں تھا۔ وہ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ اُن کا نام میاں غلام حیدر تھا۔ انہوں نے گیتا کا پنجابی ترجمہ بھی کیا تھا۔ وہ مہاراجہ کشمیر کے فارسی کے اتالیق بھی رہے۔ پنجابی کے ممتاز لکھاری شریف کنجاہی میرے ماموں تھے۔ انہی کی وجہ سے میرا ترقی پسندوں سے تعلق بنا جن میں احمد ندیم قاسمی بھی شامل ہیں جن کو میرے بارے میں علم تھا کہ گھر میں مجھے منو کہا جاتا ہے۔ انہوں نے میرا نام منو بھائی رکھا اور امروز میں میری نظم چھاپی۔

س: بچپن کن شہروں میں گزرا اور اخبار میں کیسے لکھنا شروع کیا؟
جواب: میری پیدائش وزیر آباد کی ہے۔ اس کے بعد راولپنڈی اور پھر لاہور میں وقت گزرا۔ بچپن میں راولپنڈی سے ''تعمیر'' اخبار نکلتا تھا جس میں لکھنے کی ابتدا کی۔
س: ''سونا چاندی'' آپ کا ایک یادگاری ڈرامہ ہے جس کے بعد اب ایک عرصہ سے آپ نے ٹی وی کے لیے ڈرامہ نہیں لکھا اس کی کوئی خاص وجہ؟
جواب: موجودہ دور میں ٹی وی پر کمرشل بریک آیا ہوا ہے جس میں ہمارا کوئی کام نہیں۔ اب یہ بریک ختم ہونے والا ہے۔ وہ ڈرامہ جو اشفاق احمد کے ساتھ قبر میں اُتر گیا تھا وہ دوبارہ شروع ہونے والا ہے۔ اب میں جیو کے لیے سونا چاندی اینڈ کمپنی کے نام سے دوبارہ ڈرامہ لکھ رہا ہوں جس میں گلیمر کی بجائے اصل کرداروں کو سامنے لاؤں گا جو معاشرے کی اصل تصویر ہیں۔
س: پنجابی کے علاوہ اور کس زبان میں شاعری کی؟
جواب: میں نے شاعری پنجابی زبان میں ہی کی ہے اور وہی میری پہچان بنی ہے اور اس شاعری پر مجھے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ملا ہے۔ میرا پنجابی مجموعہ ''اجے قیامت نہیں آنی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔
س: شاعری کے لیے آپ نے پنجابی زبان کا ہی انتخاب کیوں کیا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟
جواب: پنجابی میری مادری زبان ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے لیے اپنی ماں بولی میں اظہار زیادہ آسان ہے۔ میں نے اس حوالے سے فیض صاحب سے بھی مشورہ کیا تو انہوں نے کہا ''خواب کس زبان میں دیکھتے ہو؟''

تو میں نے کہا ''پنجابی میں۔''

انہوں نے کہا ''بس پھر پنجابی میں ہی لکھو۔''

س: شاعری، ڈرامہ نگاری اور کالم نگاری میں آپ کو کون سا تعارف زیادہ پسند ہے۔
جواب: ڈرامے میں میری پذیرائی بہت زیادہ ہوئی لیکن میرے خیال میں کالم نگاری میں، میں بہتر انداز میں اظہار کرسکتا ہوں۔
س: ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبدار ہونا کس حد تک ضروری ہے؟

جواب: میرے خیال میں ایک کالم نگار کے لیے غیر جانبداری ممکن نہیں ہے۔ اگر میں جانبدار نہیں تو کالم نگاری کیوں کر رہا ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے بے انصاف نہیں ہونا چاہیے۔ جو چور کے خلاف، جہالت کے خلاف ہے نا انصافی کے خلاف ہے وہ غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ کالم نگار کو چاہیے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو انصاف سے کام لے۔

س: آج کے دور میں ترقی پسند تحریک کا وجود ہے؟

جواب: آج ترقی پسند تحریک اپنے اس انداز میں تو موجود نہیں لیکن وہ لوگ جنہوں نے اُس دور میں اس تحریک کے انداز کو اپنایا وہ آج نامور حیثیت میں موجود ہیں۔

س: اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: جو بھی انسان کی محرومی، خواہشوں، آرزوؤں کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ وہ منٹو ہو، فیض ہو یا انتظار حسین ہو۔ میرے خیال میں ہر وہ لکھنے والا جو انسان کے حق کی بات کرتا ہے وہ ترقی پسند ہے۔ ان معنوں میں میں انتظار حسین کو بھی ترقی پسند سمجھتا ہوں۔

س: پاکستان کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: ہمیں ماضی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ جبکہ ہم مستقبل کی طرف جانا چاہ رہے ہیں۔ یہ جو انتہا پسندی جیسے رویے ہیں یہ ہمیں ماضی کی طرف لے جانے والے رویے ہیں۔ میرے خیال میں بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کی یہ آخری ریل چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل راستے کی طرف واپس آئیں گے اور پاکستان کی تعمیر اصل معنوں میں کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی تحریک پاکستان چل رہی ہے۔ آج کا پاکستان قائداعظم، علامہ اقبال اور قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان نہیں۔

س: رمشا کیس کے حوالے سے آپ کا کیا موقف ہے؟

جواب: پہلی دفعہ یہ ہوا ہے کہ ہمارے علماء نے حق اور انصاف کی بات کی ہے۔ ایک ایسی بچی کے بارے میں جو کہ ذہنی طور پر نارمل نہیں یہ کہنا کہ وہ توہین قرآن کی مرتکب ہوئی ہے اپنی جگہ خود ایک ابنارمل رویہ ہے۔ پہلی دفعہ اس کیس میں نظر آ رہا ہے کہ جج بغیر کسی دباؤ کے فیصلہ کر سکیں گے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہم ہندوستان میں خود ایک اقلیت تھے۔ آج ہمیں اقلیتوں کو تنگ کرتے وقت شرم محسوس کرنی چاہیے۔

مشتاق یوسفی

- اُردو ارتقا پذیر ہے یہ اپنے طریقے خود بنائے گی۔
- محاورہ بولی جانے والی زبان سے بنتا ہے نہ کہ معدوم زبان سے
- صرف لوگوں کی پسند کا خیال رکھ کر لکھی جانے والی چیز کی عمر کم ہوتی ہے۔

ارژنگ: اُردو میں مزاح نگار کچھ کم نہیں؟
مشتاق یوسفی: ڈنک مارنے والے کم ہی ہونے چاہئیں۔
ارژنگ: آپ کی تحریر میں بعض لوگوں پر جارحانہ جملہ بازی ہوتی ہے۔ایسا کیوں؟
مشتاق یوسفی: میں نے اپنی تحریر میں کسی پر حملہ نہیں کیا۔ کیونکہ میں شاید جوابی حملے کی تاب نہیں رکھتا۔ پھر یہ بھی کہ تحریر میں تلخی آ جائے یا قلم کو طیش آ جائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔ یہ چیز نعرہ وغیرہ ہو جاتی ہے یا کچھ اور شکل اختیار کر لیتی ہے۔
ارژنگ: آپ نے ابوالکلام آزاد کی نثر کو جناتی زبان قرار دیا۔ کیا یہ زیادتی نہیں؟
مشتاق یوسفی: مولانا ابوالکلام آزاد مذہبی عالم بھی تھے اور ادیب بھی۔ میں نے ادیب کی حیثیت سے بات کی تھی اور ان کی نثر کو جناتی قرار دیا تھا۔ مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) تو اس بنا پر ان کو سب سے بڑا اُردو دشمن کہہ گئے ہیں۔ کیونکہ ان کے بقول اس طرح کی اُردو اصل میں اُردو کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ میں بھی مولوی عبدالحق کا حامی ہوں اسی طرح میں آج کے دور میں میر امن اور رتن ناتھ سرشار کی زبان لکھنے کے بھی خلاف ہوں۔ یہ تو ایسے ہی ہوگا کہ آج کی دُلہن کا سنگھار سو سال پہلے کی دُلہن کی طرح کیا جائے یعنی اسے آ

ملے کا تیل لگا کر چمکا یا جائے تو کیا ایسی دلہن کو آج کا دولہا قبول کرے گا۔

ارژنگ: تو پھر اُردو کے معیاری نمونے کیا ہوں گے؟

مشتاق یوسفی: ہمارے لیے نثر کے عمدہ نمونے سر سیّد احمد خان، مولوی عبدالحق، سعادت حسن منٹو، غلام عباس اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کی تحریروں میں ہے۔ بیدی کبھی کبھی اُردو لہجے سے انحراف کرتے ہیں مگر ان کی تحریر جاندار بہت ہے۔ اس لحاظ سے میں اسے پہلے نمبر پر رکھتا ہوں۔ جبکہ کرشن چندر کو چھٹے نمبر پر بھی نہیں رکھتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے اور میری رائے کی بہر حال زیادہ اہمیت نہیں۔ کیونکہ میں محقق یا نقاد نہیں ایک عام قاری ہوں۔ میں تو فارسی بھی نہیں جانتا اسی لیے کہتا ہوں کہ میری رائے ایک عام قاری کی رائے ہے۔

ارژنگ: آپ نے کچھ عرصہ قبل دبستان لاہور کو مستند کہا تو یہ بات مذاق میں کہی یا؟

مشتاق یوسفی: میں نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی۔ زبان جامد شے نہیں ہوتی اس میں تغیر آتا رہتا ہے۔ ہم بنا بنایا سانچہ پیش کر کے لوگوں کو اس کا پابند نہیں کر سکتے۔ اُردو کا فروغ گزشتہ ستر سال سے پنجاب میں ہو رہا ہے۔ وہاں بہترین شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں۔ وہاں کے ناشرین تو آزادی سے پہلے بھی نمایاں تھے۔ اس لیے اب اُردو کا محاورہ وہیں بنے گا۔ ممکن ہے یہ محاورے نئے لگیں مگر اُردو ادب میں اب یہ جذب کرنا ہوں گے۔ مگر یہ انجذاب فطری ہوگا تو کامیاب ہوگا۔ انگریزی زبان جہاں گئی وہاں اس میں تبدیلی ہوتی رہی۔ انگریزی نے برصغیر سے ہزاروں الفاظ لیے (اس پر چھ سو الفاظ کی ایک مکمل ڈکشنری تیار ہو چکی ہے) ماضی میں دلی اور لکھنؤ اُردو کے مراکز تھے مگر اب تو لکھنؤ میں کوئی سائن بورڈ بھی اُردو میں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ نہ ہی وہاں کے بچے اُردو پڑھنے کے عادی ہیں۔ اب اُردو ویسی ہی بولی جائے گی جیسا کہ اس کو استعمال کرنے والے بولیں گے اور ظاہر ہے پنجاب اس میں نمایاں ترین ہے۔ مستقبل میں بھی پنجاب میں اس کا فروغ نظر آ رہا ہے۔ انگریزی میں ویسٹ انڈین کا یعنی جیمیکن کا لہجہ اپنا اور آکسفورڈ کا اپنا ہے۔ ہر جگہ ایک سا لہجہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس نظریے پر اپنی کتاب ''آبِ گم'' میں لوک لہجہ کے نام سے ایک پیراگراف لکھا ہے۔ میرے نزدیک اُردو کا ہر لہجہ لطف دیتا ہے اور یہی سب کچھ برقرار رہنا چاہیے۔ میرا امن یار جب علی سرور کا لہجہ اپنانے پر ہر کسی کو کا مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو ارتقاء

پذیر ہے۔ یہ اپنے طریقے خود بنائے گی۔ اس پر تردّد کی ضرورت بھی نہیں۔ اب کلاسیکی زبان کے محاورے ختم ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنی تحریر میں ایک جگہ ایک محاورہ ''رنجک چاٹنا'' لکھا تو افتخار عارف کو عجیب لگا تھا۔ حالانکہ ہمارے بچپن میں یہ محاورہ عام تھا۔ اُردو میں محاورے اور ترکیبیں وغیرہ اسی طرح بنتے بگڑتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ اب لفظ خلفشار ہے تو اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے مگر یہ مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خلل اور فشار سے مل کر بنا ہو۔ اس طرح سنسنی خیز بھی غلط ہے مگر مستعمل ہے۔ جوش ملیح آبادی لفظ رہائش کے خلاف تھے مگر اس کا استعمال جاری ہے اور یہ سب الفاظ اچھے بھی لگتے ہیں۔ گرائمر کے مطابق لفظ ادائیگی کے بجائے ادائی ہونا چاہیے مگر ادائیگی مروّج ہے اور بھلا لگتا ہے۔ ویسے پاکستان میں اُردو کی حیثیت میں تضاد ہے۔ اس پر اکیڈمی آف لیٹرز میں بھی بحث رہی تھی۔ میری رائے میں محاورہ بولی جانے والی زبان سے بنتا ہے نہ کہ معدوم زبان سے۔ پاکستان میں موجودہ اُردو وہی ہوگی جو بولی اور لکھی جائے گی۔ اُردو کی سند اب قلعہ معلیٰ سے نہیں لاہور کے قلعے سے لی جائے گی۔ کیونکہ کروڑوں اہل پنجاب اب لہجہ اپنا رہے ہیں اور وہاں سے یہ اُردو ہر جگہ پھیل رہی ہے۔ البتہ پوری طرح اس کا انجذاب آہستہ آہستہ ہوگا۔

ارژنگ: آپ کی اتنی گہری دلچسپی کس وجہ سے ہے؟

مشتاق یوسفی: مجھے لفظوں کی تلاش اور کھوج میں مزا آتا ہے۔ اس سے اور کئی الفاظ کی گرہیں کھلتی ہیں۔ مثلاً جس کھیت میں بیج ڈالے جائیں یا نئے نئے پودے نکلے ہوں تو وہاں ان کو پرندوں سے بچانے کے لیے صلیب نما ڈھانچے پر قمیض ڈال دی جاتی ہے تاکہ پرندے اسے انسان سمجھ کر اس سے ڈریں اور دور رہیں تو مجھے اس کا نام نہیں آتا تھا۔ پتہ چلا کہ اُردو میں اسے الگ الگ نام دیے جاتے ہیں۔ پنجابی میں اسے بڈاوا بھی کہتے ہیں اور کچھ اور بھی۔ اس طرح میں نے ایک لفظ بکھا ہریال عورت میرے علم کے مطابق یہ پنجابی اصطلاح ہے مگر بہت سے پنجابیوں کو اس کا پتہ نہیں۔ اُردو میں اس کا متبادل ہرا چک بتایا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت پاکستان میں زبان کی تحقیق کے معاملے میں سب سے بڑی سند مشفق خواجہ اور شان الحق حقی ہے۔ میں اکثر و بیشتر اُنہی سے سند لیتا ہوں۔

ارژنگ: اب آپ کے ہاں لفظوں میں اختراعی پہلو بہت زیادہ ہے جو پہلے نہیں تھا۔ آپ لفظوں سے یہ تخریب کاری کیوں کرتے ہیں؟

مشتاق یوسفی: لفظوں سے کھیلنا پرانی عادت ہے۔ اودھ پنچ والے یہی کرتے تھے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ صرف لفظوں کا کھیل نہ ہو بلکہ ساتھ فکر بھی ہوتا کہ ہنسنے کے ساتھ ساتھ قاری کچھ سوچے بھی۔ اس طرز میں جو میرے نظریات جھلکتے ہیں ان کو ایک عام آدمی کے نظریات سمجھیں۔ میں کتابوں کا عاشق ہوں۔ میری لائبریری میں دس ہزار سے زائد کتب ہیں۔ مطالعے کا عاشق ہوں مگر میں ہر کتاب کو فرض سمجھ کر نہیں پڑھتا بلکہ جو پسند نہ آئے اسے پڑھتا ہی نہیں۔

ارژنگ: طنز و مزاح کے ساتھ آج کے قاری کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟

مشتاق یوسفی: یہ تو قارئین بتائیں گے ہم تو لکھتے جا رہے ہیں۔ میرے مشاہدے کے مطابق کراچی، لاہور اور لندن کے اُردو کے قارئین میں یہ صنف کافی مقبول ہے۔ سنجیدہ نثر سے مزاحیہ نثر زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ شاید اسی وجہ سے گزشتہ دنوں کراچی میں مجھ سے ایک مصور نے اپنی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کرایا کہ میری وجہ سے لوگ زیادہ آئیں گے۔

ارژنگ: آپ کی نئی تصنیف کب آ رہی ہے؟

مشتاق یوسفی: نئی کتاب تیار ہے۔ مگر میں کتاب لکھ کر تین چار سال تک پڑی رہنے دیتا ہوں اور پھر اس کی خواندگی کر کے خامیاں دور کرتا ہوں۔ سو یہ کتاب آج کل اسی مرحلے میں ہے۔

ارژنگ: آپ نے کس سے متاثر ہو کر لکھنا شروع کیا؟

مشتاق یوسفی: میری والدہ میمک تھیں یعنی دوسروں کے لہجے کی بڑی اچھی نقل کر لیتی تھیں۔ وہیں سے مجھے تحریک ملی اور جب کبھی آ جائے تو آتی ہی چلی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔

ارژنگ: شاعروں میں افتخار عارف بہت متاثر کر رہا ہے۔ جب کہ عطاء الحق قاسمی سے اچھا کالم کوئی نہیں لکھ رہا۔ زبان و بیان کی تحقیق میں شان الحق حقی اور مشفق خواجہ سب سے نمایاں ہیں۔

ارژنگ: آپ کا اپنے فن کے معیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟
مشتاق یوسفی: مجھے اپنے بارے میں کوئی مغالطہ نہیں۔ مکمل نئی تخلیق کوئی نہیں کرسکتا۔ ہر بات پہلے ہو چکی ہوئی ہے۔ بس اس کو ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں لکھ رہا ہے۔ میرا تخلیقی سیکرٹ یہ ہے کہ جب میں کسی موضوع پر لکھتا ہوں تو پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ لوگ اس پر کیسے لکھتے ہیں۔ پھر میں یہ کرتا ہوں کہ ان کے اسالیب کو نظرانداز کر کے نیا پن لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی میں اس میں کامیاب ہو جاتا ہوں تو کبھی ناکام۔ میں پہلے سامعین میں اپنی تحریریں سناتا نہیں تھا پھر سنانا شروع کر دیا۔ میں نے ٹی وی کے لیے بھی کچھ نہیں لکھا۔ ویسے اگر نثر میری ہی طرح پڑھ کر سنائی جائے تو اس کا انجام بھی آج کل کے مشاعروں جیسا ہی ہوگا۔ پہلے مشاعروں کے لیے شاعر اپنی سطح سے گفتگو کرتا تھا اب وہ یہ دیکھتا ہے کہ لوگ اس کو کیسے لیں گے۔ پھر وہ ویسا ہی لکھتا ہے۔ اس سے معیار میں کمی آئی ہے۔ صرف لوگوں کی پسند کا خیال رکھ کر تیار کی جانے والی چیز کی عمر کم ہوتی ہے۔ سو میں جب لکھتا ہوں تو قاری کے ردعمل کی پروانہ کرتے ہوئے لکھتا ہوں۔ البتہ کہیں کچھ سنانا ہو تو پھر سچی بات ہے کہ میں سامعین کا کچھ خیال کر کے لکھتا ہوں اور یہ ہر شہر کے لیے الگ الگ ہوتا ہے۔ کیونکہ جو چیزیں دوحہ میں پسند کی جائیں ضروری نہیں کہ وہ ساہیوال میں بھی کامیاب رہیں۔

ارژنگ: آپ اپنی کتابوں میں تصویر کیوں نہیں دیتے؟
مشتاق یوسفی: ''چراغ تلے'' کے پہلے ایڈیشن میں تو دی تھی پھر نہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میں کہ اپنی تصویریں سنبھال کر رکھتا ہی نہیں۔ سوغات میں میرے لیے خصوصی گوشہ شائع کرنا تھا مگر ان کو اپنی تصویر فراہم نہ کرسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گوشہ تو شائع ہوا مگر اس کا اداریہ میرے خلاف لکھ دیا گیا۔ فوٹوگرافی حالانکہ میرا شوق ہے مگر میں صرف تصویریں کھینچتا ہوں، کھنچواتا نہیں۔ اس حوالے سے میں نے ایک بار لکھا بھی تھا کہ اپنی صورت دیکھ کر خدا پر میرا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ میں نے آخری تصویر غالباً 1976ء کی کھنچوائی ہوئی ہے۔ بعد میں نہیں کھنچوائی۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ قرۃ العین حیدر کی طرح میں بھی اپنی تصویر دیکھنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ (قرۃ العین بھی نئی تصویر نہیں بنواتی بلکہ کتاب پر پرانی تصویر ہی دے دیتی ہیں) مگر عورتوں کو بہرحال اس طرح کے حربوں کا حق حاصل ہے۔

محمد اکرم اعوان

○ جس میں کسی انسان کا بھلا ہو وہ کام کرنا چاہیے۔
○ شعر کسی بھی شاعر کے مزاج کا عکس ہوتا ہے۔
○ تخلیقی کام کرنے والوں میں استعداد فطری ہوتی ہے۔

چٹان: کب سے شاعری کر رہے ہیں؟
محمد اکرم اعوان: مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میں نے شعر کہنا کب شروع کیا لیکن یہ یاد ہے کہ میرا شعری مجموعہ ۸۰ء کی دہائی میں شائع ہوا۔
چٹان: کس شاعر نے متاثر کیا؟
محمد اکرم اعوان: شاعری میں دو شعبے ہوتے ہیں۔ صوفیانہ شاعری اور دنیاوی شاعری، صوفیانہ شاعری ایک خاص سٹیج پر آتی ہے۔ اس سٹیج پر یکسوئی اور قلب میں مخصوص صلاحیتیں دوسروں سے زیادہ ہو جاتی ہیں۔ اس میں شاعر دوسروں کی تکلیفیں اور حالات اپنی ذات کے پردے میں بیان کرتا ہے۔ جس سے پڑھنے والے پر گہرا اثر ہوتا ہے اور اس کو وہ شاعری اپنے دکھوں، تکلیفوں اور ذات کا عکس لگتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شاعر وہ ہیں جو عام آدمی کے مقابلے میں فطری طور پر تو زیادہ حساس ہوتے ہیں مگر وہ جو شاعری کرتے ہیں اس میں نسبتاً وہ گہرائی اور تاثیر نہیں ہوتی جو صوفیانہ شاعری کی خاصیت ہے۔ جس طرح کہ فلمی گیت بن جاتے ہیں یا اس طرح کی اصناف کی دیگر چیزیں وہ اس میں آتے ہیں۔ ہمارے ہاں شعراء کا بیشتر طبقہ اس میں آتا ہے۔ اس طرح جب آپ پسندیدہ

شاعر کا پوچھتے ہیں تو اس کا جواب میں کچھ یوں دوں گا کہ ذکر اذکار طلب الہیٰ اور تصوف سے ہٹ کر جو شاعری ہے اس میں عہد کا سب سے بڑا شاعر فیض احمد فیض ہے اور جو شاعری تصوف کی آخرت کی یا حب الہیٰ کی ہے اس میں علامہ اقبال میرے پسندیدہ ہیں۔

چٹان: کلاسیکی شاعروں میں آپ نے شاہ حسین اور وارث شاہ کو بھی پڑھا ہوگا۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کیا آپ ان کو صرف شاعر سمجھتے ہیں یا صوفی شاعر؟

محمد اکرم اعوان: جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ دونوں بہت بڑے صوفی شاعر ہیں۔ جہاں تک شاہ حسین کے آخری عمر میں شریعت سے ہٹنے کی بات ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ صوفیوں پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب انھیں وہ روحانی کیفیات میسر آ جاتی ہیں جو ان کی جسمانی برداشت سے باہر ہوتی ہیں۔ وہاں جا کر ان کی عقل ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ تصوف کی زبان میں ان کو مجذوب کہا جاتا ہے یعنی ان پر جذب وارد ہو جاتا ہے اور جذب وارد کمال نہیں بلکہ صوفیوں کے نزدیک کمزوری ہے۔ کسی نبی پر کبھی جذب وارد نہیں ہوا کیونکہ نبی کامل ہوتا ہے۔ کوئی نبی مجذوب نہیں ہوا۔ ہر نبی ساری کیفیات سے گزرتا ہے مگر مجذوب نہیں ہوتا عام آدمی مجذوب کو کامل سمجھتا ہے لیکن صوفیوں کے نزدیک مجذوب ہونا کمزوری ہے۔ مجذوب پاگلوں میں شمار ہوتا ہے۔ مجذوب ہونے کے بعد شرعی طور پر اس کے اعمال شمار نہیں ہوتے اس لئے مجذوب ہونے کے بعد ان سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں ان کو زیر بحث نہیں لانا چاہیے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کیونکہ شریعت کسی صاحب عقل کو اس کے اتباع کی اجازت نہیں دیتی۔

چٹان: آپ کی شاعری میں ہجر و فراق کے مضامین زیادہ ملتے ہیں اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟

محمد اکرم اعوان: اصل بات یہ ہے کہ جتنے اللہ اللہ کرنے والے لوگ ہیں ان پر وصال کے لمحات بہت کم آتے ہیں۔ جس میں وہ راحت محسوس کریں گے کیونکہ انسانی زندگی میں بے شمار مصروفیات ہیں جو اسے وصال کی کیفیات سے الگ رکھتی ہیں اس لئے ہمارے بہت سے صوفیوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ترک دنیا کر کے جنگلوں میں نکل گئے کیونکہ وہ اس کیفیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن شریعت انسان پر مسلط ہے کسی ایک کیفیت کے لئے معاشرے کو چھوڑ دینا یہ اس کی کمزوری ہے اور میں نے یہ دیکھا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے

نامور بزرگان دین جب وہ دنیا سے الگ ہوئے تو مقامات تصوف میں جس مقام پر وہ دنیا سے الگ ہوئے اس میں آگے ترقی نہیں ہوئی کیونکہ ترقی محتاج تھی دنیا میں رہ کر عمل کرنے کی جب دنیا سے الگ ہوئے اس میں آگے ترقی نہیں ہوئی ایک طرح سے اعمال وہاں جا کر رک گئے تو یہ جو فراق کی کیفیات ہیں اسی سے گھبرا کر یہ لوگ دنیا سے الگ ہوتے ہیں۔ اسے سہنا اسے برداشت کرنا اس میں رہنا اس میں جینا اصل کمال ہے۔ یہ اللہ کی توفیق ہوتی ہے جنہیں وہ عطا کرتا ہے وہ اس ہجر و فراق کی کیفیت کو جھیلتے رہتے ہیں اور دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ عام آدمی کو جب ہم متوجہ کرنا چاہتے ہیں تو ہماری نظر میں کیونکہ وہ فراق میں ہے مگر اسے اس کا احساس نہیں اللہ کی ذات سے دوری اور اس کی یاد سے محرومی ایک ایسی کیفیت ہے جو فراق کی ہے۔ مگر ایسا مرض ہے جس کا احساس مریض کو نہیں ہے۔ تو ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو احساس ہو کہ میں کس کیفیت میں ہوں۔ ہوسکتا ہے پھر وہ اس سے نکلنے کی سعی کرے۔

چٹان: عام لفظوں میں ہجر و فراق کی اس کیفیت کو ہم بے چینی یا بے سکونی کہہ سکتے ہیں۔ جس کا تقریباً سارا معاشرہ شکار ہے۔

محمد اکرم اعوان: بالکل ہم اس کو بے چینی یا بے سکونی کا نام دے سکتے ہیں کہ آدمی سبب نہیں جانتا لیکن وہ اکثر بے سکون یا بے چین رہتا ہے لیکن جب اس کو یاد الٰہی کا راستہ مل جاتا ہے یا اس پر کچھ لمحات ایسے گزرتے ہیں جب وہ خود کو اللہ کو پاس پاتا ہے تو اسے قرار آجاتا ہے۔

چٹان: آپ نے نثر بھی لکھی ہے۔ نثر اور شعر میں سے ابلاغ کا بہترین ذریعہ کس کو خیال کرتے ہیں؟

محمد اکرم اعوان: میں نے جو نثر لکھی ہے وہ زیادہ تر مذہبی موضوعات کے متعلق ہے یا پھر میں نے دیار غیر کے جو سفر کئے ہیں وہاں کی معاشرت کے بارے بیان کیا ہے ان کے علاوہ نثر بہت کم لکھتا ہوں۔ کسی خاص موضوع پر مضمون لکھنا پڑا تو لکھ لیا ورنہ میں زیادہ تر شعر کہنے میں سہولت محسوس کرتا ہوں۔

چٹان: آپ کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ آپ نے شکار میں چیتے بھی مارے ہیں۔ شاعروں کے حوالے سے ڈینگیں مارنا تو سنا تھا۔ مگر جرات اور بہادری کا عملی مظاہرہ شاید ہی کسی شاعر نے کیا

ہو۔اس تناظر میں کسی شاعر کے لئے چیتا مارنا کیا ایک مختلف اور انوکھا کام نہیں؟
محمد اکرم اعوان: میری زندگی میں جو شعبے فی الوقت چل رہے ہیں وہ تقریباً سولہ سترہ کے قریب ہیں جو سارے ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ یہ مجھے بھی سمجھ نہیں آتی کہ میں کیسے چلا رہا ہوں لیکن الحمدللہ چل رہے ہیں اور ان کا آپس میں کوئی ربط نہیں بنتا مثلاً یہی شعر کہنا اور شکار کرنا یا بزنس کرنا اور جہاں گردی بھی کرنا۔تو یہ سارے الگ الگ شعبے ہیں لیکن زندگی کے شعبے ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ فرصت کا جو لمحہ ملے اسے استعمال کرنا چاہیے اور تخلیقی کام جتنے بھی ہو سکتے ہیں جس میں کسی ایک انسان کا بھلا ہوتا ہے وہ کام کرنے چاہئیں۔
چٹان: ادب برائے ادب،،یا،،ادب برائے اصلاح، میں سے کس نظریے پر یقین رکھتے ہیں؟
محمد اکرم اعوان: دیکھیں جی شعر کسی بھی شاعر کے مزاج کا عکس ہوتا ہے۔شعر کو آپ تقسیم کر کے نہیں کہہ سکتے کہ ایک شاعر کا مزاج سنگین ہے اور وہ بات اصلاح کی کرے۔ایک آدمی ایسا ہے اس کو اصلاح احوال کی فکر ہے اپنی بھی دوسروں کی بھی وہ عشق و محبت کا شعر بھی کہے گا تو اس میں کہیں نہ کہیں کوئی اصلاح کا پہلو نظر آئے گا۔شاعر کا جو مزاج ہے وہ شاعری میں منعکس ہوتا ہے۔
چٹان: بقول معروف شاعر خالد احمد، خوبصورت شکل وصورت کا انسان کسی اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔اس کے مقابلے میں کم شکل لوگ اپنی شخصیت کی کمی دور کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں جیسے شعر کہنا، افسانہ لکھنا، کالم نگاری وغیرہ۔ااس تناظر میں آپ اس سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں کہ تخلیق کار احساس کمتری کا شکار ہیں؟
محمد اکرم اعوان: میرا خیال نہیں کہ ایسا ہے۔احساس کمتری کا شکار کوئی تخلیقی کام کر ہی نہیں سکتا۔میری رائے میں جو بندہ احساس کمتری کا شکار ہوگا اس کے لئے نارمل زندگی بسر کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے وہ کوئی تخلیقی کام کیسے کرے گا۔تخلیقی کام کرنے والے جو لوگ ہوتے ہیں ان میں ایک خاص استعداد ہوتی ہے اور یہ بالکل فطری ہوتی ہے۔
چٹان: آپ نے شاعری میں کسی سے باقاعدہ اصلاح لی؟
محمد اکرم اعوان: میرا ایک عجیب مزاج ہے کہ میں جو لکھ دیتا ہوں اس کو کاٹتا نہیں ہوں۔میں نے کبھی رف لکھ کر نیٹ نہیں کیا۔کبھی کسی سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی۔کتاب چھپنے جاتی ہے

تو دوست احباب خود ہی اسے دیکھ لیتے ہیں۔اس میں گا، گے، گی، کوئی اوپر نیچے ہو تو ٹھیک کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی میں باقاعدہ شاعر نہیں ہوں مزاج میں کوئی بات آجاتی ہے تو اسے ربط میں لا کر شعر کہہ دیتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ دوسرے تک میری بات کا ابلاغ ہو جائے۔ وہ شعری اصناف پر پوری اترتی ہے یا نہیں میں ان چکروں میں نہیں پڑتا نہ ہی مجھے کوئی شاعر ہونے کا دعویٰ ہے۔بس یہ خیال رکھتا ہوں کہ دوسرے تک بات سلیقے سے پہنچ جائے۔ورنہ باقاعدہ شاعری کے لئے اصلاح ضروری ہے لیکن مجھے ایسا کوئی شوق نہیں لیکن الحمداللہ ایک بار جو لکھ دیا اس کو کاٹنا نہیں پڑا۔

چٹان: آپ کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ آپ باقاعدہ طور پر دنیاوی و دینی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن آپ کے ادبی و علمی کارناموں سے یہ بات بالکل عیاں نہیں ہوتی اور قرآن پاک کی تفسیر لکھنا تو خیر آپ کا بہت بڑا کام ہے۔

محمد اکرم اعوان: میں نے باقاعدہ پڑھا نہیں ہے بلکہ میں نے جب ایف اے میں داخلہ لیا تو حالات ایسے ہو گئے کہ مجھے کالج چھوڑنا پڑا اور کسی دینی و دنیاوی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔بس جو ذہن میں آتا ہے لکھ دیتا ہوں۔تیس پارے قرآن پاک کی تفسیر ذاتی شوق، جستجو اور لگن کی بدولت ہے۔

چٹان: عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ عشق میں ناکامی آدمی کو شاعر بنا دیتی ہے آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

محمد اکرم اعوان: ناکامی بھی ایک بات ہے لیکن ناکامی کا تصور خواہشات میں ہے عشق میں نہیں۔عشق ایسا جذبہ ہے جو بدلہ نہیں چاہتا عشق حقیقی میں تو ناکامی کا سرے سے تصور نہیں۔ آپ کو جو توفیق ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ اللہ کو طلب کریں دوسرا سرا آپ کے ہاتھ میں نہیں۔باقی رہ گئی بات عشق مجازی کی خاکی انسان جہاں نفرت کرتا ہے وہاں وہ انسان سے محبت بھی کرتا ہے بعض اوقات اس کے راستے میں معاشرتی رکاوٹیں آجاتی ہیں لیکن شاید اسے ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ویسے بھی عشق کاروبار یا سودے بازی نہیں ہے۔گھاٹے اور نفع کی باتیں کاروبار لوگوں کی ہیں عاشقوں کی نہیں۔

محسن بھوپالی

- شاعری سے گھر چلانا ممکن نہیں۔
- میں نے کبھی فلمی شاعری نہیں کی۔
- پاکستان میں بہت بہتر شاعری ہو رہی ہے۔

برصغیر پاک و ہند کے ممتاز شاعر محسن بھوپالی کا کہنا ہے کہ پچھلے دور کے مقابلے میں آج کی جمہوریت لاکھ درجے بہتر ہے۔ LFO کی حمایت کرتا ہوں اس سے 18 سال کے نوجوانوں کو ووٹ ڈالنے کا حق ملا۔ نواب لیاقت علی خان عظیم لیڈر تھے۔ شاعری سے گھر چلانا ممکن نہیں۔ فیض احمد فیض اور احمد فراز کو بھی ملازمت کرنا پڑی۔ سیاسی قطعات کے ذریعے بین الاقوامی شہرت ملی۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے دیے گئے ایک خصوصی انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ 1988 میں میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہوا۔ مجھے گلے کا کینسر ہو گیا تھا جس کا اسی سال لندن گلاسکو میں کامیاب آپریشن ہوا۔ آپریشن کے بعد اب باقاعدہ چیک اپ کرانا پڑتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں محسن بھوپالی نے کہا کہ جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اس وقت سے شاعری کر رہا ہوں۔ اب تک سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ کلام 1961ء میں شائع ہوا جس کی تقریب رونمائی حیدر آباد سندھ میں کرائی گئی۔ دوسرا مجموعہ قطعات کا شائع ہوا اور یوں سلسلہ جاری و ساری ہے۔ میں نے کبھی فلمی شاعری نہیں کی۔ شاعری کوئی کمرشل چیز نہیں۔ البتہ گلوکارہ گلبہار بانو، اُستاد حامد علی، اے نیر، طاہرہ سیّد نے میری غزلیں گائی ہیں

جو بہت مقبول بھی ہوئیں۔ پاکستان میں بہت بہتر شاعری ہو رہی ہے۔ شاعری کا مستقبل روشن ہے۔ کچھ شعراء صرف مشاعروں کے لیے شاعری کر رہے ہیں۔ یہ شاعری کے ساتھ اچھا عمل نہیں ہے۔ محسن بھوپالی نے مزید کہا کہ ہجرت میرے ہاں ذہنی سطح پر ہے اور میرا خاندان 1947ء کو لاڑکانہ پاکستان میں منتقل ہو گیا تھا۔ 1958ء میں شادی کی، شادی رشتہ داروں میں ہوئی۔ لاڑکانہ سے کراچی بارات آئی۔ شادی سے پہلے نہ بیگم کو دیکھا نہ ہی تصویر دیکھی تھی۔ 4 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ امریکا، کینیڈا، انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، سعودی عرب، قطر، متحدہ عرب امارات، بحرین، بنگلہ دیش اور بھارت میں منعقدہ ادبی تقریب اور عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکا ہوں۔ ایک اور سوال کے جواب میں محسن بھوپالی نے بتایا کہ مجھے زندگی میں کبھی عشق نہیں ہوا۔ میری شاعری میں رومان کا عنصر پہلے بالکل نہیں اور اب بھی بہت کم ہے۔ میں نے شاعری کو ہی بنیادی طور پر تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مجھے شہرت عام اس قطعے سے ملی۔

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

محسن بھوپالی سے مندرجہ بالا گفتگو 2003ء میں ہوئی تھی جو ماہنامہ ''ارژنگ'' میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی اچانک وفات سے پاکستان ایک عظیم شاعر اور انشاء پرداز سے محروم ہو گیا ہے۔

ممتاز راشد

○ قطر سے اب تک ۸۵ کتب شائع ہو چکی ہیں۔

○ سب سے زیادہ مشاعرے پڑھنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہے۔

○ بزمِ اُردو قطر اپنے آغاز سے ہی طرحی مشاعرے کرا رہی ہے۔

ارژنگ: آپ قطر میں کس ادبی ماحول میں سرگرم تخلیق ہیں؟

ممتاز راشد: میں 1977ء میں لاہور سے قطر گیا تھا اور اب 34 برس ہو گئے ہیں۔ اس دوران وہاں پہلے روایتی شعری نشستوں میں شرکت رہی پھر تصنیفی سرگرمیاں بھی بڑھیں۔ ادبی انتظامی امور کا تجزیہ بھی ہونے لگا۔ کچھ ادبی یا نیم ادبی لوگوں سے مقابلہ بازی یا محاذ آرائی بھی رہی۔ تب وہاں ایک ہی تنظیم تھی ''بزمِ اُردو قطر'' پھر ہر دو تین سال بعد ایک تنظیم کا اضافہ ہونے لگا اور اب وہاں درجن بھر ادبی تنظیمیں ہیں۔ چار پانچ تو خاصی متحرک ہیں۔ ہر ماہ ایک طرحی مشاعرہ ہوتا ہے اور دو تین غیر طرحی مشاعرے ہو جاتے ہیں۔ ہر چند ماہ کے بعد وہاں کسی ادیب و شاعر کی کتاب چھپ کر آ جاتی ہے۔ خود میری اب تک سولہ کتب چھپ کر آ چکی ہیں۔ قطر سے اب تک 85 کتب شائع ہو چکی ہیں۔ دو تین رسالے بھی ہیں۔ میں جنوری 1995ء یعنی پندرہ سال سے سہ ماہی رسالہ خیال و فن (لاہور/ دوحہ) شائع کر رہا ہوں۔ 2010ء میں دو نئے رسالوں کا اجرا ہوا ہے۔ ان کا بھی ایک ایک ہی شمارہ آیا ہے۔ غیر ملکی شعراء بھی اکثر قطر آتے رہتے ہیں۔ قطر کے کئی شعراء بھی بیرونِ ملک جا کر مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔ خود میں نے ایسے درجن بھر مشاعرے پڑھے ہیں۔ بس اسی طرح

کے ماحول میں یہ سفر جاری ہے۔
ارژنگ: ہم وطن اہلِ قلم کے رویوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟
ممتاز راشد: پاکستان میں اہلِ قلم خوب متحرک ہیں۔ کتابوں کی اشاعت بھی زوروں پر ہے۔ قارئین کی کمی کا شکوہ بھی ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ میں سال میں ایک بار قطر سے ضرور اپنے وطن آتا ہوں۔ سب بڑی محبت سے ملتے ہیں پذیرائی کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو شاید کچھ زیادہ ہی توقعات ہوتی ہیں اور اس وجہ سے ان کو کچھ شکایت رہتی ہے۔
ارژنگ: ہم وطن ادبی اداروں اور ادبی تنظیموں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟
ممتاز راشد: جو سرکاری ادبی ادارے ہیں ان کا تو زیادہ دھیان وطن میں مقیم اہلِ قلم پر ہی مرکوز ہوتا ہے۔ بیرونِ پاکستان مقیم اہلِ قلم کے بارے میں کسی ادارے کا کوئی خاص شعبہ نہیں جو ان کے بارے میں ڈیٹا جمع کرے۔ ان کے کاموں کو پرکھے اور پھر ایوارڈز اور اعزازات کے حوالے سے ان کو بھی یاد رکھے۔ غیر سرکاری ادبی ادارے محدود رہتے ہوئے اپنے اپنے طور پر کافی کام کر رہے ہیں۔ ادبی تنظیموں کی بھی کمی نہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ لاہور کے مختلف علاقوں کی ادبی تنظیمیں ماہانہ مشاعرے کرا رہی ہیں اور ان کی تعداد بیس اکیس ہے۔ ادبی رسائل بھی تسلسل سے نکل رہے ہیں۔ مثلاً معاصر، الحمراء، ارژنگ، سانجھاں، بیاض، ادب لطیف، نقوش، ہم عصر، تاریکین وطن، سویرا انٹرنیشنل، لہراں، آئینہ، ترنجن وغیرہ۔ یہ تو لاہور کے ہیں۔ دیگر شہروں کے رسائل بھی کافی ہیں۔ البتہ فنون، اوراق، افکار اور نقوش وغیرہ کا ماضی غلغلہ اب نظر نہیں آیا۔
ارژنگ: آپ کی پسندیدہ کتب کون سی ہیں؟
ممتاز راشد: نثر میں شہاب نامہ، مزاحیہ نثر میں مشتاق احمد یوسفی کی ''آبِ گم'' شعری مجموعوں میں جون ایلیا کی کتب اور مزاحیہ شاعری میں انور مسعود کی ''قطعہ کلامی'' وغیرہ۔
ارژنگ: خلیج کے نمایاں شعراء کی پسندیدہ کتب کون سی ہیں؟
ممتاز راشد: بحرین میں مقیم بابا جی سعید قیس سے بڑھ کر تو کوئی بھی نہیں جو کہ تقریباً اسی برس کی عمر میں بھی منفرد اور معیاری شاعری کر رہے ہیں۔ دوبئی، ابوظہبی سے شفیق سلیمی تو واپس آ

چکے ہیں۔اب یعقوب روشناور، ظہور الاسلام وغیرہ ہیں۔ جدہ سے نسیم سحر واپس آ چکے ہیں۔اب قمر حیدر قمر سرگرم ہیں۔قطر میں امجد علی سرور، شفیق اختر، شادا کولوی، شوکت ناز، عزیز نبیل، فہیم الدین، افتخار راغب، ندیم جمشید، قلق، منصور، فرید ندوی اور زوار حسین زائر نمایاں ہیں۔جبکہ رشید نیاز واپس آ چکے ہیں۔

ارژنگ: آپ کی قطر سے واپسی کب تک متوقع ہے؟

ممتاز راشد: میں وہاں بجلی کے سرکاری محکمے ''کہربا'' (جو کہ اب کہرما کہلاتا ہے) میں ہوں۔اس کا ڈرائنگ اینڈ سروے سیکشن اب کمپیوٹر کے دور میں ''ڈیٹا بیس سیکشن'' کہلاتا ہے۔یہ بجلی گھروں، زمین دوز تاروں اور سب اسٹیشنوں وغیرہ کی ڈرائینگز کو اپ ڈیٹ کرتا ہے اور مستقبل کے لیے ڈرائنگز بناتا ہے۔میں بھی یہ ریکارڈ ''ڈیجٹائز'' کرنے والے آٹھ نو افراد میں شامل ہوں۔ 57 سال کی عمر ہو گئی ہے۔تین سال بعد ریٹائر ہونا ہے۔شاید ایک سال کی توسیع مل جائے اور پھر ان شاء اللہ اپنے پیارے شہر لاہور میں بسیرا رہے گا۔

ارژنگ: آپ چونتیس سال سے قطر میں ہیں۔اس دوران ادبی لحاظ سے کوئی نمایاں کامیابیاں پائیں اور آپ کے کیا کیا اختصاصات رہے؟

ممتاز راشد: پہلی کامیابی تو یہی ہے کہ اس دوران سرگرمیوں میں تسلسل رہا۔یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں۔پھر مشاعروں کے بارے میں یہ ہے کہ قطر میں مقیم شاعروں میں سب سے زیادہ مشاعرے میں نے ہی پڑھے ہیں۔ان میں بڑے مشاعرے بھی ہیں اور چھوٹے بھی اور گھریلو نشستیں بھی۔ 2004ء سے میں تین تنظیموں، بزم اُردو قطر، حلقہ ادب اسلامی قطر اور انجمن شعراء اُردو ہند قطر کے ماہانہ مشاعرے پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ ہر ماہ ایک دو دوسرے مشاعرے بھی ہو جاتے ہیں۔تاہم اوسطاً ماہانہ اگر تین مشاعرے ہی لیے جائیں تب بھی اوّل 2004 سے 2010 تک کے سات برسوں میں کوئی ڈھائی سو مشاعرے پڑھے ہیں۔ 2004ء سے قبل کے اوسطاً مشاعرے دو بھی ہوں تو 25 برسوں میں 800 سے زائد وہ ہیں اس طرح کل ہزار گیارہ سو مشاعرے وہاں پڑھے ہیں جو کہ کسی اور شاعر کے ریکارڈ میں نہیں ہیں۔ بزم اُردو قطر اپنے آغاز ہی سے ماہانہ طرحی مشاعرے کرا رہی

ہے۔ میں 1978ء سے ان کا حصہ ہوں۔ کئی سال سے یہ بزم اب ہر سال سالانہ نظمیہ مشاعرہ، سالانہ حمدیہ طرحی مشاعرہ، سالانہ نعتیہ طرحی مشاعرہ، سالانہ طرحی مشاعرہ اور سالانہ مزاحیہ طرحی مشاعرہ بھی کرا رہی ہے۔ باقی طرحی مشاعرے غزلیہ ہوتے ہیں۔ بزم کے ان مشاعروں میں سے چند ایک گنتی کے ہوں گے جن میں، میں نے حصہ نہ لیا ہو۔ اس لحاظ سے قطر میں زیادہ طرحی مشاعرے بھی میں نے ہی پڑھے ہیں۔ شاعروں میں سب سے زیادہ 34 سال گزارنے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ مشاعرے پڑھنے کا اعزاز بھی مجھے ہی حاصل ہے۔

ارژنگ: مشاعروں سے ہٹ کر دیگر ادبی سرگرمیوں میں آپ کے اختصاصات کیا ہیں؟

ممتاز راشد: قطر میں مقیم اہلِ قلم میں سب سے زیادہ میری ہی کتب شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تعداد سولہ سترہ ہے۔ ان میں درجن بھر شعری مجموعے ہیں۔ میرے بعد وہاں جس شاعر کے زیادہ شعری مجموعے ہیں ان کی تعداد چار ہے۔ پھر تین، دو اور ایک ایک شعری مجموعے والے شعراء ہیں۔ قطر میں مقیم شعراء میں سے سب سے زیادہ بیرونی دورے بھی میں نے ہی کیے ہیں۔ 2010ء تک میں بحرین کے سات، عرب امارات کے دو اور سعودی عرب و کویت کا ایک ایک دورہ کر چکا ہوں۔ قطر میں مقیم شعراء میں سے پاک و ہند وغیرہ کے ادبی رسائل میں سب سے زیادہ خصوصی گوشے بھی میرے ہی فن و شخصیت کے بارے میں شائع ہوئے۔ ادبی مجلّہ ''سلسلہ'' کراچی نے 2001 میں میرے حوالے سے کوئی پونے تین سو صفحات کا خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔ خصوصی گوشے ان رسائل میں ماہنامہ ''دُنیائے ادب'' کراچی، سہ ماہی ''انتساب'' سرونج (مدھیہ پردیش)، ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' راولپنڈی، ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی، سہ ماہی ''ادبی شاخیں'' بھوپال، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور، ماہنامہ ''آئینہ'' برطانیہ، ماہنامہ ''الرائی'' لاہور اور ماہنامہ ''شاندار'' اعظم گڑھ۔

نوشی گیلانی

- سیاست بازی کو قابل مذمت سمجھتی ہوں گروہ بندیوں پر یقین نہیں رکھتی۔
- سچائی ہمیشہ مؤثر ہوتی ہے کیثر نہیں۔
- مردوں کی نسبت عورتوں میں تصوف کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

چٹان: با قاعدہ شعر کہنے کا آغاز کب کیا؟

نوشی گیلانی: با قاعدہ طور پر شعر کہنے کا آغاز میں نے شعور سنبھالنے کے ساتھ کیا۔اس کے بعد جوں جوں عمر بڑھی تجربے اور مشاہدے کے حوالے سے موضوعات میں تبدیلی آتی گئی۔

چٹان: ''محبتیں جب شمار کرنا''، آپ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔اس کے بعد حال ہی میں آپ کا دوسرا مجموعہ ''اُداس ہونے کے دن نہیں'' منظر عام پر آیا ہے۔آپ کے دونوں مجموعوں کا تقابلی جائزہ لیں تو دوسرے مجموعے میں آپ کے ہاں ایک خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے ۔اس کی کوئی وجہ ہے؟

نوشی گیلانی: اگر آپ نے ایسا محسوس کیا ہے تو میرے لئے حوصلہ افزائی کی بات ہے۔جہاں تک اس کی وجہ کا تعلق ہے تو میں یہ کہوں گی کہ اس کی وجہ شعوری نہیں ہے کہ میں بتا سکوں ایسا کیوں ہوا ہے۔ہاں البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ عمر کے گزرتے لمحوں کے ساتھ حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں انسان میں مثبت تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔میرے نئے مجموعے میں آپ کو جس خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوا ہے اس کی وجہ بھی شاید تجربات کی روشنی ہے۔

چٹان: شعر میں فن کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں یا خیال کو؟

نوشی گیلانی: شعر کہنے میں محرک آپ کا جذبہ ہوتا ہے۔اس کی شدت ہی آپ کو تخلیق کے عمل کی طرف اکساتی ہے۔ہاں مگر اس کے ساتھ فنی تقاضوں کو پورا کرنا بھی ایک ذمہ داری ہے۔گو جذبے کی اہمیت زیادہ ہے۔لیکن جذبے اور تکنیک کا توازن میں ہونا شعر کو موثر بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔

چٹان: بگڑتی ہوئی ادبی صورتحال کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟

نوشی گیلانی: یہ وہ لوگ ہیں جو ادب صرف ذاتی نمود و نمائش کے لئے لکھ رہے ہیں۔ان لوگوں نے اپنی منافقانہ اور اوچھی حرکتوں سے سنجیدہ فکر قاری کو ادب سے دور کر دیا ہے۔ایسے لوگوں کو فوری طور پر بے نقاب کرنے کی ضرورت ہے۔جو اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر دن رات ادب کے تناور پودے کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہیں۔مستقبل میں ادب کو پروان چڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ اسے پوری سنجیدگی کے ساتھ ایک مشن کے طور پر لیا جائے۔

چٹان: شاعری میں اصلاح کے عمل کو کس حد تک جائز سمجھتی ہیں؟

نوشی گیلانی: شاعری میں اصلاح عروض کو سیکھنے کی حد تک تو بہتر عمل ہے۔مگر فکری حوالے سے اصلاح لینا میرے نزدیک خطرناک عمل ہے۔اس سے اصلاح لینے والے کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں نئے شاعروں کی شاعری پر ان کے استادوں، کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ دوسرا اصلاح کے لئے فکری صلاحیتوں کا پہلے سے موجود ہونا از حد ضروری ہے باقی کسی بھی شاعر کی بہترین تربیت معاشرہ کرتا ہے۔اس سلسلے میں مطالعہ سے شعور کو کافی جلا مل سکتی ہے۔اس لئے میں نئے آنے والوں کو مشورہ دوں گی کہ اساتذہ کے چکر میں پڑنے کی بجائے وہ زیادہ سے زیادہ مطالعہ کی عادت اپنائیں اس سے انہیں بڑی مدد ملے گی۔یوں بھی جس طرح کے اساتذہ اور شاگردفی زمانہ میسر ہیں۔ادب کو ان دونوں کی ذات سے کوئی فائدہ نہیں۔

چٹان: ادیب برادری میں پروان چڑھتے ہوئے منافقانہ رویوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

نوشی گیلانی: اصل میں پورا معاشرہ خاص طرح کی بے یقینی کا شکار ہے۔اس طرح ادیب بھی اس معاشرے کا ایک فرد ہے۔منصب کے اعتبار سے ادیبوں کو یہ غیر معمولی حرکت زیب نہیں دیتی۔ان کے ہاں منافقانہ رویئے کسی طرح بھی پسندیدہ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ میرے نزدیک ادیبوں میں ایسے منفی رویوں کے پروان چڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ شاید تخلیق سے ان کا ایمان اٹھ گیا ہے۔ہم دیگر حربوں سے ادبی تاریخ کا حصہ بننا چاہتے ہیں اور حرف کی توقیر کے ساتھ اپنے بنیادی فرض کو نظرانداز کرتے جا رہے ہیں۔

چٹان: کس حد تک خواتین کی آزادی کی حامی ہیں؟

نوشی گیلانی: انسان فطرتاً آزاد ہے۔اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ خواتین کو اس کی صنف کے اندر پوری پوری آزادی ملنی چاہیئے۔مثلاً پانی دو کناروں کے اندر ہے تو دریا ہے اور کھیت سیراب کرتا ہے۔پانی کناروں سے باہر آ کر سیلاب بن جاتا ہے تو بستیاں اجاڑ دیتا ہے۔اصل میں ہمارے ہاں آزادی کا غلط مفہوم میں لیا جاتا ہے۔

چٹان: موجودہ دور میں مشاعروں کا کیا کردار رہ گیا ہے؟

نوشی گیلانی: مشاعروں کا شاعری کو مقبول بنانے میں اہم کردار ہے۔لیکن وہ مشاعرے جو چند افراد مخصوص نمائشی مقاصد کے لئے ترتیب دیتے ہیں۔اس سے نہ تو شاعری کی کوئی خدمت ہوتی ہے اور نہ شاعری سننے والوں کی کوئی تربیت ہو سکتی ہے۔

چٹان: ادب میں در آنے والی سیاست کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

نوشی گیلانی: ادب میں نظریاتی بنیاد پر سیاست کے حق میں ہوں۔جبکہ شخصی بنیاد پر ادبی سیاست بازی کو قابل مذمت سمجھتی ہوں۔گروہ بندیوں پر یقین نہیں رکھتی ہوں۔

چٹان: فلمی شاعری کو ادب شمار کرتی ہیں؟

نوشی گیلانی: فلمی شاعری کی پوری تاریخ کو دیکھیں تو ایسی چیزیں نکل آتی ہیں جو ادبی معیار کی ہیں۔اس کے برعکس فی زمانہ جو لکھا جا رہا ہے اور دھڑا دھڑ بغیر سوچے سمجھے کتابیں چھپ رہی ہیں۔اس کو شاعری نہیں کہا جا سکتا۔میرے نزدیک شاعری وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلے نہ کہ وہ چیز جو کتاب میں چھپ جائے وہ ادب کہلانے کی حقدار ہو جاتی ہے۔ادب ایک

مختلف فلسفیانہ عمل ہے۔ کسی اور دنیا کی بات ہے۔ جس میں انسان کا دل اور روح یکجا ہو کر کسی خیال کو پوری شدت سے پروان چڑھاتے ہیں

چٹان: آپ نے حالیہ مجموعہ دینے میں قدرے تاخیر سے کام کیوں لیا؟

نوشی گیلانی: میں ٹھہراؤ اور عمل کی ریاضت سے گزرنے کے بعد کتاب لانے کو بہتر سمجھتی ہوں۔ میرے خیال میں صرف کتابوں کے انبار لگا دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ سچائی ہمیشہ مؤثر ہوتی ہے کثیر نہیں۔

چٹان: موجودہ دور میں مردوں کی نسبت خواتین کی شاعری میں تصوف کا رنگ نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟

نوشی گیلانی: عورت چونکہ نسبتاً زیادہ حساس ہے۔ اس لئے روحانی اقدار کو زیادہ سنجیدگی سے لیتی ہے۔ جبکہ آج کا مرد پہلے کی نسبت مادی ضرورتوں کا زیادہ اسیر ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ روحانی قدروں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی نسبت آج کے مردو ں کے بجائے عورتوں میں تصوف کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔

چٹان: بنیادی طور پر آپ کا تعلق پنجاب سے ہے کیا وجہ ہے آپ کا ابھی تک کوئی پنجابی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا؟

نوشی گیلانی: زبان کوئی بھی ہو محترم ہے۔ میرے نزدیک شاعری بے ساختہ ہوتی ہے۔ ہمارا وجدان جب تخلیقی لمحوں کے زیر اثر ہو وہاں یہ طے کر کے نہیں لکھا جاتا کہ کس زبان میں یہ بات ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے میں سمجھتی ہوں کہ ادیب کو آزاد خیال ہونا چاہئے اور وہ محدود نہ رہے۔ خواہ وہ پنجابی لکھے، اردو لکھے یا سرائیکی۔

چٹان: پنجابی کو سرائیکی سے الگ زبان سمجھتی ہیں؟

نوشی گیلانی: جی بالکل پنجابی سرائیکی دو الگ زبانیں ہیں۔

وصی شاہ

- ہم لوگ ابھی تک روٹی کپڑے کے مسائل سے باہر نہیں نکل سکے۔
- ادب کی طرف میں حادثاتی طور پر آیا۔
- تخلیق صنفِ ادب کا اپنے لیے خود تعین کرتی ہے۔

ڈرامہ ''آ ہن'' سے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار شہرت کی بلندیوں کو چھونے والے وصی شاہ کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا، تو بے جا نہ ہو گا وصی شاہ اس حوالے سے خوش قسمت ہے کہ اس نے جو بھی کام کیا قسمت نے اس کا بھرپور ساتھ دیا ابھی لوگ ڈرامہ آہن میں اس کے کردار کو نہیں بھولے تھے کہ اس کے شعری مجموعے ''آنکھیں بھیگ جاتی ہیں'' نے چھپ کر نہ صرف ملک گیر مقبولیت حاصل کر لی بلکہ فروخت کے نئے ریکارڈ بھی قائم کئے مگر وصی شاہ کی اب تک کی کامیابیوں کو محض ان کی خوش قسمتی کا مرہون منت قرار دینا ان کے ساتھ زیادتی ہو گی خوش قسمتی اپنی جگہ وصی شاہ کی کامیابیوں میں اس کی محنت لگن اور خلوص کو بھی برابر کا دخل ہے جس کا اعتراف عہد حاضر کے نامور ادیب اور اساتذہ فن کر چکے ہیں۔

چٹان: ادب کی طرف کیسے آئے؟

وصی شاہ: مجھے شروع ہی سے موسیقی سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ گانوں کی دھنیں وغیرہ بنانے کے دوران مختلف شعراء کا کلام پڑھنے اور سننے کا اتفاق ہوا جس سے قدرتی طور پر لکھنے پڑھنے کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ اس لئے میرے خیال میں ادب کی طرف میں حادثاتی

طور پر آیا۔

چٹان: عوام میں آپ کی پہلی پہچان بطور ڈرامہ نگار اور اداکار کے ہے اس کے بعد آپ کے پہلے مجموعے ''آنکھیں بھیگ جاتی ہیں'' نے فروخت کے ریکارڈ قائم کئے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی شہرت میں ڈرامہ یا شاعری میں سے کس کا ہاتھ زیادہ ہے؟

وصی شاہ: اس حوالے سے میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے جس کام میں بھی ہاتھ ڈالا اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں شہرت دی۔ جب ٹی وی پر میرا پہلا ڈرامہ سیریل ''آہن'' چلا تو لوگوں نے مجھے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار دونوں حیثیتوں میں سراہا۔ اس کے بعد جب میرا پہلا شعری مجموعہ،، آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، شائع ہوا تو لوگوں نے میری توقع سے بڑھ کر بہت زیادہ پذیرائی کی۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ آج کل لوگوں میں میری پہچان کس حوالے سے ہے۔ تو میرے خیال میں لوگ مجھے بطور شاعر زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت ڈرامہ نگار اور اداکار کے۔

چٹان: آپ بیک وقت نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی آپ کی پسندیدہ صنف کون سی ہے؟

وصی شاہ: میرا مسئلہ پہچان یا پیسہ نہیں ہے میں کام پر یقین رکھتا ہوں خواہ وہ کسی فیلڈ میں ہو۔ اس لئے لکھتے ہوئے کبھی طے کر کے نہیں لکھا کہ اس صنف ادب میں لکھوں۔ میرے خیال میں اظہار کی قوت یا تخلیق صنف ادب کا اپنے لئے خود تعین کر لیتی ہے۔ جب آپ پہلے سے طے کر کے لکھیں گے تو پھر وہ تخلیق اوریجنل نہیں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مجھے بطور ڈرامہ نگار اور اداکار کے لوگوں نے کافی سراہا میں ڈرامہ نگاری یا اداکاری کو ہی پکڑ کر نہیں بیٹھ گیا۔

چٹان: اپنے کام کے حوالے سے کسی سے باقاعدہ اصلاح لی؟

وصی شاہ: باقاعدہ طور پر تو میں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ لیکن اپنے سینئر کا کام دیکھ کر اور کتابیں پڑھ کر میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ باقی کچھ دوستوں سے مشاورت وغیرہ چلتی رہتی ہے۔ جس میں کام کے حوالے سے خامیوں کا پتہ چلتا رہتا ہے۔

چٹان: بطور ڈرامہ نگار آپ کے پسندیدہ رائٹر؟

وصی شاہ: ویسے تو سبھی لکھنے والے میرے لئے محترم ہیں اور میں ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہوں لیکن خاص طور پر ڈرامہ میں جو لوگ مجھے پسند ہیں ان میں اصغر ندیم سید، ڈاکٹر ڈینس آئزک، گلزار، امجد اسلام امجد اور نورالہدیٰ شاہ کے نام اہم ہیں۔

چٹان: اور بطور شاعر؟

وصی شاہ: بے شمار ہیں مثلاً فیض، ساحر لدھیانوی، ساغر صدیقی، احمد فراز، امجد اسلام امجد اور پروین شاکر۔

چٹان: اپنے ہمعصروں میں سے آپ نے کسی کا نام نہیں لیا؟

وصی شاہ: میرے خیال میں تقریباً سبھی اچھا لکھ رہے ہیں۔

چٹان: بدلتے ہوئے ادبی رجحانات کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

وصی شاہ: اس کا جواب میں ایک شعر کی صورت میں دوں گا۔ شاعر کا نام البتہ مجھے اب یاد نہیں شعر کچھ یوں

راستو کیا ہوئے وہ لوگ کہ آتے جاتے
میرے آداب پے کہتے تھے کہ جیتے رہیے

میرے خیال میں اس سلسلے میں دونوں دھڑوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے دونوں کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہئے۔ جونیئرز کو بڑوں کی عزت اور سینئرز کو جونیئرز کے ساتھ شفقت کا رویہ رکھنا چاہئے۔

چٹان: ادب میں گروہ بندیوں کو کیسا خیال کرتے ہیں۔

وصی شاہ: گروہ بندی کسی بھی حوالے سے ٹھیک نہیں۔ خواہ ادب میں ہو یا سیاست میں۔

چٹان: آئندہ صدی میں غزل یا نظم میں سے کس کا مستقبل روشن ہے؟

وصی شاہ: جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے تخلیق صنف کی محتاج نہیں ہے۔ جس تخلیق میں جان ہو گی وہ زندہ رہے گی خواہ وہ غزل ہو یا نظم۔

چٹان: ہمارے ہاں بین الاقوامی مسائل کے حوالے سے بہت کم لوگوں نے لکھا ہے اس کی وجہ؟

وصی شاہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے ہاں ایسا کچھ ہے۔ دراصل ساری بات زبان کی ہے۔ ہماری زبان چونکہ بین الاقوامی زبان نہیں ہے۔ اس لئے باوجود اس کے کہ ہمارے ہاں تقریباً ہر موضوع پر لکھا جارہا ہے۔ یہی سمجھا جارہا ہے کہ جیسے ہم لوگ صرف اپنی ذات تک یا اپنے خطے تک محدود ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر اس بات کو کسی حد تک درست بھی مان لیا جائے تو اس کی بڑی وجہ ہمارے داخلی مسائل ہیں، ہم لوگ ابھی روٹی کپڑے کے مسائل سے ہی باہر نہیں نکل سکے۔ داخلی مسائل سے ہمیں فرصت ملے گی تو خارجی امور کی طرف توجہ دیں گے۔ وہ ایک محاورہ ہے نا کہ

تجھے پرائی کیا پڑی پہلے اپنی تو نبیڑ

چٹان: نثری نظم کو شاعری سمجھتے ہیں؟

وصی شاہ: میں نے چونکہ کبھی نثری نظم کہی نہیں ہے۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ میں اس بارے میں رائے دینے کا کوئی استحقاق رکھتا ہوں یا شاید پھر اس طرح کسی کو بھی رائے دینے کا حق نہیں ہے۔ اس کا بہتر فیصلہ وقت کرے گا۔

چٹان: جدت کے نام پر ہمارے ہاں ادب میں فحش نگاری کا رجحان چل پڑا ہے۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟

وصی شاہ: یقین کریں اس قسم کا کوئی لٹریچر مجھے پڑھنے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا۔ ہمارے سینئرز کا لکھا ہوا ادب ہی اتنی زیادہ مقدار میں ہے کہ اسے پڑھنے سے فرصت نہیں ملتی۔ دوسری بات یہ کہ مجھے واہیات لٹریچر پڑھنے سے ویسے ہی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

چٹان: آپ کا نظریہ فن کیا ہے؟

وصی شاہ: ادب برائے زندگی میں سمجھتا ہوں کہ ادب برائے ادب وقت کا ضیاع اور نری بکواس بازی ہے۔

ڈاکٹر یونس احقر

- میرا آئیڈیل اچھا شعر ہے خواہ وہ کسی کا بھی ہو۔
- تخلیقات میں قاری کی ضروریات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔
- نئی نسل کو سینئر سے مشورہ کرنا چاہیے اور جلد بازی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر یونس احقر بنیادی طور پر نارووال سے تعلق رکھتے ہیں۔ گزشتہ ایک لمبے عرصے سے ایم اے او کالج میں پنجابی کے پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں اب تک ''سوچ دا سفر'' کے نام سے پنجابی غزلوں پر مشتمل ڈاکٹر صاحب کا ایک شعری مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے اور دوسرا پنجابی شعری مجموعہ ''رکھ اڈاری لگّے'' جو غزلوں پر ہی مشتمل ہے زیر ترتیب ہے ڈاکٹر صاحب کی شعری اہمیت کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایف اے پنجابی اور بی اے پنجابی کے شعری انتخاب میں انکی غزلیں بھی شامل ہیں بقول نامور نقاد ڈاکٹر محمد اسلم رانا، یونس احقر پنجابی شاعروں کے برعکس غزل کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ یونس احقر کی غزلیں سوچ، فن اور زبان کا ایک خوبصورت مرقع ہیں جو فن کے ہر معیار پر پورا اُترتی ہیں اور قاری کو اپنے ظاہری اور باطنی حسن سے متاثر کرتی ہیں۔

چٹان: شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: شاعری وہ میدان ہے جس کی طرف آدمی قصداً نہیں آتا۔ بلکہ اس کا مزاج اسے اس طرف لے آتا ہے۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ اگر شاعرانہ احساس آدمی کے ذہن کا حصہ نہ ہو تو وہ صرف علم اور معلومات کے بل بوتے پر شاعر نہیں بن سکتا۔

جب میں اپنے ماضی پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے بڑے واضح دلائل ملتے ہیں جو ثابت کرتے ہیں کہ شاعری کی طرف میرا رجحان فطرتاً ہی تھا۔ بچپن میں اپنی طرف سے مصروں کو ترتیب دینے کی کوشش کرنا ردھم میں چیزوں کو گنگنانا یا شاعرانہ فلو میں اشعار کو پڑھنا یہ ساری چیزیں میرے مزاج کا حصہ تھیں۔ ۶۱،۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جب میں نویں دسویں جماعت میں تھا تو اس وقت باقاعدہ شعر کہنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوا۔ میٹرک کے بعد مجھے حضرت علامہ اقبال کا اردو کلام اور دائم اقبال دائم کی چند شہرت یافتہ کتابوں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا علامہ کے زیر اثر ان کی رواں دواں بحروں میں اردو میں لکھنا شروع کیا اور دائم اقبال دائم کے زیر اثر وارث شاہی بحر میں پنجابی کلام لکھنا بھی میرا معمول بن گیا۔ یہ دونوں شخصیات مجھے شاعری کی طرف لانے کا اصل محرک بنی۔

چٹان: آپ کا تعلق اردو کے نامور شاعر فیض احمد فیض کے آبائی ضلع نارووال سے ہے۔ اس حوالے سے فطری طور پر آپ کو بھی اردو شاعری کی طرف آنا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس آپ کی پہچان جدید پنجابی غزل گوئی کے حوالے سے ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: جہاں تک فیض احمد فیض کا تعلق ہے وہ ہمارے علاقے سے متعلق ہیں اور اردو کے بڑے نامور شاعر ہو گزرے ہیں لیکن مجھے اس کا اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں نے ان کے بارے میں بہت کم پڑھا ہے اور وہ بھی بہت دیر سے پڑھا ہے۔ اس لئے ان کا کسی بھی پہلو سے اثر قبول کرنا میری مجبوری نہ بن سکا۔ میں ۶۳ء میں گاؤں چھوڑ کر لاہور آ گیا اور یہاں ۱۹۷۰ء تک میں اردو اور پنجابی ہر دو زبانوں میں صرف اپنے شاعرانہ مزاج کی رہنمائی میں لکھتا رہا اور یہ سارا کلام کہیں شائع کرانے کا نہ خیال آیا اور نہ حوصلہ ہوا لیکن اس میدان میں جو بات میری حوصلہ افزائی کرتی رہی وہ چند قریبی با ذوق دوستوں کی وہ حوصلہ افزاء باتیں تھیں جن کا اظہار وہ میرے اشعار سن کر دیا کرتے تھے۔ اکثر ایسے بھی ہوا کہ عام دوست احباب میں اپنا کلام علامہ اقبال اور دائم اقبال دائم کے نام پر سنا دیا کرتا۔ مجھے اس وقت بڑی خوشی میسر آتی اور حوصلہ ملتا جب میرے اشعار کو پذیرائی ملتی اور ان پر کوئی اعتراض نہ ہوتا میں خیال کر لیتا کہ اقبال اور دائم کے نام پر سنائے جانے والے اشعار اگر قبول کر لئے گئے ہیں تو ان میں یقیناً کچھ نہ کچھ جان ہے لیکن یہ واضح

رہے کہ اردو یا پنجابی کا سنایا جانے والا یہ کلام صرف دوستوں کی محفلوں تک محدود تھا کسی پیشہ ور شاعر سے میرا رابطہ نہیں تھا اور ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

چٹان: واضح طور پر صرف پنجابی شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: لاہور میں میرا پہلا ادبی رابطہ پنجابی شاعروں سے ہوا ان دنوں رؤف شیخ کو جدید پنجابی غزل اور ادبی سیاست کے حوالے سے خاصی شہرت اور اہمیت حاصل تھی۔ میرے ایک شاعر دوست جاذب بخاری نے میرا رابطہ رؤف شیخ سے کرایا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر تمہیں اس میدان میں کوئی شناخت پیدا کرنا ہے تو رؤف شیخ اس حوالے سے اچھے رہنما ثابت ہوں گے۔ رؤف شیخ سے پہلی ملاقات میں طے پا گیا کہ وہ شاعری کے حوالے سے بطور بھائی یا بیٹے کے میری ہر ممکن رہنمائی کریں گے لیکن میں انہیں کہیں اپنا استاد نہیں کہہ سکوں گا۔ اس معاہدے پر ۱۹۷۵ء تک عمل ہوا بفضل تعالیٰ اس پنجابی غزل کے حوالے سے میری ایک شناخت بننا شروع ہو چکی تھی۔

ان دنوں ہی مجھے ایم اے او کالج لاہور میں پنجابی لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اس موقعہ کے حوالے سے منظور وزیر آبادی مرحوم اور سلیم کاشر نے رؤف شیخ کو مشورہ دیا کہ تمہارے شاگرد کو ملازمت کے حوالے سے جو اعزاز ملا ہے اس سلسلے میں کسی ادبی محفل کا انعقاد کریں۔ رؤف شیخ نے اس مشورے کو بخوشی قبول کرتے ہوئے میرے اعزاز میں ایک ہوٹل میں مشاعرے کا انعقاد کیا میں نے اس شعری محفل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُردو اور پنجابی کے مشہور شاعروں اور کالم نگاروں کی موجودگی میں رؤف شیخ سے یہ تسلیم کروالیا کہ وہ میرے استاد ہیں۔ رؤف شیخ یا ان کے قریبی دوستوں میں وہی لوگ تھے جو پنجابی غزل کا روپ نکھارنے میں بڑی نیک نیتی سے مصروف تھے ان کے زیر اثر میں نے بھی پنجابی غزل ہی کہنا شروع کی اور آہستہ آہستہ یہ صنف ادب میرے مزاج کا حصہ بن گئی۔ لکھنے کو تو تقریباً سبھی اصناف ادب میں لکھنے کا موقع ملا ہے لیکن میری واضح شناخت جدید پنجابی غزل ہی بنی۔

چٹان: آپ کے بارے میں ناقدین ادب کی ایک رائے یہ بھی ہے کہ جدید پنجابی غزل کے حوالے سے آپ اپنے استاد رؤف شیخ سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ آپ اس بات سے کہاں تک اتفاق کرتے ہیں؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: جدید پنجابی غزل کے حوالے سے رؤف شیخ کی پہلی کتاب ''بلدا شہر'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس وقت ان کا انداز میرے لئے ایک نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے بھرپور کوشش کی کہ میں بھی اسی انداز میں غزل کو نکھار دینے کی کوشش کروں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا آخر ۱۹۷۹ء میں میری غزلوں کی پہلی کتاب ''سوچ دا سفر'' کے نام سے شائع ہوئی۔ حوصلہ افزائی تو مشاعروں میں بھی کافی ہوا کرتی تھی لیکن کتاب کے آنے پر نا صرف شاعر حضرات بلکہ ناقد حضرات نے بھی اسے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے اس کتاب کو خاصا پسند کیا گیا اور اس پر تبصرے بھی کئے گئے جو مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ پنجابی غزل میں مجھے میرے استاد رؤف شیخ سے آگے نکلتا محسوس کیا جا رہا ہے اس بارے میں میری دوٹوک اور واضح رائے رہی ہے کہ یہ تاثر قارئین کا ہوسکتا ہے میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ شاعری ایک ایسا میدان ہے کہ اس میں اچھا شعر کوئی بھی کہہ سکتا ہے لیکن اپنے مجموعی ادبی سفر کے حوالے سے کوئی مقام حاصل کرنا الگ بات ہے ۔میرے کئی اشعار نے اور کتاب نے بھی مجھے دوسرے شاعروں سے الگ میرے استاد سے بھی خصوصیت کے ساتھ داد دلائی ہے۔ نقاد حضرات نے اس بحث کو نہیں چھیڑا جس کی طرف آپ نے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ یہ سوال ادبی سیاست کے حوالے سے ان لوگوں نے اٹھایا جو کسی نہ کسی حوالے سے یا کوئی نہ کوئی مفاد ذہن میں رکھتے ہوئے رؤف شیخ کو بحیثیت شاعر محدود کرنے کے متمنی تھے۔ رہا میری ذات کا تعلق تو میں نے پہلے بھی ایک انٹرویو میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اب آپ کا آئیڈیل شاعر کون ہے کہا تھا کہ رؤف شیخ میرے آئیڈیل شاعر رہے ہیں لیکن اب میرا آئیڈیل کوئی شاعر نہیں بلکہ اچھا شعر ہے خواہ وہ کسی کا بھی ہو اس پر ادبی سیاست کے حوالے سے رؤف مخالف لوگوں نے قیاس کیا کہ انٹرویو کا یہ جملہ رؤف شیخ اور یونس احقر میں تعلق ٹوٹنے کا باعث بنے گا مگر شیخ صاحب نے خندہ پیشانی سے نہ صرف اس جملے کو قبول کیا بلکہ پسند بھی کیا اور یہ کہتے ہوئے مخالفین کے منہ بند کر دیے کہ پنجابی غزل کے حوالے سے یونس احقر کو اگر کوئی بلند مقام ملتا ہے تو میں یہی سمجھوں گا کہ یہ عزت مجھے ملی ہے۔

چٹان: پنجابی غزل اردو غزل کے مقابلے میں پیچھے کیوں ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: پنجابی غزل کے آغاز کا تاریخی اعتبار سے تقریباً وہی دور بنتا ہے جو اردو غزل کا ہے لیکن پنجابی غزل اس تسلسل سے نہیں لکھی گئی جس تسلسل سے اردو غزل ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہے۔ پنجابی غزل کو اگر تسلسل ملا ہے تو وہ قیام پاکستان کے بعد کا دور ہے اس وقت تک اردو غزل کو ایک واضح شناخت مل چکی تھی پنجابی غزل نے اپنا جدید رنگ اردو سے ہی قبول کیا لیکن وہ چند لوگ جنہوں نے پنجابی غزل کو جدت کے حوالے سے ایک شناخت فراہم کی ہے انہوں نے نا صرف اردو غزل کے معیار کو سامنے رکھا بلکہ پنجابی میں اپنی روایات اور کائناتی مسائل پر بھی نظر رکھی زمین کے ایک خطے سے تعلق رکھنے والی زبان ہونے کے ناطے پنجابی میں وہ گہرائی اور گرفت موجود ہے کہ جہاں کہیں بھی اسے کسی زرخیز ذہن کے حوالے سے اچھا خیال میسر آیا ہے اس میں ہونے والی شاعری نے اپنے تاثر کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ بعض اوقات اسی موضوع سے متعلق اردو کا شعر وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکا۔ مجھے خود مشاعروں میں اردو کے نامور شاعر احمد ندیم قاسمی صاحب کو یہ کہتے ہوئے سننے کا اتفاق ہوا ہے اور یہ بات ان کے قلم سے بھی نکل چکی ہے کہ پنجابی غزل کسی بھی طرح جدید اردو غزل سے پیچھے نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو اس کا قدم آگے بڑھتا محسوس ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کا یہ نقطہ نظر ہمارے لئے حوصلہ افزائی کا درجہ رکھتا ہے لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مجموعی طور پر پنجابی غزل اردو غزل کا مقابلہ نہیں کر پا رہی تو یہ حقیقت ہے۔

چٹان: مشرقی پنجاب اور ہمارے ہاں تخلیق ہونے والے پنجابی ادب میں بنیادی فرق کیا ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: مشرقی اور مغربی پنجاب ہر دو میں بنیادی ادب کی تخلیق اپنی اپنی فضا کے مطابق جاری ہے۔ جہاں تک فکشن کا تعلق ہے مشرقی پنجاب میں اس کو مقداری حوالے سے اولیت حاصل ہے لیکن شاعری کے حوالے سے مغربی پنجاب میں تخلیق ہونے والا ادب فنی اور فکری ہر دو حوالوں سے مشرقی پنجاب کے مقابلے میں بہتر حالت میں ہے۔

چٹان: اکیسویں صدی غزل کی ہوگی یا نظم کی؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: پنجابی شعری اصناف کے حوالے سے غزل کو پنجابی کی قدیم اصناف میں شامل نہیں سمجھا جاتا۔ سترہویں صدی میں غزل کا آغاز پنجابی میں ہوا لیکن باقاعدہ پنجابی غزل ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر میں لکھی گئی۔ بیسویں صدی کا پورا ادبی منظرنامہ اس

بات کی دلیل ہے کہ اب نظم اور غزل دونوں شانہ بشانہ لکھی جا رہی ہیں ۔ مصروف دور نے تخلیق کاروں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنا اور قاری کا وقت بچانے کے لئے اپنی تخلیقات میں قارئین کی ضروریات کو مدنظر رکھیں ۔ اکیسویں صدی میں صرف وہی اصناف ادب زندہ رہیں گی جو مختصر اور جامع ہیں اور چونکہ نظم اور غزل میں یہ خاصیت موجود ہے اس لئے یہ دونوں اصناف ادب زندہ رہیں گی۔

چٹان: فیض احمد فیض کی پنجابی شاعری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: پنجابی شاعری میں فیض احمد فیض وہ مقام پیدا نہیں کر سکے جو اردو شاعری میں ان کا خاصہ تھا۔

چٹان: سرکاری وغیر سرکاری سطح پر جو ادبی ایوارڈز دیے جا رہے ہیں ان میں کہاں تک میرٹ کا خیال رکھا جاتا ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: اس وقت پنجابی ادب کے حوالے سے جو اعزازات دیے جا رہے ہیں ان میں کسی حد تک تو تخلیق کے معیار کو اہمیت حاصل ہے مگر مجموعی طور پر زیادہ اہمیت تعلقات کو دی جاتی ہے۔

چٹان: شاعری میں اصلاح کے عمل کو کس حد تک جائز سمجھتے ہیں؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: کسی سے اصلاح لینا کوئی جرم نہیں مگر ہمارے ہاں اصلاح کے نام پر ادب میں چور بازاری شروع ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں اصلاح کا عمل صرف فنی حوالوں تک ٹھیک ہے۔ فکری حوالوں سے نہیں۔

چٹان: آپ کا نیا مجموعہ کب تک متوقع ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: غزلوں پر مشتمل میرا نیا شعری مجموعہ ''وکھاڈاری لگے'' انشاءاللہ اس سال کے آخر تک یا اگلے سال کے شروع میں چھپ جائے گا۔

چٹان: نئے شاعروں کے لئے کوئی پیغام؟

پروفیسر ڈاکٹر یونس احقر: شاعری وجدانی جذبہ ہے لیکن اس میں اصلاح اور مشورہ لینا یقیناً نکھار پیدا کرتا ہے۔ نئی نسل کو سینئر سے مشورہ کرنا چاہیے اور جلد بازی سے پرہیز کرنا چاہیے۔



عامر بن علی کا ادبی سفر

- محبت چھو گئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ ـــ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا
(ہسپانوی زبان سے براہِ راست اُردو میں کیے گئے تراجم)
- آج کا جاپان (زیرِ طبع)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوبِ جاپان (کالمز)



ابرار ندیم کا ادبی سفر

- کون دلاں دیاں جانے (پنجابی شعری مجموعہ)
- اب بھی پھول کھلتے ہیں (شعری مجموعہ)
- چلتے چلتے (کالمز)